ارمغان حق

محمد ابوبکر غازی پوری

MAKTABA ABARIA

DASIMI MANZIL, SATTEWARA, GHAZIPUR U.P. INDIA

نام کتاب	ارمغانِ حق جلد سوم
تالیف	محمد ابوبکر غازی پوری
صفحات	264
سنہ اشاعت	جنوری ۲۰۱۱ء
طابع	ربّانی پرنٹرس دہلی
قیمت	150/=
شائع کردہ	مکتبہ اثریہ، قاسمی منزل، سیّدواڑہ غازی پور یوپی انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقَدِّمَۃ

مجلّہ ''زمـــزم'' میں سوالات کے جوابات شائع ہوتے رہتے ہیں، یہ سلسلہ قارئین زمزم کو اتنا پسند آیا کہ ان کے تقاضہ کے پیش نظر ان جوابات کا ایک مجموعہ الگ سے ''ارمغان حق'' جلد اول کے نام سے شائع ہوا، اور ایک سال کے اندر ہی اس کا ایڈیشن ختم ہو گیا، تو دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ پھر اس کتاب کی جلد دوم شائع ہوئی، اس کا بھی تین ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ پاکستان میں بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اللہ نے اسے توقع سے زیادہ مقبولیت عطا کی۔ **فللّٰہ الحمد**

اب سال بھر قبل ہی سے اس کتاب کی تیسری جلد کا تقاضا شروع ہو چکا ہے، خدا کا شکر ہے کہ تیسری جلد کا بھی ایک مجموعہ تیار ہو گیا ہے، اس مجموعہ میں بھی پہلی دو جلدوں کی طرح قیمتی مضامین ہیں، فقہی مسائل کے علاوہ دوسرے موضوع کے مضامین بھی آپ کو اس مجموعہ میں ملیں گے، بطور خاص بعض اکابر غیر مقلدین علماء کی کتابوں پر تبصرہ اہل علم حضرات کے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث ہوگا، اس مجموعہ کی یہ خصوصیت ہوگئی کہ اس کی کتابت ہاتھ کے بجائے کمپیوٹر کی ہے۔ صفحات پہلی ہی دو جلدوں کی طرح ہیں، البتہ کاغذ، طباعت اور نگیٹو وغیرہ کی قیمت میں بیحد اضافہ ہو جانے کی وجہ سے اس جلد کی قیمت ایک سو پچاس (150/=) رکھی گئی ہے، پہلی دو جلدوں کی قیمت ایک سو پچیس (125/=) ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ اس جلد کو بھی اپنی بارگاہ میں مقبول بنا کر اس کا فائدہ عام و تام

کرے، اور اس کتاب کو لوگوں کے لئے باعث ہدایت بنا وے، اور ان کی فکرہ گمراہیوں کا اس سے ازالہ ہو۔ افسوس ہے کہ غیر مقلدین عوم وعلماء میں انصاف مفقود ہے، اور ان کو کسی حنفی عالم کی کتاب کو خالی الذہن ہوکر مطالعہ کرنے کی توفیق وسعادت سے محرومی رہتی ہے، اگر اللہ کی طرف سے ان کے لئے توفیق میسر ہوتو ارمغان حق کی یہ تینوں جلدیں ان کی بیمار ذہنیت کے لئے دوائے شافی ہیں۔ مگر بات وہی ہے ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں

محمد ابوبکر غازی پوری

۵؍محرم الحرام ۱۴۳۲ھ قبل صلوۃ العشاء

☆☆☆☆☆

پہلے اسے پڑھ لیں

(مسائل فقہیہ میں ائمہ کے درمیان اختلاف کا غیبی راز)

مسائل فقہیہ میں چاروں ائمہ کے مابین اختلاف ہوتے ہوئے بھی چاروں مذاہب برحق ہیں، اور سب کے سب اہل سنت والجماعۃ ہیں اور سب کے سب ما أنا علیہ وأصحابی والے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ نہ شافعی حنفی کے مذہب کو باطل کہتا ہے اور نہ حنفی شافعی کے مذہب کو باطل کہتا ہے، نہ حنبلی اور مالکی ایک دوسرے کو ناحق کہتے ہیں، چونکہ ہر مذہب کا مستدل قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس ہے، کہیں کتاب اللہ سے استدلال ہوتا ہے کہیں سنت رسول اللہ سے اور کہیں اجماع اور قیاس سے، چاروں مذاہب کی بنیاد انہیں چاروں اصول اور اساس پر ہے، تو سب متحد ہیں نہ کہ مختلف، اور آپس میں اتحاد ہے نہ کہ افتراق، کیا کسی شافعی نے کہا ہے کہ حنفی مذہب کی نماز باطل ہے، اس لئے کہ وہ سورہ فاتحہ امام کے پیچھے نہیں پڑھتا، یا کسی حنفی نے کہا ہے کہ شافعی کی نماز باطل ہے اس لئے کہ وہ امام کے پیچھے قرآن پڑھتا ہے، اسی طرح مالکی وحنبلی میں سے آج تک کسی نے مسائل میں اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کی نماز کو باطل کہا ہے، اور رہا مسائل کا اختلاف تو اللہ کی اس میں بڑی مصلحت اور ایک غیبی راز ہے اور وہ یہ کہ جس طرح قرآن کی حفاظت کی ضرورت تھی جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لے لی ہے اور اس کا ایک عجیب وغریب نظام بنایا ہے کہ چھوٹے چھوٹے مسلمان بچوں کے سینوں میں بھی قرآن محفوظ رہتا ہے، رمضان اور غیر رمضان میں حافظوں کے علاوہ عام مسلمان بھی

قرآن اس قدر پڑھتے ہیں کہ اس کی مثال دنیا کی کسی مذہب کی کوئی کتاب نہیں پیش کرسکتی، اسی طرح احادیث مبارکہ بھی وحی کی ایک قسم ہے اوراس کووحی غیر متلو کہا جاتا ہے، مگراس کی حفاظت کا اللہ نے وہ نظام نہیں بنایا ہے جوقرآن کا نظام ہے، جب کہ اس کی بھی حفاظت کی ضرورت تھی اوروہ شریعت اسلامیہ کی دوسری بنیاد ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا نظام یہ بنایا کہ چاروں ائمہ کرام کا مزاج احادیث مبارکہ کوترجیح واختیار کرنے میں الگ بنادیا، اس طرح چاروں مذاہب کواگرغور سے دیکھا جائے تورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث مبارکہ پرعمل ہورہا ہے۔حتی کہ ان احادیث پربھی عمل ہورہا ہے جو مراسیل اور موقوفات صحابہ ہیں بلکہ ان تمام ضعیف احادیث پربھی عمل ہورہا ہے جن کا ضعف شدید نہیں ہے، اس طرح چاروں مذاہب کے واسطہ سے اوران کے اختلاف کی برکت سے عملی طریقہ پراللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث مبارکہ کی حفاظت کا انتظام کیا گیا ہے، رفع یدین والی حدیث پربھی عمل ہورہا ہے، اور غیر رفع یدین والی حدیث پربھی عمل ہورہا ہے، آمین بالجہر والی حدیث پربھی عمل ہورہا ہے اوراخفاء والی حدیث پربھی عمل ہورہا ہے۔لانکاح الا بولی والی حدیث پربھی عمل ہورہا ہے اور الایم احق بنفسھا والی حدیث پربھی عمل ہورہا ہے، لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب والی حدیث پربھی عمل ہورہا ہے واذا قرأ فانصتوا والی حدیث پربھی ہے۔نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے والی حدیث پربھی عمل ہورہا ہےاورنہ پڑھنے والی حدیث پربھی عمل ہورہا ہے، جلسہ استراحت میں بیٹھ کراٹھنے والی حدیث پر بھی عمل ہورہا ہے، اورسیدھے کھڑے ہونے والی حدیث پربھی عمل ہورہا ہے۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے تمام کلمات مبارکہ کی، آپ کے کئے ہوئے تمام اعمال مبارکہ کی، نیز آپ کے پسندیدہ اورآپ کے مشروع کئے ہوئے تمام امور حسنہ کی حفاظت کا عجیب وغریب نظام رہتی دنیا تک کے لئے قائم کردیا ہے، پس جس طرح قرآن پاک کا ایک ایک لفظ قیامت تک کے لئے محفوظ کردیا گیا ہے، اسی طرح تمام احادیث مبارکہ کی حفاظت کا اللہ ہی کی طرف سے

انسانی عقل وفہم کے ماوراء یہ نظام قائم کیا گیا ہے، اور چونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی حفاظت ان چاروں مذاہب متبوعہ کے ذریعہ پوری ہورہی تھی اس وجہ سے اللہ نے اور مذاہب فقہیہ کو باقی نہیں رکھا، اس لئے مذاہب کا یہ اختلاف ''اختلاف امتی رحمة '' ہے، اگر مذاہب کا یہ اختلاف نہ ہوتا اور تمام مذاہب والے ایک پلیٹ فارم پر ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ تمام احادیث مبارکہ کی حفاظت اوران پر عمل ہو سکے، رہا اختلاف کے وقت ترجیح تو یہ تو انسان کا فطری حق ہے، ایک دسترخوان پر مختلف انواع کے کھانے ہوتے ہیں، کھانا سب جائز اور طیب اور برحق ہے مگر انسان دسترخوان سے وہی کھانا لیتا ہے جو اس کی پسند ہوتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ بقیہ کھانوں کا کھانا جائز نہیں اور وہ ناحق ہیں۔

☆☆☆☆☆

کتاب وسنت، اقوالِ صحابہ واقوالِ ائمہ سے

قیاسِ شرعی کا ثبوت

خطیب بغدادی کے کلام کی روشنی میں

خطیب بغدادی کی بہت مشہور کتاب ''الفقہ والمتفقہ'' ہے، جس میں انھوں نے فقہ واہل فقہ اور فقہ کا علم سیکھنے سکھانے، پھر اس کے چاروں دلائل اور اس کے علاوہ اس علم فقہ سے متعلق بہت ساری جزئیات کے بارے میں مفصل گفتگو کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب فقہ کے سلسلہ میں معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ اس کتاب میں خطیب نے صحیح قیاس کی مشروعیت اور اس کے لازم العمل ہونے پر بھی کتاب وسنت اور آثار صحابہ وتابعین کی روشنی میں بہت مفصل گفتگو کی ہے(۱)

اس کتاب میں قیاس ورائے کی مشروعیت اور اس پر عمل کے لازم ہونے کے سلسلہ میں خطیب نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے جو استدلال کیا ہے اس کو ناظرین زمزم کے لئے اس قسط میں اپنے الفاظ میں پیش کر رہا ہوں۔

قیاس کا ثبوت قرآن سے

(۱) خطیب نے پہلا استدلال اس بارے میں قرآن پاک کی اس آیت سے کیا

---

(۱) یہ کتاب باریک ٹائپ میں چار سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے، اور اس کے صفحات بھی عام کتابوں کے صفحات سے سائز میں میں بڑے ہیں، میرے پاس دار الکتب العلمیہ بیروت والا نسخہ ہے۔

ہے، خدا کا ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ ۔یعنی اے ایمان والو! تم لوگ حالت احرام میں شکار مت کرو، سو جس نے کسی جانور کا تم میں سے اس حال میں شکار کیا تو اس کو جس طرح کا اس نے جانور شکار کیا ہے اس کا تاوان اسی طرح کا ادا کرنا ہوگا۔

خطیب فرماتے ہیں کہ اللہ نے تو یہ صاف صاف فرمادیا ہے کہ حالتِ احرام میں اگر کسی نے شکار کیا تو اس کا تاوان دینا ہے، مگر یہ تاوان کیا ہوگا اس پر اللہ کی طرف سے کوئی صریح بات نہیں کہی گئی ہے، اس جانور کے مماثل تاوان کے معلوم کرنے کا طریقہ سوائے اجتہاد اور قیاس کے کوئی دوسرا نہیں ہے، پس یہ آیت قیاس واجتہاد کی مشروعیت کی دلیل ہے۔

(۲) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فاسق کی شہادت کو مردود قرار دیا ہے، اور قرآن میں یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ کسی آدمی کی عدالت کا معیار کیا ہے کہ جس سے وہ فاسق کے درجہ سے نکل کر عادل قرار پائے اور اس کی شہادت قابلِ قبول ہو، کسی آدمی میں کچھ گناہ کا پایا جانا اس کے فاسق ہونے کی دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ بقول خطیب کوئی آدمی (انبیاء علیہم السلام کے علاوہ) ایسا نہیں ملے گا جو معصیت سے بالکل محفوظ ہو، پس معلوم ہوا کہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ عادل کون ہے اور فاسق کون، ہمارے پاس ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہم آدمی کے احوال کا جائزہ لیں اور جس شخص میں معصیت کا پہلو زیادہ ہو اس کو فاسق قرار دیں اور جس شخص میں طاعات زیادہ ہوں اس کو عادل قرار دیں، یعنی کسی کے فاسق ہونے کا فیصلہ اس کے حالات کا جائزہ لے کر رائے وقیاس ہی سے ہوگا۔

(۳) اسی طرح سے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۔یا قرآن میں یہ آیت ہے کہ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ، دونوں آیتوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا دین مکمل ہے، اور کتاب اللہ میں ہر چیز کا بیان ہے، اللہ نے دین کے سلسلہ کی کسی بات کو چھوڑا نہیں ہے۔

مگر قرآن پاک میں دین کے سلسلہ کی ساری جزئیات نہیں ہیں، اور نہ نبی ﷺ ہی نے امت کو ساری جزئیات سے باخبر کیا ہے، اور ان جزئیات کو جانے بغیر اس پر عمل نہیں ہوسکتا اور بغیر جزئیات کے علم کے دین کے کامل ہونے کا علم ممکن نہیں ہے، تو اب ان جزئیات کے جاننے کا طریقہ سوائے اجتہاد وقیاس کے ذریعہ مسائل کے استخراج واستنباط کے اور کوئی دوسرا نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قیاس ورائے کے بغیر پورے دین پر عمل ممکن نہیں ہے۔

(۴) قرآن پاک میں ہے: فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ،یعنی اگر تم لوگوں کے بیچ کسی دینی وشرعی مسئلہ میں اختلاف ہوتو معاملہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف لے جاؤ۔

خطیب فرماتے ہیں کہ کتاب وسنت کی طرف معاملہ کو لیجانے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔(۱) یا تو وہ مسئلہ کتاب وسنت میں منصوص ہوگا، اگر یہی شکل ہے تو پھر اس کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ اللہ ورسول کی طرف لے جاؤ۔(۲) یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حکم ان چیزوں کی طرف لے جاؤ جو ان چیزوں کے مشابہ اور ان کی نظیر نہیں ہے، اس کا کوئی قائل نہیں ہے اور نہ ایسا کرنا جائز ہے۔(۳) تیسرا مطلب یہ ہے کہ پیش آمدہ واقعہ کے مشابہ کتاب وسنت میں جو مسئلہ ہے اس کی طرف اس نئے حادثہ کو لوٹا کر کے اس کا حکم معلوم کرو اور چونکہ پہلے دونوں معنوں کا مراد لینا فاسد ہے، اس وجہ سے یہی تیسرا معنی متعین ہے، اور اسی ردالنظیر الی النظیر کا نام فقہاء کی اصطلاح میں قیاس ہے۔

قیاس ورائے کا ثبوت سنت رسول اللہ سے

پھر خطیب نے قیاس کا اثبات سنت سے کیا ہے اور اس سلسلہ میں پہلی حدیث حضرت معاذ والی ذکر کی ہے۔

ابوعون ثقفی فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ کے شاگردوں نے جن کا تعلق شہر حمص سے تھا، حضرت معاذ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے جب حضرت معاذ کو یمن کا قاضی

بنا کر بھیجا تو ان سے پوچھا کہ معاذ تم فیصلہ کس طرح کرو گے؟ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا، حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر تم مسئلہ کا حکم کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ تو انھوں نے عرض کیا میں سنت رسول اللہ سے فیصلہ کروں گا، پھر حضورؐ نے ان سے پوچھا اگر تم کو وہ حکم سنت رسول اللہ میں بھی نہ ملے تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ تو حضرت معاذ نے جواب دیا أجتهد برائي ولاآلو، میں امکان بھر اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ میرا یہ جواب سن کر آپ نے خوشی میں دست مبارک سے میرا سینہ تھپتھپایا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے۔

خطیب نے اس حدیث کو متعدد سندوں سے نقل کیا ہے، پھر فرماتے ہیں کہ اگر قیاس کا مخالف یہ اعتراض کرے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے روایت کرنے والے حضرت معاذ کے مجہول شاگرد ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں حضرت حارث بن عمرو کا یہ قول ''عن اناس من اصحاب معاذ ''یعنی مجھ سے حضرت معاذ کے متعدد شاگردوں نے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث مشہور تھی اور اس کے روایت کرنے والے حضرت معاذ کے بہت سے شاگرد تھے، پھر ہمیں حضرت معاذ کا فضل اور ان کا زہد معلوم ہے، ان کے شاگردوں کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب دیندار، فقہاء اور اصحاب زہد صلاح تھے، اس لئے ان کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حضرت معاذ کی طرف غلط بات منسوب کریں گے، نیز اسی حدیث کو حضرت عبدالرحمٰن بن غنیم نے اور ان سے عبادہ بن نسی نے روایت کیا ہے اور یہ سند متصل ہے اور اس سند کے تمام راوی معروف اور ثقہ ہیں، اور تیسری بات یہ ہے کہ اہل علم نے اس حدیث کو قبول کیا ہے اور اس سے قیاس کے مشروع ہونے پر دلیل پکڑی ہے، اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: لاوصیة لوارث یعنی وارث کیلئے وصیت نہیں ہے، یا یہ حدیث ھو الطهور مائه والحل میتته، یعنی سمندر کا پانی

پاک ہے اور اس کا مرا ہوا حلال ہے۔ یا آنحضور کی یہ حدیث **إذا اختلف المتبايعان في الثمن والسلعة قائمة تحالفا وترادا البيع** ، یعنی بیع وشراء کرنے والے سامان کی قیمت کے بارے میں الگ الگ بات کہیں اور سامان موجود ہے تو دونوں سے قسم لی جائے گی ، اگر دونوں نے قسم کھالی تو سامان والا اپنا سامان واپس لے گا اور قیمت والا اپنی قیمت واپس لے گا۔

اسی طرح سے اللہ کے رسول ﷺ کا یہ ارشاد کہ دیت عاقلہ پر ہے۔

خطیب فرماتے ہیں کہ یہ تمام حدیثیں سند کے عتبار سے ثابت نہیں ہیں لیکن ان احادیث کو محدثین کے جم غفیر نے نقل کیا ہے ، اور امت نے اس کو قبول کیا ہے۔ محدثین کا ان احادیث کو جم غفیر سے نقل کرنا اور امت کا انھیں قبول کر لینا یہی ان کے صحیح ہونے کی دلیل ہے ، اب اس کے بعد ان کی سندوں کی صحت کے ثبوت کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے ، اسی طرح سے حضرت معاذ والی حدیث کا قصہ ہے کہ جب فقہاء ومحدثین نے اس روایت سے احتجاج کیا ہے تو اب اس کی سند دیکھنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

پھر خطیب فرماتے ہیں کہ:

اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت معاذ کی حدیث خبر آحاد سے ہے اور خبر واحد سے اس مسئلہ میں حجت پکڑنا درست نہیں ہے ، تو ہم کہیں گے یہ حدیث آنحضور اکرم ﷺ کی حدیث **لاتجتمع امتی علی الضلالة** (میری امت گمراہی پر نہیں جمع ہو سکتی ہے) سے زیادہ مشہور ہے اور زیادہ ثابت ہے ، پھر جب مخالف **لاتجتمع** والی حدیث سے اجماع کے ثبوت پر استدلال کرتا ہے تو اس حدیث سے قیاس کے ثابت اور ثبوت وحجت شرعی ہونے پر استدلال کرنا زیادہ اولیٰ ہوا۔

اور دوسرا جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ اس مسئلہ میں خبر واحد سے استدلال جائز ہے ، اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خبر واحد سے بہت سے مسائل شرعیہ کو ثابت کیا جاتا ہے ، اور کسی چیز کے حلال وحرام ہونے میں ، حدود وقصاص میں نکاح وطلاق وغیرہ

مسائل میں خبر واحد سے دلیل لائی جاتی ہے، تو پھر خبر واحد سے قیاس کا ثابت ہونا تو اور بھی اولیٰ ہے، اس لئے کہ قیاس کے ذریعہ سے ان مسائل کو جانا جاتا ہے، یعنی قیاس ان مسائل شرعیہ کے جاننے کا ذریعہ اور ایک طریقہ ہے، اور مسائل ہی اصل مقصود ہوتے ہیں تو جب خبر واحد سے اصل مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے تو اس سے اس چیز کو جو ان مسائل مقصودہ کا ذریعہ ہے اور وسیلہ ہے، خبر واحد سے کیوں نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس میں کسی طرح کا کوئی شبہ نہیں ہے۔

قیاس کے ثبوت کی ایک دلیل یہ حدیث بھی ہے جو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حاکم اپنے فیصلہ میں اجتہاد کرتا ہے تو اگر اس کا فیصلہ غلط ہے تو وہ ایک اجر کا مستحق ہوتا ہے، اور اگر اس کا فیصلہ ٹھیک ہوتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس کو دو اجر ملتا ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ اجتہاد اور رائے کا استعمال کرنا جائز ہے اور شریعت کی طرف سے حاکم کو اس کا حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرے حتیٰ کہ اگر اس کا فیصلہ غلط بھی ہوتا ہے تو بھی وہ ایک اجر کا مستحق ہوتا ہے۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ خطا کرنے والے حاکم کو اجر ملنے کا جواز کیا ہے اور کیوں اسے اجر ملے گا، بلکہ وہ تو ایک طرح سے گناہ کا مرتکب ہوا ہے کہ اس نے اپنے اجتہاد میں سستی کی ہے اور پوری توانائی نہیں صرف کی ہے جب ہی تو اس نے غلط فیصلہ کیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حاکم کو اس کے غلط فیصلہ کرنے پر اجر نہیں ملا ہے بلکہ اس نے جو اجتہاد کیا ہے اس پر اجر ملا ہے، فیصلہ میں اس نے عمداً غلطی کا ارتکاب نہیں کیا ہے، اس لئے اس کی غلطی تو اللہ کی طرف سے معاف ہے، مگر اس نے غور و فکر کرنے میں اپنی جو دماغی اور ذہنی قوت صرف کی ہے یہ اس اجر کی اسی محنت کا نتیجہ ہے، اور جس کا فیصلہ صحیح ہوا تو اس کو ایک اجر اجتہاد کا ملا اور ایک اجر صحیح فیصلہ کرنے کا ملا۔

خطیب نے رائے و اجتہاد کے ثبوت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔ سعید بن المسیبؒ حضرت علی سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ بہت سی چیزیں آپ کے بعد پیش آئیں گی، جن کا حکم نہ قرآن میں ہوگا اور نہ آپ کی احادیث میں تو ہم کیا کریں گے؟ تو آپ ﷺ نے ان سے کہا اس کے لئے میری امت کے صالحین وعابدین کو غور وفکر کے لئے جمع کرو اور ان سے مشورہ کر کے ان کا فیصلہ کرو، اور اس بارے میں کسی ایک کی رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

حضرت علی ہی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیاس کے ذریعہ حق کو اہل بصیرت واولوا الالباب جان لیتے ہیں۔

خطیب بغدادی نے اسی سلسلہ میں حضرت عمر کی یہ حدیث بھی پیش کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ایک روز میرے اوپر نشاط زیادہ طاری تھا، میں نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لے لیا، میں نے اس کا ذکر حضور ﷺ سے کیا اور آپ ﷺ سے اس کا حکم دریافت کیا کہ روزہ باقی رہا یا بوسہ لینے سے روزہ ختم ہو گیا؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ بتلاؤ کہ اگر تم منہ میں پانی لے کر کلی کرو تو تمہارا روزہ باقی رہے گا یا ختم ہو جائے گا؟ تو حضرت عمر نے فرمایا کہ اس سے تو میرے روزہ کو کچھ نقصان نہیں پہونچے گا، تو آپؐ نے فرمایا کہ اسی طرح حالتِ روزہ میں بوسہ کا بھی حکم ہے۔

خطیب اس حدیث کو ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ حالتِ روزہ میں بیوی کا بوسہ لینا ممنوع ہے، اسی وجہ سے انھوں نے اس عمل کو ایک بڑا گناہ خیال فرمایا، اس لئے آپ کا حضور ﷺ کی خدمت میں جانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ حضور سے معلوم فرمائیں کہ حالتِ صوم میں بیوی کا بوسہ لینا جائز ہے یا ناجائز ہے، اس لئے کہ اس کا ناجائز ہونا تو ان کے علم میں تھا جبھی تو اس کو بڑا گناہ سمجھا، وہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں اس لئے تشریف لائے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ اس کی وجہ سے ان پر کفارہ کیا واجب ہوگا۔[

خطیب فرماتے ہیں کہ بیوی کا بوسہ لینا ممنوع ہے، اس کے بارے میں نہ کتاب اللہ میں کوئی بات ہے نہ اللہ کے رسول کی سنت میں اس کا کوئی حکم تھا، اس فعل کی

ممنوعیت کو حضرت عمر نے اپنے اجتہاد اور اپنی رائے سے جانا تھا، انھوں نے اس کو وطی پر قیاس کیا تھا کہ چونکہ وطی میں عورت سے لذت حاصل کرنا ہوتا ہے بوسہ سے لذت حاصل ہوتی ہے اور چونکہ وطی سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اس لئے بوسہ لینے سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا، تو دونوں کا حکم ایک ہوگا، اس قیاس کے ذریعہ سے حضرت عمر کو حالت صوم میں بوسہ کی حرمت کا علم ہوا تھا لیکن جب انھوں نے اس مسئلہ کو حضور ﷺ کی خدمت میں رکھا تو حضورؐ نے بتلایا کہ تمہارا یہ اجتہاد غلط ہے اور بوسہ کو عورت کے ساتھ جماع کرنے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ حالتِ صوم میں بوسہ لینا اس طرح کا معنی رکھتا ہے جس طرح آدمی نے پانی کو منہ میں لے کر کلی کر دیا، اگر پانی پیٹ میں پہونچے تو روزہ ٹوٹتا ہے صرف منہ کے ظاہر حصہ میں پانی لگنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، جس طرح آدمی کی شرمگاہ اگر عورت کے ظاہر حصہ پر لگے تو اس سے وطی کا معنی نہیں پایا جاتا۔

سلمان بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ جب کسی کو کسی لشکر کا امیر بنا کر بھیجتے تو اس کو کچھ وصیت فرماتے مثلاً تقویٰ اختیار کرنے کی اور مسلمانوں کے ساتھ خیر و بھلائی کا معاملہ کرنے کی، اور آخر میں یہ بھی فرمایا کرتے کہ جب تم کسی قلعہ کا محاصرہ کرو اور قلعہ والے تم سے صلح کی بات کریں تو ان سے اللہ کے حکم پر کوئی عہد مت کرنا بلکہ اپنی رائے اور اپنی صوابدید کے مطابق تم ان سے معاملہ کرنا، اس حدیث سے بھی رائے و اجتہاد کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے، اس وجہ سے کہ اگر دینی امور میں رائے و قیاس سے کام لینا جائز امر نہ ہوتا تو آپ ﷺ اپنے امراء کو اپنی رائے و اجتہاد سے کام لینے کا حکم نہ فرماتے۔

خطیب بغدادی نے اس حدیث سے بھی اجتہاد و رائے کی مشروعیت پر استدلال کیا ہے، حضرت ام عطیہ انصاریہ فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ کی ایک صاحبزادی کا انتقال ہوا تو آپ نے غسل دینے والی عورتوں سے فرمایا کہ بچی کو تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ یا اس سے زیادہ غسل دو، اگر تم لوگ مناسب خیال کرو تو پانی میں بیری کی پتی ملا کر غسل دو۔

خطیب کہتے ہیں کہ میت کو غسل دینا فرض ہے، البتہ یہ کہ غسل کتنے مرتبہ دیا

جائے، غسل دینے والی عورتوں کی رائے واجتہاد پر اس کو چھوڑا، خود آپ ﷺ کے زمانہ میں صحابہ کرام نے اس بارے میں اپنے اجتہاد سے کام لیا ہے، اور آپ نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ دینی وشرعی مسائل میں رائے کا استعمال کرنا اور اجتہاد کرنا مشروع ہے۔

رائے واجتہاد کی مشروعیت کی ایک دلیل یہ حدیث بھی ہے جو حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے احزاب کی جنگ کے موقع پر یہ اعلان کیا تھا کہ کوئی بنی قریظہ میں پہونچنے سے پہلے ظہر کی نماز ادا نہ کرے۔ **لا يصلين احد الظهر إلا في بني قريظة**، جب لوگ بنی قریظہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ ہی میں ظہر کا وقت ہوگیا، بعض لوگوں کو خوف ہوا کہ بنی قریظہ پہونچتے پہونچتے ظہر کا وقت نکل جائے گا اور ظہر فوت ہوجائے گی، تو انھوں نے وقت کے اندر ہی راستہ ہی میں نماز پڑھ لی، اور کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم تو وہیں نماز پڑھیں گے جہاں پر پہونچ جانے پر ہمیں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، تو انھوں نے بنی قریظہ پہونچ کر ظہر کی نماز اس وقت پڑھی جب اس کا وقت ختم ہو چکا تھا، یعنی ظہر کی نماز قضا کی۔ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ مسئلہ آیا تو آپ ﷺ نے دونوں جماعتوں میں سے کسی کو کچھ نہیں کہا، اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے حضورؐ کے حکم کے باوجود اپنے اجتہاد سے راستہ میں نماز پڑھ لی تھی ان کا یہ اجتہاد جائز تھا ورنہ آپ ﷺ اپنے صریح حکم کی مخالفت پر خاموش نہ رہتے۔

ایک حدیث میں ہے کہ دو آدمی سفر پر نکلے، راستہ میں نماز کا وقت آگیا، ان کے پاس وضو کے لئے پانی نہیں تھا، دونوں نے تیمّم کر کے نماز ادا کی پھر ان کو نماز کا وقت موجود ہی تھا کہ پانی مل گیا، تو ان میں سے ایک نے وضو کر کے نماز کو دوبارہ پڑھ لیا اور اس کے ساتھی نے نماز کا اعادہ نہیں کیا، پھر یہ دونوں جب سفر سے واپس ہوئے تو حضورؐ کی خدمت میں اپنا قصہ پیش کیا، تو آپ ﷺ نے اس شخص سے کہا جس نے نماز کو دہرایا نہیں تھا تم نے سنت کے مطابق نماز ادا کی، اور تمہاری نماز جائز ہے، اور جس نے نماز کو دہرایا تھا اس سے کہا تھا کہ تم کو دُہرا اجر ملے گا۔

ان دونوں صحابہ کرام کا عمل اپنے اجتہاد اور اپنی رائے سے تھا اور آپ ﷺ نے دونوں کی تصویب فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام حضور ﷺ کی موجودگی میں دینی وشرعی مسائل میں اجتہاد کیا کرتے تھے اور آپ کو اس کی اطلاع بھی ہوتی تھی مگر آپ ان کو اجتہاد اور رائے کے استعمال سے منع نہیں کرتے تھے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ بنی قریظہ نے اپنے بارے میں فیصلہ کرانے کیلئے حضرت سعد بن معاذ کو حَکَم بنانے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا، تو آپ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ کو اپنی خدمت میں بلایا اور ان سے کہا کہ یہ لوگ اپنا فیصلہ تم سے کرانا چاہتے ہیں، تو حضرت سعد نے یہ فیصلہ کیا کہ ان میں جن لوگوں نے مسلمانوں سے جنگ کی ہے انھیں قتل کیا جائے اور ان کے بال بچوں کو غلام بنالیا جائے، تو آپ ﷺ نے ان کے فیصلہ سے خوش ہوکر فرمایا کہ یہ فرشتہ والا فیصلہ ہے، اور بعض روایت میں ہے کہ یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ نے آسمان پر کیا ہے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ نہ کتاب اللہ سے تھا نہ سنت رسول اللہ سے، ان کا یہ اجتہاد تھا، اس سے معلوم ہوا کہ دینی وشرعی معاملات میں اجتہاد کرنا جائز اور مشروع ہے۔

حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کا یہ فیصلہ سنایا کہ دو عورتیں تھیں، دونوں کا اپنا اپنا بچہ تھا، ایک بھیڑیا آیا اور ان میں سے ایک عورت کے بچہ کو اٹھا لے گیا، اب دونوں عورتیں جھگڑنے لگیں، یہ کہتی کہ تیرا بچہ لے گیا اور وہ کہتی کی تیرا بچہ لے گیا ہے، پھر یہ دونوں اپنا مقدمہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس لے گئیں، حضرت داؤدؑ نے بڑی کے حق میں فیصلہ کردیا، جب اب دونوں کا گزر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس سے ہوا اور ان کو اس فیصلہ کا علم ہوا تو انھوں نے کہا چھری لاؤ میں اس بچہ کا دو ٹکڑا کر کے تم دونوں کو اس کا ایک ایک حصہ دوں گا، اس پر بڑی تو خاموش رہی مگر چھوٹی نے رونا چلانا شروع کردیا اور کہا کہ آپ ایسا نہ کریں، یہ بچہ اس بڑی ہی کو عورت کا ہے، اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ بچہ بڑی کا نہیں ہے اسی چھوٹی عورت کا ہے اور پھر اس کے حق میں فیصلہ کردیا۔

خطیب فرماتے ہیں کہ:

وفی ھٰذا الخبر دلیل علیٰ ان ان داؤد و سلیمان لم یحکما إلا من جهة الاجتهاد لانه لو کان ماحکم به داؤد نصا لم یسع سلیمان ان یحکم بخلافه، ولو کان ماحکم به سلیمان ایضاً نصا لم یخف علیٰ داؤد ۔

یعنی اس خبر میں یہ دلیل ہے کہ حضرت داؤد وسلیمان نے اپنے اجتہاد سے اس قضیہ میں فیصلہ کیا تھا، اس لئے کہ اگر حضرت داؤد علیہ السلام نے نص سے فیصلہ کیا ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو اختلاف کی گنجائش نہیں تھی، اور گر حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ بھی نص کی روشنی میں ہوتا تو یہ نص حضرت داؤد علیہ السلام سے مخفی نہ ہوتی۔

اور اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ دو مختلف اجتہادوں میں حق ایک ہی میں ہوگا، اس لئے کہ اگر حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی حق ہی ہوتا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کے فیصلہ کے خلاف کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

داؤد علیہ السلام کا اجتہاد یہ تھا کہ جب دونوں عورتیں اپنے دعویٰ میں برابر ہیں اور ایک کو عمر میں بڑے ہونے کی فضیلت حاصل ہے تو وہی اس لڑکے کی زیادہ حق دار ہے جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی رائے میں یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ لڑکا اس بڑی عورت کا ہے۔

اور بہت سے اہل علم کا یہ مذہب ہے کہ گزشتہ انبیاء کے فیصلوں کی اتباع کرنا ہم پر واجب ہے، اگر ان فیصلوں کے خلاف ہماری شریعت میں کوئی بات نہیں ہے۔

البتہ اس طرح فیصلہ کرنا ہمارے مذہب میں اجماعاً جائز نہیں ہے اس لئے ہم اس کو اجماع کی وجہ سے قبول نہیں کرتے۔

قرآن پاک میں اسی طرح کا ایک اور اجتہادی فیصلہ انھیں دونوں انبیاء علیہما السلام حضرت داؤد وحضرت سلیمان کا مذکور ہے۔ قصہ یہ ہے کہ کسی شخص کی بکری کسی کا کھیت چر گئی تھی، تو اس بارے میں جب کھیت والے نے بکری کے مالک سے اپنے نقصان کا مطالبہ کیا تو حضرت داؤد کا فیصلہ کچھ اور تھا اور حضرت سلیمان کا فیصلہ کچھ اور تھا، دونوں

نے الگ الگ اجتہاد کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کی خدا کی طرف سے تصویب ہوئی، اس قصہ میں بھی کوئی وحی نہیں تھی اس لئے دونوں کو اجتہاد کرنا پڑا، اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء سابقین بھی اجتہاد ورائے سے شرعی امور میں کام لیتے تھے۔

خطیب نے اس عنوان کے تحت امام شعبی کی یہ روایت ذکر کی ہے، امام شعبی روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر سے ''کلالہ'' کے بارے میں پوچھا گیا کہ کلالہ کا اطلاق قرآن میں کس پر کیا گیا ہے، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس بارے میں اپنی رائے سے کہوں گا (اس لئے کہ آنحضورؐ سے کلالہ کا معنی منقل نہیں تھا) اگر ٹھیک ہوا تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہوا تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہوگا۔ میری رائے یہ ہے کہ ''کلالہ'' لڑکے اور والد کے علاوہ جو ورثہ ہوتے ہیں ان کو کہا جاتا ہے۔

پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بارِ خلافت سنبھالا تو انھوں نے فرمایا کہ میں اللہ سے شرماتا ہوں کہ اس قول کو رد کروں جو حضرت ابوبکر کی رائے تھی۔ (یعنی حضرت عمر نے بھی حضرت ابوبکر کی تقلید میں وہی قول اختیار کیا جو حضرت ابوبکر کا تھا)

حضرت قاضی شریح سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا تھا کہ تو کتاب اللہ سے جو حکم واضح ہو اس کے مطابق فیصلہ کر، اگر کتاب اللہ میں وہ حکم نہ ہو تو رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو دیکھ اور ان کی روشنی میں مقدمات فیصل کر، اگر اللہ کے رسول کے فیصلوں کا تجھے علم نہ ہو تو ائمہ مجتہدین کے اقوال کی روشنی میں (یعنی صحابہ کرام کے فیصلوں کے مطابق) تو فیصلہ کر، اگر تجھے ان کا بھی فیصلہ معلوم نہ ہو تو اپنے اجتہاد اور اپنی رائے سے مقدمات کو نمٹا اور اہل علم اور اہل صلاح سے مشورہ بھی کرلیا کر۔ (۱)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت شریح کو جب آپ نے قاضی بنا کر بھیجا تو ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ، تو کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کر، اور گر کتاب اللہ کا حکم

---

(۱) حضرت امام ابوحنیفہؒ کا فقہی مسائل میں یہ اصل اصول ہے، اور یہی بات جیسا کہ آئندہ آرہی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے، اور اہل علم کو معلوم ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود دین وشریعت کے بارے میں کتاب وسنت کے بعد حضرت عمر کی باتوں کا کتنا زیادہ لحاظ رکھتے تھے۔

واضح ہوتو پھر اس کے بارے میں کسی سے مت پوچھ، ورنہ اللہ کے رسول کی جو سنت تیرے اوپر کھل جائے اس کی روشنی میں فیصلہ، اگر تجھے سنت میں حکم نہ ملے تو فاجتهد رأیک، یعنی اپنی رائے سے اجتہاد کر۔

حضرت عمرؓ نے اسی طرح کی بات ایک اور دفعہ شریح قاضی کو لکھ کر بھیجی تھی اور اس میں اخیر میں یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر تم مجھ سے مشورہ کرو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو حضرت عمرؓ مقدمات میں فیصلہ کرنے کے سلسلہ میں بذریعہ خط ہدایات دیا کرتے تھے، یہ خطوط حضرت ابوموسیٰ اشعری کے پاس محفوظ تھے، پھر یہ خطوط حضرت ابوموسیٰ اشعری کی وصیت کے مطابق حضرت ابوبردہ کے پاس محفوظ تھے، حضرت ابوبردہ کے لڑکے سعید سے ابوعبداللہ بن ادریس نے ان خطوط کو مانگ کر پڑھا تھا، تو ان خطوط میں سے ایک خط میں یہ بھی لکھا تھا۔

اگر کوئی مسئلہ ایسا پیش آئے جس کا فیصلہ کرنے میں تم کو دشواری پیش آرہی ہو اور اس بارے میں کتاب وسنت میں کوئی حکم نہ ہو تو اس جیسے دوسرے مسائل کو دیکھو اس میں شریعت کا کیا حکم ہے، اور بعض امور کو بعض پر قیاس کرو، اور جو بات تم کو حق کے زیادہ مشابہ معلوم ہو اس کی اتباع کرو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود فرمایا کرتے تھے، اگر تم میں سے کسی کو فیصلہ کرنا ہو تو پہلے وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے، اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم نہ ہو تو سنت رسول اللہ سے فیصلہ کرے اور اگر وہ حکم ان دونوں میں نہ ہو تو یہ دیکھے کہ اس طرح کے مسائل میں صالحین کا کیا طرزِ عمل تھا، اس کے مطابق وہ فیصلہ کرے، اگر وہ مسئلہ ایسا ہو کہ صالحین کے فیصلوں میں اس کا حکم نہ ملے تو پھر اپنی رائے سے اجتہاد کرے، اور اس وقت کوئی یہ نہ کہے کہ میں رائے سے فیصلہ کرنے سے خوف کھاتا ہوں، اس لئے کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے بیچ کی چیز شبہ والی ہے، تو اس کو اختیار کرے جس میں کوئی شبہ نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا مندرجہ بالا کلام متعدد سندوں سے منقول ہے، کئی سندوں سے خود خطیب نے اس کو ذکر کیا ہے۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ ایک آدمی نے ایک عورت سے شادی کی، اس نے نکاح کے وقت مہر نہیں مقرر کی تھی، اور بیوی کے پاس جانے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوگیا تو اس کی مہر کی مقدار کیا ادا کی جائے گی؟ تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ تلاش کرو کسی حدیث میں اس کے بارے میں کچھ ہے، تو لوگوں نے کہا کہ ہم نے تلاش کرلیا ہے، ہمیں اس بارے میں کوئی اثر نہیں ملا، تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس مسئلہ میں اپنی رائے سے کہتا ہوں اگر درست رائے ہوئی تو یہ اللہ کی طرف سے ہوگی، پھر فرمایا کہ میری رائے ہے کہ ایسی عورت کے لئے اس جیسی عورت کا جو مہر مقرر ہوتا ہے اس کا آدھا مہر ہوگا، اس میں کسی طرح کی کمی زیادتی نہ ہوگی اور اس پر عدت بھی واجب ہوگی، اور اس کو میراث سے حصہ بھی ملے گا، ان کا یہ فتویٰ سن کر حضرت ابوسنان اشجعی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اسی طرح کا فیصلہ ہمارے قبیلہ کی ایک عورت بروع بنت واشق کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے کیا تھا، ان سے یہ بات سن کر حضرت ابن مسعود خوش ہوگئے کہ انھوں نے اپنی رائے سے جو فتویٰ دیا تھا وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کے مطابق تھا، بعض روایات میں ابوسنان اشجعی کے بجائے معقل بن سنان اشجعی کا ذکر ہے۔

حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ میں ان سے یہ معلوم کروں کہ اگر کوئی عورت شوہر اور والدین کو چھوڑ کر مری ہو تو اس کی میراث کیسے تقسیم ہوگی؟ تو حضرت زید نے فرمایا کہ شوہر کو بیوی کا نصف مال ملے گا اور ماں کو آدھے کا ثلث ملے گا، اور بقیہ باپ کو ملے گا، حضرت ابن عباس نے کہا کہ ماں کو پورا ثلث ملے گا۔

عبدالرحمٰن اصبہانی نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ بات کتاب اللہ سے کہہ رہے ہیں یا یہ آپ کی اپنی رائے ہے؟ تو حضرت بن عباس نے کہا کہ میں اپنی رائے سے یہ کہہ

رہا ہوں اور میں ماں کو باپ پر فضیلت نہیں دیتا ہوں۔

عبداللہ بن زید فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اگر قرآن میں اس کا ذکر ہوتا تو اس کو بتلاتے، ورنہ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث سے بتلاتے، اگر حدیث میں بھی وہ مسئلہ نہ ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے مطابق فتویٰ دیتے، اگر وہ مسئلہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے فیصلوں میں بھی نہ ہوتا تو خود اپنی رائے سے اجتہاد کرتے۔

حسن بن عبید نخعی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابراہیم سے پوچھا کہ کیا جو آپ فتویٰ دیتے ہیں وہ سب آپ کا سنا ہوا ہوتا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا نہیں، میں نے جو سنا ہے وہ تو سنا ہی ہے اور بہت سے سوالات میرے پاس ایسے آتے ہیں جن کے بارے میں میرے پاس کوئی اثر یا حدیث نہیں ہوتی ہے تو میں سنی ہوئی بات پر ان کو قیاس کر لیتا ہوں۔

رقبہ حضرت حماد سے روایت کرتے ہیں کہ حماد فرماتے تھے کہ میں حضرت ابراہیم نخعی سے مسائل کے بارے میں سوالات کیا کرتا تھا، وہ ان کا جواب دیتے تھے اور جب ان کو میرے چہرہ سے پتہ چلتا ہے کہ میں نے سمجھا نہیں ہے تو بذریعہ قیاس مجھ کو سمجھاتے تھے اور کسی مسئلہ کے بارے میں فرماتے کہ ہر جگہ قیاس نہیں چلتا۔

ابن شبرمہ قیاس ورائے کے بارے میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

اقض بما فی کتاب اللہ مفترضا

وبالنظائر فاقض والمقاییس

یعنی کتاب اللہ سے فیصلہ کرو اور ایک نظیر کو دوسری نظیر پر قیاس کر کے فیصلہ کرو۔

حضرت امام احمد بن حنبل کہا کرتے تھے کہ دین نام ہے سنت کا اور اتباع کرنے کا، اور قیاس شرعی یہ ہے کہ تو کسی اصل پر قیاس کرے، اگر تم نے اصل کو باطل کر دیا تو پھر قیاس کس پر کرو گے؟ لوگوں نے حضرت امام احمد سے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیاس وہی آدمی کر سکتا ہے جو بڑا عالم ہو اور وہ جانتا ہو کہ فلاں چیز کی نظیر فلاں چیز ہے؟ تو حضرت امام احمد نے فرمایا کہ ہاں اسی طرح کا آدمی قیاس کرے، غیر عالم کو قیاس کرنا

جائز نہیں ہے۔

خطیب ان روایتوں کوذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے جو کچھ روایتیں نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوگیا کہ قیاس کے ذریعہ سے شرعی حکم معلوم کرنا صحیح ہے اور داؤد بن علی یا ان کے اصحاب جو قیاس کے منکر ہیں ان کا قول فاسد ہے۔

پھر خطیب نے داؤد ظاہری کے ان استدلالات کا جواب دیا ہے جن کے ذریعہ داؤد ظاہری قیاس کو باطل قرار دیتے ہیں۔

مثلاً داؤد نے قیاس کو باطل قرار دینے کیلئے قرآن کی اس آیت سے استدلال کیا ہے، قرآن میں ہے: **وأن تقولوا على الله مالا تعلمون** ،یعنی جو بات تمہیں معلوم نہ ہو اسے اللہ پر مت گڑھو۔ خطیب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ قیاس کے ذریعہ سے جو فیصلہ ہوتا ہے وہ غیر معلوم نہیں بلکہ معلوم ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی حاکم دوشاہدوں کی شہادت پر جب ان شاہدوں کی عدالت اوران کا صدق اس کو بذریعہ ظن غالب حاصل ہوا ہو کوئی فیصلہ کرے، یعنی حاکم نے محض ظن سے شاہدوں کو عادل ہونا اور سچا ہونا معلوم کیا ہے، مگر حاکم کا یہ فیصلہ نافذ العمل ہوگا اور وہ شرعی فیصلہ کہلائے گا۔

یا اس کی مثال یہ ہے کہ آدمی کعبہ کے رخ کی طرف یہ سمجھ کر نماز پڑھتا ہے کہ اسی طرف کعبہ ہے، تو اس طرف رُخ کرنا اور نماز پڑھنا واجب ہے، کعبہ کا رُخ معلوم کرنے کیلئے محض ظن غالب کا ہونا کافی ہے کہ اس طرف کعبہ ہے۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ **فاذا عملوا بالرائی فقد ضلوا** ،یعنی جب لوگ رائے پر عمل کریں گے تو گمراہ ہوجائیں گے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی یہ بات اس رائے کے بارے میں ہے، جو کتاب وسنت کے مخالف ہو، کتاب وسنت کی جو مخالفت کرے گا وہ گمراہ ہوگا ، یعنی مجتہدین تو کتاب وسنت کی روشنی میں قیاس کرتے ہیں اس لئے ان کا قیاس مذموم نہ ہوگا، نہ اس قیاس کو کتاب وسنت کے خلاف کہا جائے گا۔

یہی جواب ان تمام احادیث کا ہے جن میں قیاس ورائے کی مذمت کا بیان ہے، اور حضرت عمر کا یہ فرمانا کہ قیاس ورائے والے سنت کے دشمن ہیں تو جو سنت کو اصل قرار دے اور اس پر قیاس کریں وہ سنت کا دشمن کیسے ہوگا۔ حضرت عمر کا یہ قول انھیں لوگوں کیلئے ہے جو سنت کی موجودگی میں قیاس کریں، اور سنت کی مخالفت کریں۔ اسی طرح سے جن صحابہ کرام یا تابعین سے قیاس کی مذمت منقول ہے ان سب کا مقصد اس قیاس ورائے کی مذمت کرنا ہے، جو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے مخالف ہو، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جن صحابہ کرام یا تابعین عظام سے قیاس ورائے کی مذمت منقول ہے انھیں سے قیاس کا ثبوت بھی ہے، اور یہ تمام حضرات ان مسائل پر عمل کو جائز قرار دیتے تھے جن کا استنباط قیاس کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔

اور جو حضرات جعفر بن محمد سے یہ منقول ہے کہ انھوں نے کہا کہ پہلا قیاس کرنے والا ابلیس تھا تو یہ صحیح ہے مگر اس کا قیاس نص کے مقابلہ میں تھا، اس نے اپنے قیاس کے ذریعہ اللہ کے حکم کی مخالفت کی تھی، پھر اس کا قیاس بھی صحیح نہیں تھا، اس لئے کہ اس کے قیاس کا حاصل یہ تھا کہ اس کی پیدائش آگ سے ہے اور آدم مٹی سے، اور مٹی آگ سے کمزور ہے تو کمزور کو قوی کے لئے سجدہ کرنا چاہئے، اس کا یہ قیاس ہی باطل ہے کہ کمزور قوی کو سجدہ کرے، اس لئے کہ سجدہ کرنا تو محض اللہ کیلئے ہے، جس کو اللہ ہی حکم دے کہ اسے سجدہ کیا جائے گا۔

اور داؤد ظاہری کا یہ کہنا کہ کتاب وسنت میں ہر مسئلہ کا حکم ہے اس لئے قیاس کی ضرورت نہیں ہے تو ان کا یہ کہنا باطل ہے، اس لئے کہ بہت سے احکام ایسے ہیں جن کا حکم کتاب وسنت میں نہیں ہے، مثلاً یہ حکم کہ اگر کسی نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی تو اس کی قضا واجب ہے، مگر اس نماز کے قضا کے وجوب کا حکم کسی نص سے ثابت نہیں ہے، یہ حکم بذریعہ قیاس ہے یعنی جان بوجھ کر جو نماز چھوڑی گئی ہے اس کو اس نماز پر قیاس کیا گیا ہے جو نماز بھول سے یا نیند کے غلبہ سے چھوٹ گئی ہے یعنی جس طرح سونے والے اور بھول جانے والے کی نماز کی قضا کرنا واجب ہے، اسی طرح جس نے قصداً نماز چھوڑی

ہے اس کی نماز کی قضا بھی واجب ہے۔

اسی طرح اگر محرم نے بھڑ کو حِل یا حرم میں قتل کر دیا ہے تو اس کا کیا حکم ہے، کتاب وسنت میں اس کا بیان نہیں ہے، اس کو عقرب یعنی بچھو پر قیاس کیا گیا ہے۔

اسی طرح اگر بلی گھی میں مرجائے تو گھی پاک رہے گا یا ناپاک ہو جائے گا، کتاب وسنت سے اس کا حکم نہیں معلوم کیا جا سکتا، اس کو چوہے پر قیاس کیا گیا ہے کہ جو حکم اس شکل میں چوہے کا ہے وہی بلی کا بھی ہے۔

اس طرح اور بھی بہت سے دقیق مسائل ہیں جن کا بیان قرآن وحدیث میں نہیں ہے ان کا حکم بذریعہ قیاس ہی جانا گیا ہے۔

پھر یہ بھی معلوم ہو کہ قیاس کرنے کی یہ شرط بھی نہیں ہے کہ نص معدوم ہو تب ہی قیاس کیا جا سکتا ہے، قیاس کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ قیاس کتاب وسنت کے مخالف نہ ہو، اگر ایسا ہو تو نص کی موجودگی میں بھی قیاس کرنا جائز ہے۔

☆☆☆☆☆

کیا صاحبین نے امام ابو حنیفہؒ سے
دو ثلث مسائل میں اختلاف کیا ہے؟

مکرمی حضرت مولانا غازی پوری صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمد للہ ''زمزم'' پابندی سے مل رہا ہے، اور اس کے مضامین سے ہم نے بڑا نفع اٹھایا ہے، براہ کرم یہ واضح کریں کہ امام ابو حنیفہ کے شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد جن کو صاحبین کہا جاتا ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دو تہائی مسئلوں میں اختلاف کیا ہے۔ اس کو غیر مقلدین بہت اُچھالتے ہیں۔ والسلام

عبد القدوس میرٹھ

زمزم ! غیر مقلدین حضرات کی سب سے لذیذ غذا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی توہین وتنقیص کرنا ہے، یہ ہر اُس بات کو اُچھالتے ہیں جس سے امام عالی مقام کا رتبہ گھٹے، آج کل غیر مقلدیت کا شیوہ وشعار یہی بات رہ گئی ہے، اور سب سے بڑا غیر مقلد وہی ہے جس کی زبان حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں سب سے زیادہ چلے، اگر یہ بیچارے اس بات سے واقف ہوتے کہ امام اعظم ابو حنیفہ کی شان میں گستاخی کرنے والا اپنے ایمان سے بھی محروم ہو جاتا ہے تو یہ ایسی حرکت کبھی نہ کرتے۔ سنئے! امام ابو حنیفہ کی شان گھٹانے والوں کا حشر کیا ہوتا ہے اور وہ ایمان کی دولت سے کیسے محروم ہو جاتا ہے۔

مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ مشہور غیر مقلد واہلحدیث عالم تھے، ان کے والد مولانا عبد الجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اہلحدیث تھے، مگر صاحب دل اور صاحب

معرفت تھے، مولانا داؤد غزنوی اپنے والد کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ایک روز حضرت والد بزرگوار کے درس بخاری میں ایک طالب علم نے کہہ دیا کہ امام ابوحنیفہ کو پندرہ حدیثیں یاد تھیں، مجھے ان سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں، والد صاحب کا چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہوگیا، اس کو حلقۂ درس سے نکال دیا اور مدرسہ سے بھی خارج کردیا، اور بحوائے اتقوا بفراسة المومن فانه ینظر بنور الله (مومن کی فراست سے ڈرو، اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) فرمایا کہ اس شخص کا خاتمہ دین حق پر نہیں ہوگا۔ ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ معلوم ہوا کہ وہ طالب مرتد ہوگیا۔ (داؤد غزنوی، ص: ۳۸۴)

ہم مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے صاحب دل اور صاحب معرفت تو نہیں ہیں کہ قطعیت کے ساتھ اس طرح کا کوئی دعویٰ کرسکیں، مگر ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے کہ ائمہ دین کی شان میں گستاخ غیر مقلدین کی دینی زندگی تباہ و برباد رہتی ہے، حتیٰ کہ یہ عبادتوں سے بے تعلق ہوجاتے ہیں اور نماز جیسی عبادت بھی ان کے یہاں ایک رسمی کارروائی بن کر رہ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے دین و ایمان کی حفاظت فرمائے۔

رہا آپ کے سوال کا جواب تو ہمارا دوٹوک جواب تو یہ ہے کہ یہ غیر مقلدین کا بدترین پروپیگنڈہ ہے، اگر یہ بات غیر مقلدین کسی سے نقل کر کے کہتے ہیں تو یہ تقلیدی حرکت ان کی غیر مقلدانہ شان کے بالکل خلاف ہے، بلا تحقیق منہ سے بات نکالنا اہل اجتہاد کا کام نہیں ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ان دونوں شاگردوں کی بہت سی کتابیں اب طبع ہوچکی ہیں، ان کو آدمی دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے کہ جس نے یہ اڑایا ہے کہ صاحبین نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دو تہائی مسئلوں میں اختلاف کیا ہے، اس کی بات میں کتنی سچائی اور کتنا وزن ہے۔

اور کتابوں کو تو جانے دیجئے صرف مؤطا امام محمد کو ہاتھ میں آپ لے لیں اور

اس کا صفحہ الٹتے جائیں اور ہاتھ میں قلم اور کاغذ بھی رکھ لیں، اور امام محمد ہر حدیث کے ساتھ جو اپنا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں اس کو نوٹ کرتے جائیں اور پھر شمار کرلیں کہ امام محمد دس فیصد سے بھی کم مسائل میں امام اعظم سے اختلاف کرتے ہیں، دو تہائی کی بات تو بہت بڑی ہے۔ یہ اس بات کی تحقیق کا بہت عمدہ اور آسان ذریعہ ہے، اسی سے معلوم ہو جائے گا کہ غیر مقلدین حضرات اس طرح کی باتیں بلاتحقیق اڑاتے ہیں، اور اگر کسی حنفی کی کتاب میں ان کو اس طرح کی بات مل جائے تو پھولے نہیں سماتے، مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی نے یہ بات کہیں لکھ دی ہے اور وہ بھی ایک ایسی کتاب کے حوالہ سے جو منسوب تو ہے امام غزالیؒ کی طرف، مگر فی الاصل وہ ان کی کتاب ہی نہیں ہے، اور اگر کسی نے اس کو امام غزالی کی کتاب کہا بھی ہے تو اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کتاب میں تمام باتیں امام غزالی کی نہیں ہیں بلکہ بہت سی باتیں دوسروں نے اس میں شامل کردی ہیں۔ اس کی کچھ تفصیل علامہ ابن حجر مکی شافعی کی کتاب ''الخیرات الحسان'' میں موجود ہے۔

والسلام

محمد ابوبکر غازی پوری

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا شرعی مسائل میں حیلوں کی گنجائش ہے؟

مکرمی حضرت مولانا محمد ابوبکر صاحب غازی پوری صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

اللہ آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے ہماری کتنی گتھیوں کو سلجھایا ہے، اور آپ کی تحریروں نے ہمیں کتنا اطمینان بخشا ہے، اس کا اظہار الفاظ کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ بارک اللہ فی حیاتکم۔

حضرت والا! ہمارے یہاں ایک موضوع زیر بحث ہے کہ کیا شرعی مسائل میں حیلوں کی گنجائش ہے، اور کیا حیلہ کا ثبوت کتاب وسنت سے ہے، احناف کی کتابوں میں بعض شرعی مسائل میں حیلوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ حضرات غیر مقلدین کو اس پر بہت کچھ اعتراض ہے، براہ کرم آپ اس بارے میں زمزم میں ایک تحریر شائع کردیں، کرم ہوگا، نوازش ہوگی۔

والسلام

امتیاز احمد قاسمی گورکھپور

زمزم ! اللہ کا شکر ہے کہ وہ ہم جیسے کم علموں اور طفل مکتب سے کچھ کام لے رہا ہے، بس دعا فرماتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اخلاص کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ ہم جو کچھ بھی لکھتے ہیں وہ بزرگوں کی تحریروں سے استفادہ ہوتا ہے، اپنی کوئی تحقیق نہیں ہوتی ہے، قلم اپنا ہوتا ہے، بات ان کی ہوتی ہے، کمال ان بزرگوں کا ہے، ہم

تو صرف نقال ہیں۔ وکفیٰ بذٰلک فخراً

جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو

اولاً عرض یہ ہے کہ آپ غیر مقلدوں کے اعتراض سے گھبرائیں نہیں، ان کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے اکابر پر صرف اعتراض ہی کیا ہے، فقہائے کرام، اولیائے عظام، محدثین کرام کو تو جانے دیجئے صحابہ کرام تک کو بھی انھوں نے نہیں بخشا ہے، ان کی تالیف وتصنیف کی دنیا اکابر پر اعتراض سے عبارت ہے

وللناس فیما یعشقون مذاهب

اگر آپ کا ان سے کوئی رشتہ اور تعلق ہے تو ان کی ہدایت کے لئے دعا فرماتے رہیں۔

رہا یہ کہ شرعی مسائل میں حیلوں کی بھی کوئی گنجائش ہے، تو عرض ہے کہ بلاشبہ ہے اور یقیناً ہے، حیلوں کا جو انکار کرے اور اسے ناجائز بتلائے تو وہ فقہ وحدیث کی بات تو دور کی ہے وہ شخص قرآن سے بھی جاہل ہے، اسے پتہ ہی نہیں کہ خود قرآن میں حیلوں کا ذکر ہے۔ اصل میں حیلہ، مکر، کید کے الفاظ اردو میں ذرا اچھے معنوں میں کم استعمال ہوتے ہیں، اس وجہ سے جب ان الفاظ کا ذکر زبان پر آتا ہے تو آدمی کو گھبراہٹ ہوتی ہے، اور غیر مقلدین عوام کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر ان کے اندر شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔

اب سنئے کہ حیلہ، مکر، کید کے الفاظ کے اصل معنی ہیں خفیہ تدبیر کے، کبھی یہ تدبیر مشروع ہوتی ہے اور کبھی نامشروع۔ اب اگر کسی بات کے لئے ان خفیہ تدابیر کا استعمال کیا جائے تو دیکھا جائے گا کہ وہ بات جائز ہے کہ ناجائز، اور وہ خفیہ تدبیر مشروع ہے کہ نامشروع، اگر وہ تدبیر یا وہ حیلہ مشروع ہے اور جس مقصود کے لئے اسے استعمال کیا جارہا ہے وہ بھی مشروع ہے تو ایسا حیلہ بالاجماع جائز ہے، اگر وہ تدبیر یا وہ حیلہ غیر مشروع ہے اور جس مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے وہ بھی غیر مشروع ہے تو وہ بالاجماع حرام ہے، اگر حیلہ تو مشروع ہے مگر جس مقصد کے لئے اس کو استعمال کیا جارہا ہے وہ مقصد منکر اور غیر مشروع ہے تب بھی وہ حیلہ ناجائز ہے، اگر وہ حیلہ غیر مشروع

ہے لیکن مقصود مشروع ہے تو حیلہ کے استعمال کا گناہ تو ضرور ہوگا مگر چونکہ مقصود میں کوئی خرابی نہیں ہے اس لئے وہ مقصود حلال ہی ہوگا، البتہ بعض لوگ اس چوتھی شکل کو بھی جائز نہیں رکھتے، ان کا کہنا ہے کہ چونکہ مقصود غیر شرعی طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے اس لئے وہ بھی حرام ہوگا۔

ان چاروں شکل کو آپ ذہن میں رکھئے، پھر میری بات سنئے کہ فقہائے کرام نے شرعی مسائل میں جو حیلوں کا استعمال کیا ہے، تو اس سے ان کی غرض مقصود شرعی کو حاصل کرنا ہوتا ہے، مثلاً کبھی آدمی کو حرام سے بچانا ہوتا ہے، کبھی کسی شرعی تنگی سے نکالنا ہوتا ہے، کبھی مظلوم کی اعانت ہوتی ہے۔ اب بتلایئے کہ اگر ان مقاصد کے لئے یا ان جیسے مقاصد کے لئے حیلوں کا استعمال کیا جائے تو یہ خرابی کی بات ہے یا خوبی کی۔ یہ فقہائے کرام کا کارنامہ ہے یا ان پر لعن طعن کی بات ہے، بلاشبہ اگر مقاصد شرعیہ کو باطل کرنے کے لئے اور لوگوں کو حرام میں مبتلا کرنے کے لئے کسی ظالم کی حمایت کے لئے اگر حیلوں کا استعمال کیا جائے تو خواہ وہ حیلہ اپنی جگہ شرعاً کوئی قباحت نہ رکھتا ہو، مگر اس سے شرعی مقاصد کا ابطال ہوتا ہے تو وہ حیلہ حرام ہے، اسے کوئی بھی جائز نہیں رکھتا، اور جن ائمہ کرام کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے وہ غلط ہے، جھوٹ ہے، ان ائمہ پر افتراء ہے۔ اللہ رحم کرے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر، احناف کے خلاف یہ فتنہ انھوں نے ہی اٹھایا ہے، اور بخاری شریف میں کتاب الحیل کا باب قائم کرکے **قال بعض الناس** سے اگر ان کی مراد احناف ہی ہیں تو ان کی طرف وہ باتیں منسوب کی ہیں جن سے ائمہ احناف کا دامن پاک ہے، اور اگر **قال بعض الناس** سے مراد ان کی خاص حضرت امام اعظم کی ذات ہے تو امام بخاری کو اللہ کے یہاں جواب دینا ہوگا، اس لئے کہ حضرت امام اعظم سے بسند صحیح ایک حیلہ بھی جو غیر مشروع ہو اور جس کا استعمال غیر مشروع مقاصد کے لئے کیا گیا ہو منقول نہیں ہے، اگر کسی غیر مقلد میں ہمت ہے اور اس کا علمی اُفق بہت وسیع ہے تو صرف ایک مثال پیش کرکے اس کی صحیح سند امام ابوحنیفہ تک پہونچائے، اچھا اس سے ہلکی بات کہتا ہوں کہ کسی حنفی کا قول کسی فقہ کی کتاب سے دکھائے کہ اس حنفی نے

غیر مشروع حیلہ کا غیر مشروع مقاصد کے لئے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہو، یا یہی بات مطلقاً کسی فقہ کی کتاب میں لکھی ہوئی دکھایئے، غیر مقلدین کے اول و آخر سب جمع ہو جائیں گے تب بھی یہ کام ان سے نہ ہو سکے گا۔

حضرت امام بخاری کے بس کی بھی یہ بات نہیں ہے، اس لئے انھوں نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا ہے، نہ انھوں نے صراحۃً امام ابوحنیفہ کا نام لیا ہے نہ ان کے کسی شاگرد کا قال **بعض الناس** کا گول مول لفظ استعمال کیا ہے تاکہ فرار کا راستہ کھلا رہے اور وہ احناف کی گرفت سے بچ سکیں، دیکھو کتنا شاندار امام بخاری نے اپنے بچاؤ کے لئے حیلہ اختیار کیا ہے۔

اوپر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ حیلوں کا ذکر تو خود قرآن میں ہے، اس لئے جائز مقاصد کے لئے اس کا استعمال نص قرآنی سے ثابت ہے مثلاً حضرت ایوب علیہ السلام اپنی بیماری اور ابتلاء کے زمانے میں اپنی بیوی سے کسی بات پر خفا ہو گئے اور قسم کھائی کہ اچھا ہونے پر وہ انھیں سو کوڑے کی سزا دیں گے۔ جب اللہ نے ان کو صحت دی، ابتلاء کا زمانہ ختم ہوا تو بیوی کی زمانۂ ابتلاء و مصیبت میں خدمت گزاری یاد آئی، کس صبر و شکر، محبت واخلاص کے ساتھ انھوں نے حضرت ایوب کی خدمت کی تھی، اب انھیں اپنی قسم پر پچھتاوا ہوا کہ اگر بیوی کو سو کوڑے مارتے ہیں تو بیوی کا زندہ رہنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا، مگر قسم کا پورا کرنا بھی ضروری تھا، تو خود اللہ نے حضرت ایوب کو اس مخمصہ سے نکلنے کیلئے یہ حیلہ بتلایا۔ **خذبیدک ضغثاً فاضرب به و لاتحنث** یعنی اے ایوب اپنے ہاتھ میں سو لکڑیوں کا ایک مجموعہ لے کر اس سے بیوی کو ایک دفعہ مارو، تمہاری قسم پوری ہو جائے گی۔

دیکھا آپ نے! کس تدبیر سے اور کس حیلہ سے حضرت ایوب علیہ السلام کی قسم پوری کرائی گئی اور یہ حیلہ بتلانے والا کون، خود خداوند کریم۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ ایک مریض جو بہت لاغر ہو چکا تھا، اس کے پاس ایک باندی کسی ضرورت سے گئی، یہ مریض اس سے ہم صحبت ہو گیا، جب اس کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہونچائی گئی اور آپ سے مریض کا حال عرض کیا گیا تو آپ نے

اس مریض کو سو کوڑے مارنے کے لئے یہی حیلہ تجویز کیا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ جب بھائیوں کے ساتھ بنیامین حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہونچے اور بنیامین اور حضرت یوسف علیہ السلام کا آپس میں تعارف ہوگیا، اور حضرت یوسف کو معلوم ہوا کہ بھائیوں کی بدسلوکی سے بنیامین تنگ ہیں تو بنیامین کو انھوں نے اپنے پاس روکنے کا ارادہ کیا، مگر کس قانون سے وہ ان کو روکیں، بھائیوں سے اگر کہیں کہ ان کو یہاں رہنے دو تو بھائی لوگ اس پر راضی نہ ہوں گے کہ حضرت یعقوب نے بڑی تاکید سے بنیامین کو واپس لانے کا وعدہ کرایا تھا، تو اس کے لئے اللہ نے حضرت یوسف کو یہ حیلہ بتلایا کہ غلہ ناپنے والے سے کہو کہ بنیامین کے غلہ میں ناپنے کا برتن رکھ دیں، پھر اس کی تلاشی ہو تو جب ان کے غلہ سے برتن نکلے گا تو ان پر چوری کا الزام ثابت ہوگا اور چور کی سزا حضرت یعقوب کی شریعت میں یہ تھی کہ چوری ثابت ہوجانے کے بعد چور کو بدلہ میں لے لیا جاتا تھا، چنانچہ حضرت بنیامین کو حضرت یوسف نے اپنے پاس رکھنے کے لئے یہی حیلہ اختیار کیا اور اللہ کے یہاں یہ حیلہ ایسا بے غبار تھا کہ اللہ نے اس حیلہ کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا: **كذٰلك كدنا ليوسف ما كان لياخذ أخاه في دين الملك** یعنی ہم نے اس طرح یوسف کے لئے یہ تدبیر اختیار کی، ورنہ بادشاہ مصر کے قانون میں حضرت بنیامین کو اپنے پاس روکنے اور رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس حیلہ میں غور کرنے کی یہ بات ہے کہ بظاہر اس حیلہ کی شکل کچھ اچھی نہیں ہے مگر چونکہ مقصود بہت اہم اور عظیم تھا، یعنی بنیامین کو بھائیوں کے ظلم سے بچانا تھا اس وجہ سے اس حیلہ کی بظاہر اس معیوب شکل کے ان کو اختیار کرنے کی اجازت ہوئی، اور اس کی معیوب شکل ہی کی وجہ سے غالباً اللہ نے اس کو اپنی طرف منسوب کیا کہ ہم نے یہ حیلہ کیا تاکہ حضرت یوسف کی طرف کسی کو انگلی اٹھانے کی گنجائش نہ رہے۔

فقہاء نے غالباً یہیں سے یہ اصل مستنبط کی ہے کہ اگر مقصود عظیم اور کریم ہے تو اس کو حاصل کرنے کے لئے حیلوں کی بعض معیوب شکل یعنی غیر مشروع طریقہ بھی

استعمال کیا جا سکتا ہے مثلاً اگر کسی نے کسی کا مال غصب کیا ہے تو اگر وہ شخص جس کا مال غصب ہوا ہے بلا اجازت اس غاصب کے گھر میں گھس کر اپنا مال لے لیتا ہے خواہ اس کے لئے چور کا بھیس بھی بدلنا پڑے تو اس کو یہ حق حاصل ہو گا یعنی چوری کے حیلہ سے وہ اپنا مال لے سکتا ہے۔

خدا کی خفیہ تدبیر یا حیلہ کی ایک تیسری مثال لیجئے، اس کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ بدر میں مسلمانوں کی تعداد کافروں کے مقابلہ میں بہت قلیل تھی، اسلحہ بھی مسلمانوں کے پاس برائے نام تھا، بظاہر دونوں طاقتوں کا کوئی مقابلہ نہیں تھا، تو اللہ نے یہ کہا کہ پہلے تو حضور ﷺ کو کافروں کی تعداد خواب میں بہت کم دکھائی اس لئے کہ اگر اصل تعداد دکھلا دیتے تو اللہ فرماتا ہے لفشلتم یعنی تم بزدل بن جاتے، اور کافروں کا خوف مسلمانوں میں بیٹھ جاتا اور پھر وہ جنگ کے لئے آمادہ نہ ہوتے، پھر عین جنگ کے موقع پر کافروں کو مسلمانوں کی نگاہ میں کم کر کے دکھلا دیا، اسی طرح مسلمانوں کو کافروں کی نگاہ میں کم کر کے دکھایا، اس طرح یہ معرکہ مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

جنگ جیتنے کیلئے یہ حیلہ یعنی خفیہ تدبیر خود اللہ کر رہا ہے، اب اگر غیر مقلدین کہیں کہ اللہ میاں نے کافروں کے ساتھ دھوکہ کیا، امام بخاری فرمائیں اللہ میاں کے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں تھا، تو ٹھیک ہے ہم اللہ میاں کے سامنے آپ کی عرضی پیش کر دیں گے مگر عالم واقعہ میں تو جنگ بدر جیتنے کے لئے اللہ کی طرف سے یہ حیلہ ہوا اور ضرور ہوا، غیر مقلدین کے علی الرغم ہوا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ کے زمانہ میں کافروں پر غلبہ پانے کے لئے جائز حیلہ کا اختیار کرنا اگرچہ دوسروں کی نگاہ میں بظاہر اس کی شکل اچھی نہ ہو عین مطلوب ہے، دیکھو اللہ نے اس واقعہ میں زیادہ کو کم کر کے دکھایا یعنی جو کچھ دکھایا خلافِ واقعہ دکھلایا، مگر چونکہ اس حیلہ سے ایک بہت بڑے شرعی مقصود اور امر اعظم کو حاصل کرنا تھا، اس وجہ سے اس کا انتظام خود اللہ نے کیا تا کہ کسی غیر مقلد کو چوں چرا کرنے کی گنجائش نہ ہو، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: الحرب خدعة یعنی جنگ تو نام ہی ہے کہ خفیہ تدبیر کو کام میں

لایا جائے، اگر قرآن پاک میں غور کیا جائے تو حیلوں کی اور بھی متعدد مثالیں ملیں گے، مگر صاحب فہم کے لئے قرآن سے یہ تین مثالیں بہت کافی ہیں۔

اوپر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ حیلوں کے ذریعہ امت سے تنگی کو دور کرنا بھی کبھی مقصود ہوتا ہے اور کبھی اس کا مقصد آدمی کو حرام کام سے بچانا ہوتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ یہ دونوں چیزیں عین مطلوب شرعی ہیں، خود قرآن کا ارشاد ہے کہ: یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ یعنی اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، وہ تنگی تمہارے لئے نہیں چاہتا ہے۔

شروع اسلام میں رمضان کی راتوں میں بیوی سے صحبت کرنا حرام تھا، مگر جب اللہ نے دیکھا کہ لوگ اس حکم پر عمل کرنے میں کوتاہ ہیں تو اللہ نے رمضان کی راتوں میں صحبت کی اجازت دیدی، ارشادِ خداوندی ہے: اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ یعنی رمضان کی رات میں اب بیوی سے صحبت کرنے کو حلال کردیا گیا ہے۔ اور فرمایا: فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ، اب تم ان سے صحبت کرو۔ معلوم ہوا کہ امت سے تنگی دفع کرنا اور حرام میں پڑنے سے روکنا شریعت کا عین منشا ہے، اب اگر حیلوں کے ذریعہ سے ان مقاصد کو حاصل کیا جائے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ دیکھو امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے زمانہ میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک گھر میں دو بھائیوں کی شادی ایک ساتھ ہوئی اور دونوں بیویاں ایک ہی دن گھر میں آئیں، اب گھر والوں سے یہ غلطی ہوگئی کہ ایک کی بیوی دوسرے کے پاس کردیا اور دوسرے کی بیوی پہلے کے پاس کردی گئی، جب صبح ہوئی تو کہرام مچا کہ بیویوں کا تبادلہ ہوگیا، سن پریشان کہ اب کیا کریں، لوگ بھاگے دوڑے امام ابوحنیفہ کے پاس گئے اور ماجرا عرض کیا، امام صاحب نے دونوں بھائیوں کو بلا کر پوچھا کہ تم دونوں ان عورتوں کو بیوی بنانے پر راضی ہو جن کے ساتھ تم نے رات گزاری ہے، بھائیوں نے کہا ہاں، تو امام صاحب نے کہا کہ تم اپنی اپنی اصل منکوحہ کو طلاق دے دو، اور پھر ان دونوں عورتوں کا دوبارہ نکاح ان بھائیوں سے کردیا جن کے ساتھ ان کی رات گذری تھی۔ امام صاحب کے اس فیصلہ سے تمام گھرانہ خوشی ومسرت میں ڈوب گیا

اور حدیث وفقہ کے بڑے بڑے امام، امام صاحب کی اس فقاہت پر قربان ہو گئے۔

ایک مسئلہ جس کو غیر مقلدین بہت اچھالتے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی نوجوان کو کسی عورت کی چاہت ہو گئی، وہ اس کو اپنی بیوی بنانے کا خواہشمند ہے، مگر وہ عورت اس سے نکاح کرنے پر راضی نہیں ہے، تو اس نوجوان نے اس عورت کو حاصل کرنے کے لئے دو جھوٹے گواہ قاضی کے سامنے پیش کئے کہ اس عورت سے میرا نکاح ہوا ہے، قاضی نے گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر مرد کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ قاضی کا یہ فیصلہ ظاہراً و باطناً دونوں طرح نافذ ہو گا، یعنی وہ عورت واقعی اس کی بیوی بن گئی گو جھوٹی گواہی دلوانے کا عذاب اس کو ہو گا اور جھوٹی گواہی دینے والوں کو بھی اس کا گناہ ہو گا، مگر بیوی اس کے لئے حلال ہو گی، وہ مرد اس سے ہمبستری کرے گا تو شرعاً اس کے لئے جائز ہے، یہ فقہ حنفی کا مسئلہ کا ہے، دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ یہ عورت قاضی کے فیصلہ کے بعد صرف ظاہری طور پر اس کی بیوی ہو گی، واقعۃً وہ شرعی طور پر اس کی بیوی نہ ہو گی۔ یعنی وہ آدمی اس سے صحبت نہیں کر سکتا، اور اگر کرے گا تو حرام کاری کرے گا۔ غیر مقلدین حضرات اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دیکھو فقہ حنفی میں اجنبی عورت کو بیوی بنانے کا کیسا آسان نسخہ ہے۔

میری گذارش بڑے ادب سے ان حضرات کی خدمت میں یہ ہے کہ خدا اور رسول کو گواہ بنا کر کہو کہ فقہ حنفی میں اس طرح کے عمل کو جائز کہا گیا ہے، امام ابوحنیفہ سے اس کا ثبوت پیش کرو کہ انھوں نے جھوٹے گواہ کے ذریعہ بیوی بنانے کو جائز کہا ہو، امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سے کسی کا قول پیش کرو، کسی فقہ حنفی کی کتاب میں دکھاؤ کہ اس میں اس طرح بیوی بنانے کا عمل سکھلایا گیا ہو، تم یہ ہرگز نہیں کر سکتے ہو، تو پھر خدا سے ڈرو، اس کے رسول سے شرم کھاؤ، کیوں فقہ حنفی کے خلاف ضد پالے ہوئے ہو، کیوں ائمہ احناف پر افتراء کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہو، کیوں دنیا والوں کو دھوکہ دیتے ہو، بات وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو، بات تو یہ ہے کہ اگر کسی بدبخت نے یہ عمل بد کیا اور اس حیلہ سے اس نے کسی اجنبیہ پر بذریعہ قاضی اپنا تسلط جما لیا تو اب شرعی حکم کیا ہو گا، وہ

قاضی کے فیصلہ کے بعد اس کی صرف ظاہری بیوی رہے گی یا وہ واقعۃً اس کی شرعی بیوی ہو جائے گی، تمہارے نزدیک پہلی شکل ہے اور احناف کے نزدیک دوسری شکل ہے۔ اب دیکھو دونوں حکموں کا فرق کیا ہے، تم نے جو شکل اختیار کی ہے یعنی صرف اس کو ظاہری طور پر اس آدمی کو اس عورت کو بیوی قرار دیا ہے، تو وہ جب اس آدمی کے ساتھ رہے گی وہ آدمی اس کو کھلانے پلانے کا ذمہ دار ہوگا، اس کا سارا خرچ برداشت کرے گا، وہ اس کو اپنے ساتھ ظاہری طور پر بیوی بنا کر رکھے گا تو کیا اس کا امکان ہے کہ وہ اس سے صحبت نہ کرے گا؟ اسی لئے تو اس نے اپنی بیوی بنانے کا یہ حیلہ اور غلط طریقہ اختیار کیا تھا، یعنی وہ زندگی بھر تمہارے مسئلہ کی رو سے حرام کاری میں مبتلا رہے گا، اور اس سے جو اولاد پیدا ہوگی سب ناجائز اور حرام ہی ہوگی، معاشرہ اور سماج میں ان کا کوئی مقام نہ ہوگا، دونوں زنا کے مرتکب ہوں قرار پائے جائیں گے۔

احناف کے مسئلہ کی رو سے نہ وہ حرام کاری میں مبتلا ہوگا نہ اس کی اولاد حرامی کہلائے گی، تم نے اس آدمی کو حرام کاری کے لئے چھٹی دی دی، اور امام ابوحنیفہ نے میاں بیوی دونوں کو حرام کاری کی لعنت سے بچایا، ان کی اولاد پر سے جو نطفہ حرام سے پیدا ہونے کا داغ لگ رہا تھا اس سے ان کو محفوظ کیا، اب ذرا انصاف سے سوچو کہ کس کا مسئلہ شریعت کے مزاج اور عقل کے فیصلہ سے ہم آہنگ ہے، تمہارا یا احناف کا، قربان جائیے حضرت امام اعظم کی نگاہِ دوررس پر، خداوند قدوس ان کے ذہن میں وہ بات ڈالتا ہے جن تک ظاہر پرستوں کا تصور بھی نہیں پہونچتا۔

پھر احناف کا یہ مسئلہ ان کے گھر کا گڑھا ہوا نہیں ہے، تمہارے مسئلہ کی تو کوئی شرعی اساس نہیں ہے، احناف کے مسئلہ کی تو شرعی اساس ہے، اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد اور جن کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **علیکم بسنتی وسنة الخفاء الراشدین**، یعنی تم میرے اور میرے خلفاء راشدین کے طریقہ کو اختیار کرو اور اس کو لازم پکڑو۔ انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے اسی طرح کا ایک قضیہ پیش ہوا، یعنی ایک آدمی نے دو جھوٹے گواہ پیش کر کے ایک اجنبیہ پر اپنی بیوی ہونے کا دعویٰ پیش

کردیا، تو حضرت علی نے اس عورت کو اس کی بیوی تسلیم کرلیا، جب بارگاہ مدینۃ العلم سے یہ فیصلہ ہوا تو اس عورت نے حضرت علی سے درخواست کی کہ حضرت جب آپ نے یہ فیصلہ فرما ہی دیا تو میرا نکاح اس سے پڑھادیں تاکہ واقعۃً میں اس کی بیوی بن کر اس کے ساتھ رہوں اور ہم گناہ میں مبتلا نہ ہوں تو حضرت علی نے فرمایا شاھدان زوّجاک یعنی تمہارا نکاح تو تمہارے گواہوں نے اس سے کردیا۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قاضی کو انشاء نکاح کی ولایت حاصل ہے، یعنی اگر کسی عورت کا ولی نہ ہو تو خود قاضی اس کا ولی بن کر اس عورت کا نکاح کراسکتا ہے، اگر وہ عورت محل نکاح بن سکتی ہے یعنی مرد کے لئے اس سے نکاح کرنا شرعاً جائز ہو تو قاضی کے ذریعہ نکاح کا عمل انجام پاسکتا ہے، حضرت علی نے فیصلہ کی بنیاد اسی حکم کو بنایا اور حضرت امام ابوحنیفہ نے حضرت علی ہی کی پیروی میں یہ قول اختیار کیا۔

اب اگر کوئی بد بخت کہے کہ یہ تو حضرت علی کا فیصلہ اور ان کا قول ہے، اور صحابۂ کرام کا قول شرعی مسائل میں حجت نہیں تو اس سے کہا جائے گا کہ تم اپنی بدبختی پر نازاں رہو اور صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کے عمل اور فیصلہ کو مردود قرار دو، تمہارے نصیبہ میں یہی ہے۔ احناف کے نزدیک صحابہ کرام کی تقلید واجب ہے، اور خلفائے راشدین کا عمل اور ان کا فیصلہ قابل حجت ہے، البتہ تم وہ حدیث پیش کرو جس میں حضور ﷺ نے اس طرح کے مسئلہ میں عورت کو صرف ظاہری طور پر بیوی قرار دیا ہو اور اس کا نکاح باطنی طور پر باطل قرار دیا ہو، مجھے یقین ہے کہ تم اس طرح کی حدیث پیش کرنے سے عاجز ہو۔ حضرات احناف نے جو قول اختیار کیا ہے اس کی مضبوط بنیاد ہے اور تمہارے مسئلہ کی کوئی شرعی بنیاد نہیں اور نہ وہ عقلاً قابل قبول ہے۔

اب اخیر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اکابر کی کچھ عبارتیں پیش کردیں جن سے ناظرین کرام کو معلوم ہوگا کہ علماء شریعت کے نزدیک کون سے حیلے جائز ہیں اور کون سے ناجائز!

حضرت حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: وضابطها ان كانت للفرار من

الحرام والتباعد من الاثم فحسن وان کان لابطال حق مسلم فلا، بل هی اثم وعدوان ۔(فتح الباری،ج:۱۲،ص:۳۲۶)یعنی حیلہ کے بارے میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر حیلہ حرام سے بچنے کیلئے اور گناہ سے دور رہنے کیلئے کیا جارہا ہے تو وہ اچھا عمل ہے،لیکن اگر اس کا مقصد کسی مسلمان کے حق کو باطل کرنا ہے تو وہ جائز نہیں بلکہ گناہ اور ظالمانہ عمل ہے۔حضرت امام محمد رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:لیس من اخلاق المومنین الفرار من احکام اللہ بالحیل الموصلة الی ابطال الحق (ایضاً،ص:۳۲۹) یعنی مومنین کے اخلاق کی یہ بات نہیں ہے کہ ایسے حیلوں کے ذریعہ جن سے حق کا ابطال ہوتا ہے اللہ کے احکام سے بھاگنے کا راستہ اختیار کیا جائے۔

حضرت امام محمدؒ کا یہ ارشاد بھی منقول ہے: مااحتال به المسلم حتیٰ یتخلص به من الحرام أو یتوسل به الی الحلال فلاباس به ،یعنی اگر کوئی مسلمان حرام سے بچنے کیلئے یا حلال تک پہونچنے کے لئے حیلہ کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور مااحتال به حتیٰ یبطل حقاً أو یحق باطلاً أو لیدخل شبهة فی حق فهو مکروه والمکروه عنده الی الحرام أقرب ،(ایضاً،ص:۳۳۱)اگر حیلہ کا مقصد کسی حق کو باطل کرنا ہے یا باطل کو حق ثابت کرنا ہے یا حق امر میں شبہ پیدا کرنا ہے تو وہ مکروہ ہے،اور مکروہ امام محمد کے نزدیک حرام سے قریب تر ہے،یعنی وہ مکروہ تحریمی ہے۔

حضرت امام ابو یوسف کتاب الخراج میں فرماتے ہیں:ولا یحتال فی ابطال الصدقة بوجه ،یعنی صدقہ باطل کرنے کیلئے کسی طرح کا حیلہ جائز نہیں ہے۔(ایضاً،ص:۳۳۱)

ان تمام حقائق کے واضح ہو جانے کے بعد بھی اگر کوئی شخص ہٹ دھرمی ہی پر اتر آئے اور باطل حیلوں کو کسی بھی امام فقہ وحدیث کی طرف منسوب کرے تو وہ بقول ابن القیم جاہل ہے،اور ان ائمہ کی قدر ومنزلت سے ناواقف ہے۔ابن قیم فرماتے ہیں: ولایجوزان تنسب هٰذه الحیل الی احد من الائمة ومن نسبها الیٰ احد

منهم فهو جاهل باصولهم ومقاديرهم ومنزلتهم من الاسلام ۔یعنی ان باطل حیلوں کوکسی امام کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں ، اور جو شخص ان کوکسی امام کی طرف منسوب کرتا ہےتو وہ ان کے اصولوں اوراسلام میں ان کی قدر ومنزلت سے ناواقف ہے۔(اعلام،ج:۲،ص:۸۷،**نقلاً من مقالات ابی المآثر**)

میں نے اس بحث میں کچھ درازنفسی سے کام لیا ہے،اس لئے کہ غیر مقلدین حضرات عوام کوگمراہ کرنے کیلئے حیلہ کے نام کو بہت غلط طریقہ سے استعمال کرتے ہیں، جبکہ وہ اسلام میں حیلہ کی حقیقت کیا ہے،کون سا حیلہ جائز ہےاورکون سانا جائز،اس سے جاہل درجاہل ہوتے ہیں۔امید کہ یہ تحریرآپ کے لئے اور زمزم کے دوسرے قارئین کے لئے کچھ مفید ہوگی۔**وصلی اللہ علی النبی الامی**۔

والسّلام

☆☆☆☆☆

نوٹ: اس موضوع پر اگرکسی کومزید معلومات حاصل کرنی ہوتو اس کومصری عالم شیخ ابوزہرہ کی کتاب''**امام ابوحنیفہ**'' کا مطالعہ کرنا چاہئے،انھوں نے اپنی کتاب میں حیلہ پر بڑی جانداراورشاندار بحث کی ہےاورمعترضین کےاعتراضات کو **ھباءً منثوراً** کردیا ہے۔

جس عورت کا شوہر لا پتہ ہو جائے تو عورت کیا کرے؟

غیر مقلدین اپنے مسلک کی وضاحت کریں اور اس کو قرآن وسنت سے ثابت کریں

گرامی قدر جناب حضرت مولانا ابوبکر صاحب غازی پوری دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدمت میں ضروری عرض ہے کہ زمزم میں سوالات کے جوابات بڑے ہی دلچسپ اور تسلی بخش ہوتے ہیں۔ اس وقت جناب والا کی خدمت میں ایک سوال ارسال ہے، کہ زوجہ مفقود الخبر کتنا دن انتظار کر کے دوسری شادی کرے گی، ایک غیر مقلد عالم ''امام ابوحنیفہ اور اس بارے میں ان کا فتویٰ'' یہ عنوان دے کر امام صاحب علیہ الرحمہ اور ان کے اس فتویٰ کی خوب توہین کر رہا تھا۔

اس سلسلہ میں غیر مقلد کے چار سال کا فتویٰ اور اس کے دلائل کی حقیقت اور امام صاحب علیہ الرحمہ کے ۹۰ رسال کا فتویٰ دلائل کی روشنی میں اس موضوع پر آپ کی تحریر انشاء اللہ ہم سب کے لئے باعث بصیرت ہوگی۔

زمزم ہی کے کسی شمارہ میں اپنی تحریر شائع فرما کر مشکور فرمائیں۔ فقط

نعیم الدین قاسمی مولانا آزاد سکنڈری اسکول

بساؤ، جھنجھونوں

زمزم! آپ نے لکھا ہے کہ ایک غیر مقلد عالم، امام صاحب کی اور ان کے فتویٰ کی، کہ نوے سال عورت انتظار کر کے شادی کرے گی، بڑی توہین کر رہا تھا، تو عرض یہ ہے کہ غیر مقلدین کی قسمت میں روز اول سے یہ نحوست لکھی ہے کہ وہ اکابر واسلاف کی توہین کریں اور اس منحوس و مذموم عمل پر شاداں ہوں، ان کے بڑوں نے یہی کیا اور اب چھوٹے بھی یہی کر رہے ہیں، اس سے امام صاحب علیہ الرحمہ کا تو کچھ نہیں بگڑتا البتہ غیر مقلدین اپنے انجام کی فکر کریں۔

یہ لن ترانئے جاہل محض ہوتے ہیں، مگر بات علاماؤں والی کرتے ہیں، ان سے ذرا آپ پوچھیں کہ امام صاحب کا یہ فتویٰ انھوں نے کس کتاب میں دیکھا ہے؟ امام صاحب علیہ الرحمہ سے اس بارے میں کس نے استفتاء کیا تھا کہ امام صاحب نے اس کو یہ فتویٰ دیا۔ امام صاحب سے اگر اس بارے میں نوے سال کی کوئی روایت ہو تو روایت کو فتویٰ بتلانا غیر مقلدوں کا کارنامہ ہوسکتا ہے۔

ان غیر مقلدوں کو تو اس کا پتہ ہی نہیں ہے کہ اس بارے میں امام صاحب کا اصل مذہب کیا ہے، اور اس مذہب کی اساس کیا ہے، اگر غیر مقلدین کا اس بارے میں یہ مذہب ہے کہ عورت چار سال انتظار کر کے شادی کر لے تو ذرا اپنی اس بات کو وہ کتاب وسنت سے ثابت کریں۔ قرآن وحدیث میں اس کا ذکر کہاں ہے کہ جس عورت کا شوہر لاپتہ ہو جائے وہ چار سال تک انتظار کرے اور پھر وہ شادی کر لے۔

آپ ان سے صرف اسی کا مطالبہ کریں، پھر دیکھئے ان کا کیا حال ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث کا نام لے کر عوام کو گمراہ کرنے والے یہ لن ترانیے اپنی ساری لن ترانی بھول جائیں گے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ غیر مقلدین کے نزدیک صحابہ کرام کا عمل حجت نہیں، ان کا قول حجت نہیں، یہ صحابہ کرام کی تقلید سے بیزار قوم ہے، خلفائے راشدین کا عمل اور ان کی سنت بھی ان کی نگاہ میں بے حقیقت شئے ہے، تابعین وغیرہم کا اگر وہ نام لیں گے تو خود اپنی قبر کھودیں گے۔ یہ صرف قرآن وحدیث والے ہیں، بس آپ ان سے قرآن وحدیث سے مفقود الخبر شوہر کے بارے میں ان کے مذہب کی دلیل معلوم کریں

اور جس زور وشور سے وہ امام اعظم رحمہ اللہ کی توہین کرتے ہیں یا اس بارے میں ان کے مذہب کا مذاق اڑاتے ہیں کم ازکم اسی زور وشور سے آپ ان سے ان کے چار سال تک انتظار کے بعد عورت کے شادی کر لینے کے جواز کی قرآن وحدیث سے دلیل طلب کریں ،اور ان سے یہ بھی پوچھیں کہ اگر شوہر واپس آ گیا تو وہ بیوی کس کی ہوگی پہلے شوہر کی یا اس دوسرے شوہر کی؟

رہا مفقود الخبر شوہر کی بیوی کے بارے میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یا ائمہ احناف کا مسلک ومذہب تو وہ یہ ہے کہ بیوی کو اس وقت تک دوسری شادی نہیں کرنی چاہئے جب تک کہ شوہر کی طرف سے یا تو اس کے پاس طلاق دینے کی قطعی خبر نہ آ جائے یا یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اس کا شوہر وفات پا چکا ہے،خواہ شوہر کے غائب ہونے کی مدت کتنی بھی گزر جائے ،بیوی کو صبر کے ساتھ ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا انتظار کرنا چاہئے ، اس کے بعد ہی وہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے،شوہر کی گمشدگی کو اپنے لئے وہ ایک آزمائش سمجھے اور اس آزمائش پر وہ صبر کرے۔

یہ ہے احناف علیہم الرحمۃ کا اس بارے میں اصل مذہب چونکہ اصل مذہب یہی ہے کہ اگر طلاق کی خبر نہیں آئی ہے تو بیوی شوہر کی موت کے تحقق کے بعد ہی دوسرا نکاح کر سکتی ہے،تو اب لوگوں نے اپنی رائے سے الگ الگ اندازہ لگایا ہے کہ آدمی عام طور پر کتنے روز زندہ رہتا ہے،بعض لوگوں نے کہا کہ اس کی مدت ایک سو بیس سال ہے،بعض لوگوں نے سو سال کا اندازہ لگایا، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عموماً آدمی نوے سال تک زندہ رہتا ہے، اس سے زیادہ کی زندگی کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، اس وجہ سے نوے سال تک کی عمر پہونچنے تک شوہر کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا، مگر یاد رہے کہ یہ صرف حضرت امام ابوحنیفہ سے ایک روایت ہے، اور چونکہ یہ اندازہ اقرب الی العقل ہے اور تجربات بھی اس کی شہادت دیتے ہیں، اس وجہ سے ہدایہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ فتویٰ اسی پر ہے، اور ''فتویٰ اسی پر ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اب اس کا اس دنیا میں زندہ رہنا موہوم ہے، اس لئے اس کو مردہ سمجھ کر اتنی

مدت کے بعد عورت کو دوسرے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ یعنی اصل اس باب میں یہی ہے کہ شوہر باحیات ہے کہ نہیں، اگر باحیات ہونے کا پتہ چلتا ہے تو بیوی کو ائمہ احناف کے نزدیک دوسرے نکاح کی اجازت نہیں ہے، اگر باحیات نہیں ہے جس اندازہ اتنی طویل مدت یعنی نوے سال کی مدت گذر جانے اور اس کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہونے سے لگتا ہے، تو یہ سمجھ کر کہ اب شوہر اس دنیا میں نہیں رہا، بیوی کو دوسرے نکاح کی اجازت کا فتویٰ دیا گیا، لیکن اب بھی بہتر یہی ہے کہ بیوی دوسرے نکاح سے بچے اور صبر سے کام لے۔

اب اس کو کوئی ظلم سمجھتا ہے تو سمجھا کرے، بیوقوفوں نے تو شریعت کی بہت سی باتوں کو ظلم سمجھا ہے، زنا کی سزا ظلم ہے، چور کا ہاتھ کاٹنا ظلم ہے، قصاص کی سزا ظلم ہے، عورت کو پردہ میں رکھنا ظلم ہے، ان بیوقوفوں کے نزدیک یہ ساری باتیں ظلم ہیں، تو کیا ان مسائل میں شریعت پر عمل نہ کیا جائے؟ اسی طرح بیوی کے اس طویل مدت تک انتظار کو اگر کوئی ظلم سمجھتا ہے تو وہ سمجھا کرے، اس کی وجہ سے شریعت کا حکم تو نہیں بدلا جا سکتا۔ ذرا یہ بتایا جائے کہ ایک شوہر سے نکاح کے بعد بیوی کو کہاں سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسرا نکاح کرے، یا کسی کو کہاں سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس بیوی کا دوسرے سے نکاح کرادے۔ بیوی کے لئے دوسرا نکاح کرنے کی اس مسئلہ میں دو ہی شکل ازروئے کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ ہے۔ یا پہلا شوہر طلاق دے، یا اس کی وفات ہو جائے، یہاں ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات قطعی طور پر نہیں پائی گئی ہے، نہ پہلے شوہر کے طلاق دینے کی خبر ہے اور نہ اس کے وفات پا جانے کی خبر ہے، تو کسی اور کے لئے وہ بیوی کیسے حلال ہوسکتی ہے؟

اگر غیر مقلدین کہیں کہ امام مالک کا تو یہی مذہب ہے کہ چار سال انتظار کرنے کے بعد وہ دوسرا نکاح کرسکتی ہے، تو عرض ہے کہ کیا آپ کا یہ مذہب امام مالک کی تقلید میں ہے، آپ کے یہاں تو تقلید تو حرام ہے، اور اگر آپ یہ کہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی تو یہی منقول ہے، تو عرض یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول جو بھی ہو آپ کو صحابہ

ے اقوال وافعال سے حجت پکڑنا کہاں جائز ہے، آپ تو صرف قرآن وحدیث والے
اہل ہیں اور آپ کا نعرہ تو یہ ہے کہ در اقوال صحابہ حجت نیست یعنی صحابہ کے اقوال سے
دلیل پکڑنی جائز نہیں ہے، آپ تو یہ بتلائیں کہ قرآن وحدیث میں اس کا کہاں ذکر ہے
مفقود الخبر شوہر کی بیوی چار سال تک انتظار کرنے کے بعد دوسرے کیلئے حلال
ہو جائے گی۔ اگر آپ میں دم خم ہے تو اپنے مسلک کے مطابق دلیل قرآن وحدیث سے
پیش کر کے اپنی غیر مقلدیت کی لاج رکھئے۔

رہا یہ کہ امام ابوحنیفہ اور ائمہ احناف کا جو میں نے یہ مذہب بتلایا ہے کہ ان
حضرات کے نزدیک شوہر مفقود الخبر کی بیوی دوسرا نکاح اس وقت کر سکتی ہے جب اس کو
اطلاع ملے کہ اس کے شوہر نے اس کو طلاق دے دی ہے، یا اس کی وفات ہو چکی ہے تو
اس کے معلوم کرنے کا صحیح ذریعہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں کی کتابیں ہیں، خصوصاً ان
کے علوم کے ناشر حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں ہیں۔ اب سنئے! امام محمد رحمہ اللہ
اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اپنی مشہور کتاب **کتاب الحجة علیٰ اهل المدينه** میں کیا لکھتے ہیں، اس کتاب کی چوتھی جلد کے صفحہ ۵۰ پر وہ لکھتے ہیں:

قال ابو حنيفه رضی اللہ عنہ فی المفقود لاتتزوج امرأته حتیٰ یاتیها الخبر بطلاق أو وفاة فتعتد ثم تتزوج۔

یعنی حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے مفقود الخبر شوہر کے بارے میں فرمایا ہے
کہ اس کی بیوی دوسرا نکاح نہیں کرے گی، الا یہ کہ اس کے پاس اس کے طلاق دینے کی یا
اس کی وفات کی خبر پہونچے، پس وہ عدت گزارے گی پھر دوسرا نکاح کرے گی۔

دیکھا آپ نے یہاں نوے سال تک یا سو سال تک کا یا ایک سو بیس سال تک
انتظار کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، ذکر ہے تو اس کا ہے کہ عورت کے پاس شوہر کے طلاق
دینے یا اس کی وفات کی خبر پہونچے تب وہ اگر چاہے تو دوسرا نکاح کر سکتی ہے، اس مسئلہ
میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے، اور جن کتابوں میں نوے سال یا سو سال
یا ایک سو بیس سال یا اور کسی عدد کا ذکر ہے وہ شوہر کی وفات کا تخمینہ اور ایک اندازہ ہے کہ

اب وہ اس مدت میں اس دنیا میں نہ ہوگا، چونکہ امام ابوحنیفہ کا مذہب اصل وہی ہے جو حضرت امام محمدؒ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے، اس لئے اگر شوہر کے طلاق دینے یا اس کی موت کی اطلاع چند ماہ یا چند سال بعد ہی آگئی تو بیوی کو حق ہوگا کہ طلاق کی اطلاع آنے کی شکل میں طلاق کی عدت گزارنے کے اور موت کی اطلاع آنے کے شکل میں وفات کی عدت گزارنے کے بعد دوسرا نکاح کرے۔ اور جو امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے وہی مذہب دنیائے عدم تقلید کی کے امام الائمہ ابن حزم کا بھی ہے، چنانچہ المحلّٰی طبع جدید کی جلد نمبر ۱۰، ص: ۱۶۲ پر انھوں نے اس مسئلہ کو اس عبارت میں ذکر کیا ہے:

مسئلہ : من فقد فعرف این موضعه أو لم یعرف فی حرب فقد أو فی غیر حرب وله زوجة أو أم ولد وأمة ولم یفسخ بذٰلک نکاح امرأته ابداً وهی امرأته حتیٰ یصح موته۔

یعنی جو شوہر گم ہو جائے تو اس کی موجودگی کی جگہ کا پتہ ہو یا نہ ہو، جنگ میں گم ہو یا غیر جنگ میں، اس کی عورت کا نکاح اس سے فسخ نہیں ہوگا، وہ عورت اسی کی بیوی رہے گی، یہاں تک کہ اس شوہر کے موت کی خبر صحیح طریقہ سے بیوی کو ملے۔ ابن حزم کا کہنا ہے کہ چونکہ اس بارے میں کہ عورت چار سال تک انتظار کر کے دوسرا نکاح کرے، یہ نہ قرآن کا حکم ہے اور نہ رسول کا، اس وجہ سے اس قول کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، اور خدا ورسول کے سوا کسی کی بات قابلِ حجت نہیں ہے۔ (ص: ۱۷۲)

جب ابن حزم کا بھی وہی مذہب ہے جو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ غیر مقلدین ابن حزم کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور اپنے اس امام کا کتنا مذاق اڑاتے ہیں۔

ہمارا اپنا تجربہ غیر مقلدین کے بارے میں یہ ہے کہ یہ گروہ عام طور پر جہل مرکب کا شکار رہتا ہے۔ یعنی الف با سے بے خبر رہتا ہے مگر وہ ظاہر کرتا ہے کہ لام، میم نون کا بھی اسے علم ہے، اور بعض تو چھوٹی یا اور بڑی یا تک بھی پہونچ جاتے ہیں، ان کے اس جہل مرکب میں گرفتار رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ائمہ واسلاف کو تو کتاب وسنت

سے جاہل بتلاتے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کی شان میں گستاخی کے کلمات کہتے ہیں، اور خود کو کتاب وسنت کا علامہ سمجھتے ہیں۔

بہر حال آپ غیر مقلدوں کو ان کے حال پر رہنے دیں۔ ''حتیٰ یصح خبر موتهم عندکم '' مجھ سے یہ سنئے کہ حضرت امام اعظم نے شوہر مفقو دالخبر کے بارے میں اپنا جو مذہب بنایا ہے اس کی بنیاد رائے اور قیاس پر نہیں ہے، بلکہ انھوں نے یہ مذہب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد اور صحابی جلیل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے لیا ہے۔

چنانچہ مصنف عبدالرزاق میں حضرت حکم بن عتبہ سے روایت ہے کہ أن علياً قال : هی امرأة ابتليت فلتصبر حتیٰ ياتيها موت او طلاق۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے بارے میں جس کا شوہر لاپتہ ہے، فرمایا کہ یہ ایسی عورت ہے جس کو آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے، پس اس کو صبر کرنا چاہئے تا آنکہ اس کے پاس شوہر کے طلاق دینے یا اس کے موت کی خبر پہونچے۔

اور اسی مصنف میں یہ بھی ہے: عن ابن جريح قال : بلغنی ان ابن مسعود وافق علياً علیٰ انها تنتظر ابداً ۔ (ج:۷، ص:۹۱) یعنی ابن جریح فرماتے ہیں کہ مجھ تک یہ بات پہونچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے بھی حضرت علی کی موافقت فرمائی ہے کہ یہ عورت اپنے شوہر کا زندگی بھر انتظار کرے گی۔ اس بات کو ابن حزم نے محلی میں بھی ذکر کیا ہے۔ (دیکھو ج:۷، ص:۱۶۸)

اور جو بات ان دونوں جلیل القدر صحابی کی ہے اسی کے قائل حضرت ابوقلابہ بھی ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ليس لها ان تزوج حتیٰ يتبين لها موته ۔ یعنی وہ شادی نہیں کرے گی، یہاں تک کہ شوہر کے وفات پانے کی اطلاع واضح طور پر اس کو ملے۔

اور یہی مذہب جلیل القدر تابعی حکم بن عتبہ کا بھی ہے، اور یہی مذہب حضرت ابراہیم نخعی کا بھی ہے، اور یہی مذہب حضرت امام شعبی کا بھی ہے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے پانچ سو صحابہ کرام کو دیکھا تھا، اور یہی مذہب حضرت جابر بن زید کا بھی ہے، اور یہی مذہب خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا بھی ہے، اور یہی مذہب

حضرت حماد استاذ امام ابوحنیفہ کا بھی ہے، اور یہی مذہب ابن ابی لیلیٰ کا بھی ہے، اور یہی مذہب ابن شبرمہ اور عثمان بتی کا بھی ہے، اور یہی مذہب حضرت سفیان ثوری کا بھی ہے، اور یہی مذہب امام شافعی کا بھی ہے۔ اور ان کے علاوہ اور بھی اجلہ تابعین اور فقہائے امت ہیں جن کا یہ مذہب ہے، اگر اس کی تفصیل جاننا چاہیں تو ابن حزم کی محلی دیکھ لیں، نیز مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبد الرزاق کا مطالعہ کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت امام اعظم کے ساتھ کیسے کیسے ائمہ فقہ وحدیث ہیں، غیر مقلدین کس کس صحابی، تابعی اور امام فقہ وحدیث کو اپنی لن ترانیوں اور بے ہودہ گوئیوں کا نشانہ بنائیں گے۔

چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذہب اقرب الی الکتاب والسنۃ ہے اس وجہ سے امام اعظم نے اس بارے میں ان دونوں جلیل القدر صحابی کی اتباع کی ہے، چنانچہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ حضرت علی اور حضرت عمر کے قول کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **قال محمد: هذا أحب القولين الينا و اشبهھما بالكتاب والسنة مع ماقد جاء من رجوع عمر الى قول علی** رضی اللہ عنہ۔ (**کتاب الحجة**)

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا جو اس مسئلہ میں الگ الگ قول ہے، تو ہمیں حضرت علی رضی اللہ عنہ والا زیادہ پسند ہے، اور وہ ہمارے نزدیک کتاب وسنت کے حکم سے زیادہ مشابہ ہے۔ جبکہ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو حضرات احناف نے کیوں چھوڑا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کو کیوں اختیار کیا، تو اس کو حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ظاہر کر دیا، انھوں نے اس کی دو وجہ بتلائی۔ ایک تو یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول کتاب وسنت سے زیادہ مشابہ ہے، اور دوسری وجہ یہ بتلائی کہ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا، اور تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس مسئلہ میں صرف ایک قول وارد ہے یعنی ایسی عورت کو شوہر کے وفات پانے تک یا اس کے طلاق دینے تک دوسرے نکاح سے رکے رہنا ہے جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کئی طرح کی باتیں

منقول ہیں۔ مثلاً ان کا ایک قول یہ ہے کہ:

تربص اربع سنین وتعتد اربعة اشهر وعشراً (ابن ابی شیبہ، ج:۹، ص:۲۱۰) یعنی عورت چار سال تک انتظار کرے گی، پھر چار مہینے اور دس روز عدت گزارے گی، پھر دوسری شادی کرے گی۔(۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ وہ چار سال تک انتظار کرے گی، پھر شوہر کے ولی کو بلایا جائے گا اور وہ ولی شوہر کی طرف سے اس کی بیوی کو طلاق دے گا، پھر عورت چار مہینہ دس روز عدت گزارے گی، پھر عورت کو شادی کا حق ہوگا۔

(ابن ابی شیبہ، ج:۹، ص:۲۱۰)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تیسرا قول یہ ہے کہ اگر عورت نے چار سال انتظار کرلیا ہے پھر وہ اپنا قضیہ لے کر حاکم کے اپس گئی ہے تو اب وہ پھر سے چار سال مزید گزارے گی، پچھلے چار سال تک انتظار کا اعتبار نہ ہوگا، جب مزید یہ چار سال گزار لے گی تو شوہر کے

(۱) اس قول کی بنا پر حضرت عمر کے نزدیک بھی شوہر کی وفات کے بعد ہی دوسرا نکاح کرے گی، گویا حضرت عمرؓ نے چار سال کی مدت گذرنے کے بعد شوہر کی موت کا اندازہ لگالیا، اسی وجہ سے عدت کی مدت چار مہینے دس دن مقرر کی جو متوفی عنہا کی عدت ہے۔ چنانچہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو بالکل صاف کردیا ہے، کتاب الام میں وہ فرماتے ہیں: **عمر وعثمان قضيا في امرأة المفقود تتربص اربع سنين ثم تعتد عدة المتوفى عنها ثم تنكح، والمفقود من لا يسمع له ذكر وقد يكون الاغلب من هذا انه قدمات** ۔یعنی حضرت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے مفقود الخبر شوہر کی بیوی کے بارے یہ فیصلہ کیا ہے کہ چار سال تک عورت انتظار کرے گی، پھر متوفی عنہا کی عدت گذارے گی، پھر نکاح کرے گی، اور مفقود اس کو کہتے ہیں جس کا ذکر نہ سنا جائے اور اس وجہ سے غالب گمان یہ ہے کہ وہ شوہر وفات پاچکا ہے۔

غیر مقلدین بتلائیں کہ چار سال تک انتظار کرنے کے بعد عورت دوسرا نکاح عدت گزار کر کرے گی یا بلا عدت گزارے، اگر عدت گزار کرے گی تو کتنی عدت گزارے گی؟ تین حیض، یا تین طہر یا چار مہینہ دس دن۔ ان کا جو بھی مذہب ہو دلیل سے اس کو واضح کریں اور دلیل قرآن وحدیث سے ہو۔

ولی کو بلا کر اس سے بیوی کو طلاق دلوایا جائے گا، اور وہ عورت متوفی عنہا کی عدت گزار کر دوسرا نکاح کرے گی۔

غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مختلف اقوال مروی ہیں جبکہ حضرت علی کا اس بارے میں صرف ایک قول ہے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موافقت کرنے والے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی ہیں، نیز بعض روایات سے صراحۃً حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کی تائید ہورہی ہے، چنانچہ دارقطنی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **امرأة المفقود امرأته حتیٰ یاتیها البیان** ، یعنی مفقود الخبر شوہر کی بیوی شوہر ہی کی بیوی ہوتی ہے، الا یہ کہ بیوی کے پاس واضح خبر آجائے (کہ اب وہ دنیا میں نہیں رہا، یا اس نے بیوی کو طلاق دے دی ہے) بیہقی سنن کبریٰ میں اس روایت کو متعدد سندوں سے ذکر کیا گیا ہے۔ (ج:۷،ص:۴۴۵)

اب اگر کوئی یہ کہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو ہم کہیں گے کہ احناف کے نزدیک ضعیف حدیث کا بھی اعتبار ہوتا ہے، اور جب ضعیف حدیث کی تائید آثار صحابہ وتابعین سے بھی ہوتی ہو تو ان کا ضعف جاتا رہتا ہے، محض سند حدیث کی وجہ سے کوئی حدیث ضعیف نہیں ہوتی ہے، خود غیر مقلدین کے اکابر علماء فرماتے ہیں کہ سند کے ضعیف ہونے سے لازم نہیں آتا کہ اصل متن بھی ضعیف ہو، مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری نے اس بات کو اپنی کتاب ابکار المنن میں بار بار دہرایا ہے۔

بہرحال آپ نے دیکھا کہ امام اعظم کے قول کی تائید میں حضرت علی کا بھی قول ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود کا بھی قول ہے، بہت سے اکابر تابعین کا بھی قول ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کی تائید حدیث رسول بھی کررہی ہے، اور غیر مقلدین کے پاس اس مسئلہ میں قرآن وحدیث سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

محمد ابوبکر غازی پوری

☆☆☆☆☆

میاں بیوی بہت دور کی مسافت پر ہوں اور بظاہر ان کے درمیان صحبت کا امکان نہ ہو

فقہ حنفی کا ایک مسئلہ

اور اس پر غیر مقلدین کے اعتراض کی حقیقت

مکرمی حضرت مولانا محمد ابوبکر صاحب غازی پوری مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ مجلہ زمزم کا مطالعہ پابندی سے ہم اور ہمارے احباب کرتے ہیں، اور آپ کی پُر مغز اور مدلل تحریروں سے ہمیں بے انتہا فائدہ ہوا ہے، اللہ آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے غیر مقلدیت کی حقیقت سے ہمیں آگاہ کر دیا، اور فقہ حنفی پر ہمارے اعتماد کو مستحکم بنا دیا۔

غیر مقلدین فقہ حنفی کے اس مسئلہ کو بہت اچھالتے ہیں کہ اگر میاں بیوی سال بھر کی مسافت پر ہوں اور ان کا نکاح ہوا اور بظاہر میاں بیوی کے ملنے کی بھی کوئی شکل نہیں ہے، پھر بیوی کو لڑکا پیدا ہوا تو اگر نکاح کے بعد چھ مہینہ کی مدت میں یہ بچہ پیدا ہوا تو بھی لڑکا حرامی نہیں ہوگا بلکہ اس کا نسب شوہر سے ثابت ہوگا۔

براہ کرم اس مسئلہ پر تھوڑی سی روشنی ڈالیں، کرم ہوگا۔ والسلام

ولی الدین قاسمی
سدھارتھ نگر یوپی

زمزم! غیر مقلدین حضرات مذکورہ بالا مسئلہ کو اس لئے اچھالتے ہیں کہ ان کا رشتہ کتاب وسنت سے بہت کمزور ہے، اور شریعت کے مسائل کی حکمتوں سے یہ ناواقف ہیں، ان کی نگاہ میں نہ وسعت ہے نہ گہرائی، ان کا اوڑھنا بچھونا رفع یدین، آمین بالجہر جیسے کچھ مسائل ہیں، یہ انھیں میں اپنی زندگی کھپاتے ہیں۔ ان کو شریعت اور فقہ کے دقیق ترین مسائل کا علم ہو بھی تو کیسے ہو، اور لطف یہ ہے کہ یہ خود اپنی کتابوں سے جاہل ہوتے ہیں، ان کو پتہ ہی نہیں کہ ان کتابوں میں کیا لکھا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے: **الولد للفراش وللعاھر الحجر** یعنی لڑکا شوہر کا ہوتا ہے اور زانی کے لئے پتھر ہے، یعنی اس کا لڑکے سے کوئی حق متعلق نہیں ہوگا بلکہ اس کو پتھر کی سزا ملے گی۔ یہ حدیث تقریباً بیس صحابہ کرام سے منقول ہے، اس حدیث کی بنا پر جمہور امت کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر میاں بیوی میں نکاح کا تعلق قائم ہے، اور کسی طرح صحبت اور وطی کا امکان پایا جاتا ہے اگر چہ یہ امکان بعید تر ہو اور چھ ماہ کی مدت گذرنے پر بچہ پیدا ہو رہا ہے اور میاں بیوی میں سے کوئی بھی اس بچے کا منکر نہیں ہے بلکہ دونوں اس کو اپنا بچہ تسلیم کر رہے ہیں تو یہ لڑکا حرامی نہیں قرار پائے گا، اور اس کا نسب اس کے باپ سے ثابت ہوگا۔ مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوریؒ مشہور غیر مقلد عالم اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

وظاھر الحدیث ان الولد انما یلحق بالاب بعد ثبوت الفراش وھو لایثبت الا بعد امکان الوطی فی النکاح الصحیح أو الفاسد والی ذلک ذھب الجمھور (تحفۃ الاحوذی، ج:۲، ص:۲۰۳)

مولانا مبارکپوری فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا ظاہری مفہوم یہ بتلاتا ہے کہ نکاح قائم ہونے کی شکل میں لڑکا باپ کا قرار پائے گا، اگر میاں بیوی میں صحبت کا پایا جانا ممکن ہے، خواہ نکاح صحیح ہو یا نکاح فاسد ہو، اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔

اس عبارت میں آپ غور فرمائیں کہ میاں بیوی میں صحبت کا پایا جانا متیقن نہیں ہے، بلکہ صرف امکان ہے کہ میاں بیوی میں صحبت پائی جاسکتی ہے تو محض اس گمان کے پیش نظر لڑکے کا نسب محفوظ ہوگا اور یہ لڑکا شوہر کا بیٹا قرار پائے گا، شوہر اس کا باپ ہوگا بیوی اس کی ماں ہوگی۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ اگر میاں بیوی میں ملاپ کی کسی شکل کا کوئی امکان ہے اگر چہ وہ امکان بعید ہی سہی، تو بھی اس حدیث کی روشنی میں یہ لڑکا شوہر اور بیوی کا ہوگا، الا یہ کہ ماں باپ میں سے کوئی انکار کرے تو اس شکل میں شریعت کا دوسرا قانون جاری ہوگا، لیکن ماں باپ اگر اس کو اپنا لڑکا تسلیم کر رہے ہیں تو اب لڑکے کو حرامی قرار دینا اور ماں کو زانیہ بتلانا اور باپ سے لڑکے کا نسب تسلیم نہ کرنا یہ قطعاً درست نہیں ہے، اگر کوئی غیر مقلد اس پر مصر ہے کہ نہیں صاحب لڑکا حرامی ہے، ماں زانیہ ہے، باپ سے اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا تو اس حدیث کی رو سے وہ غیر مقلد شریعت کا نافرمان ہے، صحیح حدیث کا منکر ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ **الولد للفراش** والی حدیث حدیث حسن اور صحیح ہے، افسوس کہ غیر مقلدین اس مسئلہ کو اچھال کر فقہ حنفی کے خلاف ہی نہیں جمہور کے مذہب کے خلاف طوفان برپا کئے ہوئے ہیں، اور حدیث رسول کا انھوں نے مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔

ہمیں اس موقع پر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ کی بھی ایک غلط بیانی کو واشگاف کرنا ہے، مولانا نے اس حدیث کی شرح میں جمہور کا مذہب بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے: **وروی عن ابی حنیفۃ انہ یثبت بمجرد العقد** یعنی حضرت امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ لڑکے کا باپ سے نسب محض عقد ہی کی وجہ سے ثابت ہوجائے گا۔ مولانا مبارکپوری نے یہاں بہت فریب کو کام میں لا کر اپنی غیر مقلدیت اور احناف اور امام ابوحنیفہ کے خلاف اپنے دلی بغض کو ظاہر کیا ہے۔ پہلا فریب تو ان کا یہ ہے کہ انھوں نے بلا دلیل ایک مرجوح روایت کو امام کا مذہب بتلایا، جبکہ خود وہ رُوِیَ مجہول کا صیغہ لا رہے ہیں، جس مطلب اہل علم خوب سمجھتے ہیں کہ اگر یہ بات امام ابوحنیفہ سے منقول بھی ہے تو یہ قول مرجوح اور غیر مفتیٰ بہ قول ہے، امام ابوحنیفہ کا یہ اصل مذہب نہیں ہے، امام ابوحنیفہ کا

اصل مذہب وہی ہے جو جمہور کا ہے، تو اب بلاوجہ امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب ایک مرجوح قول کو علیحدہ سے ذکر کر کے مذہب حنفی کو جمہور کے مذہب کے خلاف بتلانا یہ کون سی دیانت وامانت ہے۔

دوسری خیانت یا فریب مبارکپوری صاحب کا یہ ہے کہ انھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ یہ بات انھوں نے کس کتاب سے نقل کی ہے۔ ہوا میں فائر کر دیا، کیا ہوائی فائر سے مولانا مبارکپوری صاحب فقہ حنفی کے مضبوط قلعہ میں شگاف ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

تیسرا فریب یا ان کی چالاکی یہ ہے کہ اس بارے میں انھوں نے فقہ اہلحدیث کا مسئلہ نہیں بیان کیا اور جمہور کے سایہ تلے پناہ لینے کا حیلہ اختیار کیا، فقہ اہلحدیث یعنی اس بارے میں غیر مقلدوں کا کیا مذہب ہے اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

چوتھی خیانت یا فریب مبارکپوری صاحب کا یہ ہے کہ انھوں نے امام ابوحنیفہ کا صحیح مذہب نقل نہیں کیا ہے، امام ابوحنیفہ کا بھی صحیح مذہب یہی ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان وطی اور صحبت کا امکان ہو (اگرچہ بطور کرامت یا جنات وغیرہ کے واسطہ سے) اور چھ ماہ کی مدت میں لڑکا پیدا ہوا ہو، اس سے کم مدت میں نہیں تب بھی وہ باپ کا قرار پائے گا، اور یہ اس لئے کہ جب باپ اور ماں اس لڑکے کے بیٹا ہونے کے منکر نہیں ہیں تو یہ صریح دلیل ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کا آپس میں میل ہوا ہوگا ورنہ کون ایسا باپ ہوگا جو حرامی بچہ کو خوشی سے اپنا بچہ بتائے گا۔ غیر مقلدین کے عقل وفہم کو عجیب عالم ہے کہ جس لڑکے کو باپ اپنا بچہ تسلیم کر رہا ہو، اس کو یہ زبردستی حرامی قرار دے رہے ہیں اور ماں باپ کو بلا دلیل خوامخواہ زانی اور زانیہ قرار دینے پر مصر ہیں، اگر یہ زمانہ خلافت اسلامیہ کا ہوتا تو ایسے غیر مقلدوں کو ماں باپ کی شکایت پر حد قذف لگائی جاتی اور جب کوڑے پیٹھ پر پڑتے تب ان کی غیر مقلدیت ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔

قربان جایئے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی دور بینی، فہم وفراست اور تفقہ میں وسعت وگہرائی پر کہ وہ آج سے تیرہ سو سال پہلے دیکھ رہے تھے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ مسافت سمٹ جائے گی اور مشرق ومغرب کا فاصلہ گھنٹوں اور دنوں میں کا ہو جائے گا

اور ایک آدمی بڑی آسانی سے ہزاروں میل کا سفر چند گھنٹوں میں طے کر کے واپس بھی آجائے گا، آج ہم اسی دور میں ہیں، دہلی میں ہوائی جہاز پر سوار ہوئے، چار پانچ گھنٹہ میں سعودیہ پہونچ جائیں گے، وہاں کچھ وقت گزاریئے اور رات میں پھر دہلی واپس آجایئے۔ آپ دہلی میں ہیں، بیوی جدہ میں ہے یا معاملہ اسکے برعکس ہے، کیا اب بھی اور اس دور میں بھی کسی کو مشرق و مغرب کی مسافت پر میاں بیوی ہونے پر ان کے ملاپ کے امکان میں بلکہ عین وقوع میں کچھ شبہ ہے۔ یہ حقیقت آج غیر مقلدین کے سامنے بھی واضح ہے مگر یہ عقل کے اندھے حنفیہ کے اس مسئلہ پر آج بھی اعتراض کئے جارہے ہیں۔ فھل نبکی علیٰ عقول ھؤلاء الغربان ام نضحک علیٰ عقول ھؤلاء الحمقاء

بہرحال آپ نے معلوم کرلیا کہ فقہ حنفی کا یہ مسئلہ عین شریعت کے مطابق ہے، صحیح حدیث سے اس کی تائید ہورہی ہے، اور یہی مذہب جمہور کا بھی ہے، اور آج تو اس مسئلہ کی واقعیت روز روشن کی طرح واضح ہے۔

فقہ حنفی کے مسئلہ پر تو میں نے روشنی ڈال دی، اب ذرا آپ غیر مقلدین کے گھر کا مسئلہ بھی اس بارے میں ملاحظہ فرمائیں۔ نزل الابرار میں ہے:

إذا أتت زوجة الرجل بولد بعد نصف سنة منذ وقع الاجتماع بها ......ولو كان الزوج ابن عشر سنين لحقه نسبه (نزل الابرار، ج:۲،ص:۱۹۱)

یعنی میاں بیوی میں ملاقات ہوئی، میاں صاحب صرف دس سال کے ہیں یعنی نابالغ ہیں اور بیوی کو چھ مہینہ میں بچہ پیدا ہوا، تو اب بچہ دس سال کے میاں صاحب کا ہوگا اور اس بچہ کا نسب ان میاں صاحب نابالغ سے ثابت ہوگا۔

اور آگے یہ بھی ملاحظہ فرمایئے اور غیر مقلدین کے ڈھیٹ پنے کی داد دیجئے، نواب صاحب وحید الزماں فرماتے ہیں:

وان لم يمكن كونه من الزوج (ج:۲،ص:۱۹۱) یعنی وہ لڑکا نابالغ شوہر ہی کا ہوگا، اگرچہ اس مولود کا، شوہر کا لڑکا ہونا ممکن نہ ہو تب بھی وہ لڑکا اس نابالغ شوہر کا ہوگا۔

یعنی فقہ اہلحدیث کا مسئلہ یہ ہے کہ اگرچہ اس کا امکان بھی نہ ہو کہ یہ پیدا شدہ

بچہ اپنے باپ کا ہے تب بھی وہ باپ ہی کا قرار پائے گا۔

اور فقہ اہلحدیث کا یہ مسئلہ کیوں ہے، تو نواب صاحب فرماتے ہیں کہ:

انما الحقنا الولد به حفظاً لانساب المسلمین و احتیاطاً۔

یعنی ہم نے (خدا اور سول نے نہیں بلکہ غیر مقلدوں نے) لڑکے کو باپ کا لڑکا اس لئے قرار دیا تا کہ مسلمانوں کا نسب محفوظ رہے، اور اسلئے بھی کہ احتیاط کا یہی تقاضا ہے۔

آپ فرمایئے کہ فقہ حنفی کا مسئلہ زیادہ تعجب خیز ہے یا فقہ اہلحدیث کا یہ مذہب، اور یہ مسئلہ کہ باپ سے لڑکے کے ہونے کا کوئی امکان بھی نہیں ہے پھر بھی لڑکا باپ ہی کا قرار پائے گا۔

امید ہے کہ غیر مقلدین اپنے فقہ اہلحدیث کے اس مسئلہ کو کتاب وسنت سے ثابت کر کے سرخرو ہوں گے۔

والسلام

محمد ابوبکر غازی پوری

☆☆☆☆☆

طلاق ثلاث کے وقوع پر جمہور اہل سنت کے کچھ دلائل کا تذکرہ

مکرمی حضرت مولانا غازی پوری صاحب دام ظلہ

السلام علیکم ورحمة الله وبركاته

مزاجِ مبارک!

اطلاعاً عرض ہے کہ جناب کا موقر مجلّہ ''زمزم'' دو ماہی پابندی سے مل رہا ہے، جس سے میں اور میرے احباب کافی فائدہ اٹھا رہے ہیں، سوالات کے جوابات کے سلسلہ نے اس پرچہ کی قیمت اور اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے، آپ کے جوابات بڑے تحقیقی اور عام فہم اور اطمینان بخش ہوتے ہیں، میرے احباب میں سے بعض اہلحدیث بھی ہیں کو مزاجاً کچھ سنجیدہ ہیں، وہ بھی زمزم کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کا ان کو انتظار رہتا ہے۔

ایک گزارش ہے کہ زمزم میں طلاق کے موضوع پر اب تک کوئی تحریر نہیں آئی ہے، جبکہ یہ موضوع بڑا اہم ہے، برائے کرم اس بارے میں بھی آپ کچھ تحریر فرما دیں، مہربانی ہوگی اور ہم سب کو فائدہ ہوگا۔ والسلام

محمد عادل، بارہ بنکی، یوپی

زمزم ! طلاق کے موضوع پر اب تک کوئی سوال نہیں آیا تھا اور نہ اس کی کوئی ضرورت محسوس کی تھی، اس لئے کہ یہ موضوع میرے نزدیک مفروغ عنہ ہے، اس بارے

میں بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، خصوصاً مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ''الاعلام المرفوعہ'' اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے، آپ حضرات اس رسالہ کا مطالعہ کریں تو طلاق کا مسئلہ آئینہ ہو جائے گا، اور حق پسندوں کو کوئی خلجان باقی نہیں رہے گا۔ میں بھی جو کچھ لکھوں گا اسی رسالہ سے مستفاد ہوگا۔

(۱) پہلی بات تو آپ یہ معلوم کریں کہ ایک مجلس کی ایک دفعہ دی ہوئی تین طلاق کے واقع ہونے پر اور اس طلاق کے بعد بی بی کو شوہر کے پاس بلا دوسرا نکاح کئے اور اس دوسرے شوہر سے بلا خلوتِ صحیحہ ہوئے نہ جانے پر جمہور امت متفق ہیں، یہ صرف احناف کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ امام ابوحنیفہ کے علاوہ تینوں دوسرے ائمہ کا بھی یہی مذہب ہے، اور یہی مذہب جمہور محدثین کا بھی ہے، مثلاً امام اوزاعی، امام نخعی، امام سفیان ثوری، امام اسحاق، امام ابوثور، امام بخاری کا بھی یہی قول ہے، بلکہ جمہور صحابہ وتابعین وجمہور ائمہ سلف وخلف اس کے قائل ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ مسلم شریف کی شرح میں فرماتے ہیں:

وقد اختلف العلماء فی من قال لامرأته انت طالق ثلاثاً فقال الشافعی ومالک وابوحنیفة واحمد وجماهیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلاث (نووی، ج:۱،ص:۴۷۸)

یعنی اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ تجھ کو تین طلاق ہے، تو کتنی طلاق واقع ہوگی، امام شافعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد اور سلف وخلف کے جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ تین طلاق پڑ جائے گی۔

اور علامہ عینی بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں:

ومذهب جماهیر العلماء من التابعین ومن بعدهم منهم الاوزاعی والنخعی والثوری وابوحنیفه واصحابه ومالک والشافعی واصحابه واحمد واصحابه واسحاق وابوثور ابوعبید وآخرون کثیرون علی ان من طلق امرأته ثلاثاوقعن لکنه یاثم (ج:۹،ص:۵۲۷)

یعنی تابعین اور ان کے بعد کے جمہور علماء مثلاً امام اوزاعی، امام نخعی، امام ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، امام مالک، امام شافعی اور ان کے اصحاب، امام احمد اور ان کے اصحاب، امام اسحاق، امام ابوثور، ابوعبید اور ان کے علاوہ دوسرے اور بہت سے علماء کا یہ مذہب ہے کہ جس نے اپنی عورت کو تین طلاق دیا تو تینوں پڑ جائیں گی، لیکن طلاق دینے والا اس طرح طلاق دینے کی وجہ سے گناہ گار ہوگا۔

خود غیر مقلدوں کے امام ثانی ابن قیم بھی یہی کہتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی کتاب زادالمعاد میں لکھتے ہیں:

تین طلاق بیک زبان دینے سے تینوں طلاق کے واقع ہوجانے کے قائل ائمہ اربعہ اور جمہور تابعین اور بہت سے صحابہ کرام ہیں۔ (ج:۵،ص:۲۴۷)

پس معلوم ہوا کہ جو لوگ تین طلاق کے وقوع کے قائل نہیں ہیں ان کا مذہب شاذ اور جمہور علماء سلف وخلف کے خلاف ہے۔

اور جمہور اہلسنت کے اس بارے میں جو دلائل ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

(۱) بخاری شریف ومسلم شریف میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیا تو اس عورت نے دوسرے آدمی سے نکاح کرلیا، تو اس دوسرے شوہر نے بھی اس کو طلاق دے دیا، تو اس بارے میں آنحضور ﷺ سے مسئلہ معلوم کیا گیا کہ کیا وہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال ہے، تو آپ نے فرمایا کہ نہیں تا آنکہ یہ دوسرا شوہر اس سے لطف اندوز نہ ہولے۔

اس عورت کو پہلے شوہر نے تین طلاق مجموعی یعنی ایک ہی مجلس میں دی تھی، چنانچہ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر اور علامہ عینی فرماتے ہیں:

فانه ظاهر كونها مجموعة يعني طلقها ثلاثاً، یعنی طلقها ثلاثاً جو حدیث میں وارد ہوا ہے تو اس کا ظاہر یہی ہے کہ اس آدمی نے ایک ساتھ تین طلاق دی تھی، اور اس کے ظاہری مفہوم سے علماء نے استدلال کیا ہے.....ایک بات یاد رکھئے کہ غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ معلوم نہیں اس آدمی نے تین طلاق کیسے دی تھی، الگ الگ دی

تھی یا ایک مجلس میں دی تھی ، تو یہ محض ایک باطل گمان ہے ، شراح حدیث نے بتلایا کہ اس کا ظاہر مطلب یہی ہے کہ اکٹھی تین طلاق دی گئی تھی ، اور جو لوگ ظاہر نص سے استدلال کرتے ہیں ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ تم یہ ثابت کرو کہ یہ تین طلاق الگ الگ نہیں دی گئی تھی ، ہاں یہ مطالبہ ان سے کیا جائے گا جو خلافِ ظاہر یہ کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ تین طلاق الگ مجلسوں میں دی گئی ہو ، وہ اپنے اس ''ہوسکتا'' کو دلیل سے ثابت کریں ۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے'' باب من جوّز الطلاق الثلاث ''اور بعض نسخوں میں میں'' باب من اجاز الطلاق الثلاث '' ہے ، پہلی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اس باب میں اس کا بیان ہے کہ تین اکٹھی طلاق کا دینا جائز ہے ، اور دوسری عبارت کا مطلب یہ ہے کہ تین طلاق اکٹھی نافذ العمل ہے ۔

(۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں اپنی بیوی کو تین طلاق دیتا تو کیا میرے لئے اس سے رجوع کرنا جائز ہوتا ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں وہ تجھ سے جدا ہو جاتی اور تیرا یہ عمل گناہ ہوتا ۔

اس روایت کو متعدد محدثین نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے ، مثلاً یہ روایت سنن بیہقی میں ہے ، اور دار قطنی میں ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے ۔

یہ روایت بھی مسئلہ زیر بحث میں بالکل واضح ہے ، اور اس میں صاف یہ بھی مذکور ہے کہ آنحضور ﷺ نے اس عمل کو گناہ قرار دیتے ہوئے طلاق کو نافذ قرار دیا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی عمل کا گناہ ہونا اور بات ہے اور اس کے حکم کا مرتب ہونا اور بات ہے ، یعنی کسی عمل کے گناہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عمل ہی باطل ہو ، مثلاً اگر روزہ دار روزہ کی حالت میں گالی گلوج کرے ، غیبت کرے تو یہ گناہ تو ہے مگر اس سے اس کے روزہ کا بطلان لازم نہیں آتا ۔

غیر مقلدین کہتے ہیں کہ چونکہ تین طلاق اکٹھی دینا گناہ کا کام ہے ، اس وجہ سے اس کا طلاق دینا باطل ہوگا ۔ آنحضور ﷺ تو گناہ بتلاتے ہوئے تین طلاق دینے کو لازم

قرار دیں اور غیر مقلدین حضور ﷺ کے فرمان کے خلاف یہ کہیں کہ طلاق لازم نہیں ہوگی۔

اور ان کی دوسری بات جو حد درجہ مضحکہ خیز ہے وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں ایک طلاق پڑے گی۔

سوال یہ ہے کہ جب گناہ ہونے کی وجہ سے تین طلاق نہیں پڑ سکتی تو ایک طلاق کیوں پڑے گی؟ غیر مقلدین عموماً اس طرح کی خلافِ عقل اور مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں۔

دارقطنی وغیرہ کی یہ روایت بہت واضح ہے کہ تین طلاق پڑ جائے گی تو غیر مقلدین نے اس روایت کو رد کرنے کا ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا کہ دارقطنی کی روایت جس سند سے ہے اس میں ایک راوی عطا خراسانی ہیں، اور وہ مجروح ہیں اس وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے، اس لئے اس کا اعتبار نہیں۔

تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آپ کے یہاں ضعیف روایت کا اعتبار نہ ہوتا ہوگا مگر جمہور محدثین ضعیف حدیث کا اعتبار کرتے تو آپ آنحضور ﷺ کے اس ارشاد پاک کو رد کر کے اپنی جگہ خوش رہئے مگر جن کا مذہب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث بھی قابلِ استدلال ہوتی ہے ان سے آپ مت جھگڑیئے، ان کو بھی خوش رہنے کا موقع دیجئے۔(۱)

---

(۱) غیر مقلدین ابن تیمیہ کے مداح اور ان کے قائل ہیں، طلاق مسئلہ میں وہ ابن تیمیہ ہی کے خوشہ چیں ہیں، وہ ابن تیمیہ بھی اپنی کتابوں مں اہم مسائل میں ضعیف حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ ابن تیمیہ کا ایک رسالہ ''الوصیۃ الکبریٰ'' کے نام سے ہے، جس میں دین کی بنیادی باتوں کا ذکر ہے۔ اس میں ابن تیمیہ نے یہ حدیث ذکر کی ہے: **من قرأ القرآن فاعربه فله بكل حرفٍ حسنات** یعنی جس نے قرآن کو اعراب کے ساتھ پڑھا تو اس کے لئے ہر حروف کے بدلہ میں دس نیکیاں ہیں، اس رسالہ کا محقق محمد بن الحمود لکھتا ہے: **ضعيف جداً** یعنی بہت زیادہ ضعیف ہے۔ دیکھئے ابن تیمیہ نے جو حدیث ذکر کی ہے وہ صرف ضعیف نہیں ہے بلکہ بہت زیادہ ضعیف ہے، اس سند میں ایک راوی نہش نامی ہے جو متروک ہے، امام بخاری کے استاذ ابن راہویہ اس کو جھوٹا قرار دیتے ہیں، مگر ابن تیمیہ اس حدیث کو نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ اس کو دلیل بناتے ہیں۔

پھر یہ ضعیف حدیث تو بخاری و مسلم کی صحیح روایت کے عین مطابق ہے تو اس کا اعتبار کیوں نہ ہوگا، اگر کوئی حدیث ضعیف ہی ہو مگر اس کی تائید صحیح حدیث سے ہو رہی ہو تو اس کا اعتبار سارے محدثین کے یہاں ہوتا ہے، آپ کیسے اہلحدیث ہیں کہ محدثین کی چال سے الگ الٹی چال چلتے ہیں اور اپنا نام پھر بھی اہلحدیث ہی رکھیں گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس کا ضعیف ہونا امام مالک کو معلوم نہیں ہوا، امام شافعی کو معلوم نہیں ہوا، امام احمد کو معلوم نہیں ہوا، امام ابوحنیفہ کو معلوم نہیں ہوا، اور ان تمام سلف وخلف کو معلوم نہیں ہوا جن کا مذہب یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق تین ہی ہوتی ہے۔

اور نہ ان حضرات کو یہ معلوم ہوا کہ تین طلاق دینا گناہ ہے، اور اس گناہ کی وجہ سے تین طلاق نہیں صرف ایک طلاق پڑے گی۔ یہ بات صرف غیر مقلدوں کو اور ابن قیم اور ان کے امام ابن تیمیہ ہی کو معلوم ہوئی۔

بہر حال چاہے غیر مقلدین اس حدیث کا انکار کریں، مگر جمہور امت نے اس کا اعتبار کیا ہے۔

(۳) تیسری حدیث وہ ہے جس کو امام شافعی ابوداؤد و ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم دارقطنی وغیرہ نے حضرت رکانہ سے روایت کیا ہے، روایت کا ترجمہ یہ ہے:

حضرت رکانہ نے اپنی بی بی کو لفظ بتۃ سے طلاق دی، اس کے بعد وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی بابت سوال کیا تو حضور نے پوچھا اس سے تمہاری نیت کیا تھی؟

تو انھوں نے کہا کہ میں نے ایک طلاق کا ارداہ کیا تھا تو آپ نے قسم دے کر پوچھا تو انھوں نے اللہ کا نام لے کر کہا کہ میرا ارادہ ایک ہی کا تھا، تو آپ ﷺ نے کہا تو پھر ایک طلاق ہوگی جیسا کہ تیرا ارادہ تھا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت رکانہ سے تین بار قسم لی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک دفعہ کی تین طلاق واقع ہو جاتی ہے، ورنہ آپ کو قسم لینے کی کیا ضرورت تھی، یہ حدیث بھی محدثین کی تصریح کے مطابق صحیح ہے۔

لفظ البتہ کنائی لفظ ہے، اور طلاق کنائی میں جیسا متکلم کا ارادہ ہوتا ہے وہی مراد بھی ہوتی ہے، اگر اس نے ایک کا ارادہ کیا ہے تو ایک اور اگر تین کا ارادہ کیا ہے تو تین۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

وقد اختلف اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ وغیرهم فی طلاق البتة فروی عن عمر بن الخطاب انه جعل البتة واحدة وروی عن علی انه جعلها ثلاثاً وقال بعض اهل العلم فیه نیة الرجل ان نوی واحدة فواحدة وان نوی ثلاثاً فثلاث وان نوی ثنتین لم تکن إلا واحدة وهو قول الثوری واهل اکوفة وقال مالک ابن انس فی البتة ان کا قد دخل بها فهی ثلاث تطلیقات وقال الشافعی ان نویٰ واحدة فهو واحدة وان نویٰ ثنتین فثنتین وان نوی ثلاثا فثلاث۔

یعنی اہل علم اصحاب نبی ﷺ کا اور ان کے علاوہ کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جس نے طلاق البتہ دی تو کتنی طلاق پڑے گی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ ایک طلاق واقع ہوگی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ تین طلاق پڑے گی، اور بعض اہل علم نے فرمایا کہ ہے کہ اگر طلاق دینے والے نے ایک کی نیت کی ہے تو ایک پڑے گی اور اگر تین کی نیت کی ہے تو تین واقع ہوگی، اور دو کی نیت کی ہے تب بھی ایک ہی واقع ہوگی، اور یہی مذہب امام ثوری اور تمام اہل کوفہ کا ہے، اور امام مالک کا قول ہے کہ اگر عورت مدخول بہا ہے پس تین طلاق واقع ہوگی، اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر ایک کی نیت کی ہے تو ایک، دو کی نیت کی ہے تو دو، تین کی نیت کی ہے تو تین طلاقیں واقع ہوں گی۔

حضرت رکانہ کی یہ حدیث صریح ہے، اگر انھوں نے تین کی نیت کی ہوتی تو اکٹھی تین طلاق واقع ہو جاتی اور یہی جمہور اہل علم کا مذہب ہے کہ کسی نے اپنی بیوی کو اکٹھی یا الگ الگ تین دفعہ تجھ کو طلاق ہے کہہ کر تین طلاقیں ایک مجلس میں دی تو تینوں واقع ہو جائیں گی، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضور ﷺ حضرت رکانہ کی نیت کے بارے میں حلفیہ

بیان نہ لیتے۔

اب اگر غیر مقلدین اس حدیث کا انکار کریں اور نہ مانیں تو وہ جانیں، اس مسئلہ میں جمہور اہل اسلام کے خلاف تو ہیں ہی، اب بات بناتے کے لئے حدیث ضعیف ہے، کمزور ہے، ہم نہیں مانیں گے کی وہ رٹ لگائے رہتے ہیں، چلو تسلیم کہ حدیث ضعیف ہے مگر کیا ہر ضعیف حدیث نا قابل استدلال ہوتی ہے، خوب یاد رکھئے کہ جس حدیث پر جمہور اہل اسلام کا عمل ہو یا دورِ اول میں یعنی صحابہ و تابعین کے دور میں اس کا اعتبار کیا گیا ہو اس کا سنداً ضعیف ہونا قطعاً قابل توجہ نہیں ہے، مثلاً دیکھئے کہ وضو میں بسم اللہ پڑھنے والی حدیث ضعیف ہے، لیکن پوری امت وضو میں بسم اللہ پڑھنے کو مسنون قرار دیتی ہے، اور غیر مقلدین تو وضو میں بسم اللہ پڑھنے کو فرض اور رُکن بتلاتے ہیں، اسی طرح اور بھی بہترے مسائل میں حدیث ضعیف ہے مگر عملاً قوی ہے اور اس پر بلا نکیر محدثین وفقہاء کا عمل ہے۔(۲)

(۴) دار قطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ إذا طلق الرجل امرأته ثلاثاً فلاتحل له حتیٰ تنکح زوجاً غیره ویذوق کل واحد منهما عسیلة الآخر۔

یعنی جب شوہر اپنی بیوی کو تین طلاق دے تو وہ اس کے لئے حلال باقی نہیں رہتی ہے بلا دوسرے شوہر سے نکاح کئے اور اس کے ساتھ صحبتِ صحیحہ کئے ہوئے، اپنے پہلے شوہر کے نکاح میں دوبارہ نہیں آسکتی۔

یہ حدیث بھی اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے، اور جمہور اہل اسلام کی دلیل ہے مگر چونکہ اس حدیث سے غیر مقلدین کا مذہب باطل قرار پاتا ہے اس وجہ سے غیر مقلدین کو یہ حدیث بھی ضعیف ہی نظر آتی ہے۔

(۵) پانچویں حدیث بھی دار قطنی کی ہے، اس میں ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ

---

(۲) اس کی تفصیل کے لئے میرا رسالہ ''غیر مقلدین کا حدیث کے بارے میں معیار ردو قبول'' اور میری کتاب ''غیر مقلدین کے لئے لمحۂ فکریہ'' دیکھو۔

نے اپنی بیوی عائشہ خثعمیہ کو اس لفظ سے طلاق دی إذهبی فـانـت طالق ثلاثاً یعنی تو چلی جا تجھ کو تین طلاق ہے۔ عائشہ چلی گئیں، بعد میں حضرت حسن کو معلوم ہوا کہ عائشہ اس طلاق سے بہت رنجیدہ ہیں تو ان کی آنکھ سے آنسو نکل آیا اور فرمایا کہ اگر میں اپنے والد سے نہ سنا ہوتا کہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد تھا کہ جو شخص اپنی بیوی کو تین مبہم (یعنی بیک لفظ) یا تین طہروں میں تین طلاق دے تو جب تک وہ عورت دوسرے سے نکاح نہ کرلے پہلے کے لئے حلال نہیں ہوسکتی، اگر میں نے نانا جان کی یہ بات نہ سنی ہوتی تو میں عائشہ سے رجعت کرلیتا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ تو یہ فرمائیں کہ اکٹھی تین طلاق دینے سے حضور کے فرمان کے مطابق طلاق واقع ہوجاتی ہے، لیکن غیر مقلدین یہ کہیں کہ واقع نہیں ہوتی ہے، جمہور امت کو حضور ﷺ کے اس ارشاد پاک کے رد کردینے کی جرأت نہ ہوئی مگر غیر مقلدین کو اس کی جرأت ہوئی، اس وجہ سے کہ وہ اس میدان کے بڑے شہسوار ہیں اور احادیثِ رسول کا رد کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

(۶) دارقطنی میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص بدعی طریقہ پر طلاق دے گا چاہے ایک دے چاہے دو یا تین دے ہم اس کو لازم کردیں گے، یعنی ان تمام صورتوں میں طلاق واقع ہوجائے گی۔

دیکھئے جس عمل کو حضور ﷺ لازم اور نافذ کررہے ہیں غیر مقلدین اس کو حضور کے حکم کے خلاف باطل قرار دے رہے ہیں، اور نہیں مانیں گے نہیں مانیں گے کی رٹ لگائے جارہے ہیں۔

(۷) ساتویں حدیث دارقطنی اور مصنف عبد الرزاق وغیرہ میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دے ڈالی، اس کے لڑکوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں آکر یہ واقعہ بیان کیا تو آپ کا ارشاد تھا کہ اگر تمہارا باپ اللہ سے ڈرتا تو اس کے لئے اللہ کوئی راستہ نکالتا، اب تو تمہاری ماں تمہارے باپ کے نکاح سے تین طلاق کی وجہ سے نکل گئی، اور بقیہ کا گناہ اس کے سر پڑا۔

یہ حدیث بھی مسئلہ زیر بحث میں واضح ہے، کہ تین طلاق سے تینوں طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔

(۸) آٹھویں حدیث اس بارے میں یہ ہے:

عن عامر الشعبی قال قلت لفاطمة بنت قیس حدثینی عن طلاقک قالت طلقنی زوجی ثلاثاً وهو خارج الی الیمن فاجاز ذالک رسول الله ﷺ۔

یعنی شعبی کہتے ہیں کہ میں نے فاطمہ بنت قیس سے کہا کہ مجھ سے اپنی طلاق کا قصہ بیان کیجئے، انھوں نے کہا کہ میرے شوہر یمن کے سفر پر جب تھے تو انھوں نے مجھ کو تین طلاقیں دیں، تو حضور ﷺ نے ان تینوں کے نافذ ہونے کا فتویٰ دیا۔

یہ حدیث بھی اپنے مدلول کے لحاظ سے بالکل واضح ہے، اور محدثین نے اس سے ایک مجلس میں تین طلاق کے واقع ہونے پر استدلال کیا ہے۔

ابن ماجہ میں یہ حدیث مذکور ہے، اور انھوں نے اس حدیث پر جو باب قائم کیا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے **باب من طلق ثلاثاً فی مجلس واحد** یعنی اس کا بیان کہ جس نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس حدیث میں اس کا بیان ہے ایک مجلس کی تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔(۳)

چونکہ یہ ساری احادیث غیر مقلدین کے مذہب کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کا سارا زور ان احادیث کے ضعیف ثابت کرنے پر خرچ ہوتا ہے، خواہ اس کے لئے انصاف و دیانت کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

مثلاً دیکھئے کہ محدثین کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر ضعیف احادیث متعدد ہوں تو ان سب کے ملنے اور ایک دوسرے کی تائید سے وہ حدیث قابل احتجاج ہو جاتی ہے، اور

---

(۳) ان تمام احادیث کو مولانا اعظمی علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ الاعلام میں ذکر کیا ہے، اور بتلایا ہے کہ ان میں بعض حدیثیں صحیح ہیں اور بعض احادیث حسن سے کم نہیں ہیں۔

اس کا سند کے اعتبار سے یا متن کے اعتبار سے جو ضعف ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے، اس بات کو عام محدثین کے علاوہ غیر مقلدین کے اکابر اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں، مثلاً وضو میں بسم اللہ والی حدیث کے بارے میں امام ترمذی فرماتے ہیں: **لا اعلم فی ھذا الباب حدیثاً لہ اسناد جید** یعنی میرے علم میں اس سلسلہ کی کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس کی سند عمدہ ہو، اور بزور فرماتے ہیں: **کل ماروی فی ھذا الباب فلیس بقوی** یعنی اس باب میں جو حدیث بھی روایت کی گئی ہے وہ قوی نہیں ہے (یعنی ضعیف ہے) اور حافظ منذری فرماتے ہیں: **وفی الباب احادیث کثیرۃ لایسلم شئ منھا عن مقال**، یعنی اس باب کی بہت سی روایتیں ہیں مگر کوئی بھی حدیث ثابت نہیں ہے، امام احمد فرماتے ہیں کہ **لیس فیہ مایثبت** یعنی اس بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔ مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری نے ترمذی کی شرح میں اس سلسلہ کی جتنی روایات ان کو مل سکیں سب کو ذکر کیا ہے اور سب کو ضعیف بتلایا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا فیصلہ یہ ہے، فرماتے ہیں:

قلت لاشک فی ان ھذا الحدیث نص علی ان التسمیۃ رکن للوضوء اوشرط یعنی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حدیث اس بارے میں نص ہے اور صریح ہے کہ وضو میں بسم اللہ پڑھنا رکن یا شرط ہے۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں **قلت احادیث ھذاالباب کثیرۃ یشد بعضھا بعضا بمجموعھا یدل علیٰ ان لھا اصلاً**، یعنی میں کہتا ہوں کہ اس باب کی بہت سی حدیثیں ہیں جن سے ایک دوسرے کی تائید ہوتی ہے، پس ان سے معلوم ہوا کہ اس حدیث کی کوئی نہ کوئی اصل ہے۔ (تحفۃ، ج:۱،ص:۳۹۰)

اور امام منذری سے نقل کرتے ہیں:

لاشک ان الاحادیث التی وردت فیھا وان کان لایسلم شئ منھا عن مقال فانھا تتعاضد بکثرۃ طرقھا وتکتسب قوۃ۔

یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ وضو میں بسم اللہ پڑھنے کے سلسلہ میں ایک

حدیث بھی جرح سے خالی نہیں ہے، لیکن کثرت طرق کی وجہ سے اس میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

غیر مقلدین سے ہر شخص کو یہ پوچھنے کا حق ہے کہ جب بسم اللہ والی حدیث آپ کے عالم مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری کے بقول اور محدث امام منذری کے بقول متعدد ہونے کی وجہ سے اور کثرت طرق کی وجہ سے قوی بن جاتی ہے اور اس سے استدلال کرنا صحیح ہو سکتا ہے، اور اس سے وضو میں بسم اللہ کی رکنیت ثابت کی جاسکتی ہے، تو طلاقِ ثلاثہ والی حدیثیں اگر بفرض محال ان سب کو ضعیف بھی مان لیا جائے تو وہ کیوں نہیں ایک دوسرے نے مل کر قوی ہو سکتی ہیں اور ان سے کیوں نہیں استدلال کیا جاسکتا ہے، جبکہ ان احادیث کی قوت اور بھی اس اعتبار سے بڑھ جاتی ہے کہ عام طور پر فقہاء و محدثین اور ائمہ اربعہ کا یہی مذہب ہے، چند شاذ لوگوں کو چھوڑ کر پوری امت اسی کی قائل ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

آپ نے اسی ایک مثال سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ غیر مقلدین اپنی راگ کے آگے کسی بھی سننے والے نہیں ہیں اور خود ان کے اکابر جو اصول مقرر کرتے ہیں جب کوئی بات ان کے مذہب کے خلاف ہوتی ہے تو اس کی بھی دھجیاں اڑا دیتے ہیں اور اس کی پرواہ نہیں کرتے، ایسے انصاف پسند اہلحدیث ہیں یہ لوگ۔

خیر یہ تو چند احادیث کا ذکر تھا، اور اب اس بارے میں صحابہ کرام کے کچھ آثار بھی ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اثر بخاری و مسلم میں ہے کہ:

جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے میں سوال کیا جاتا جو اپنی بیوی کو تین طلاق دیتا تو آپ فرماتے کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو ایک مرتبہ یا دو مرتبہ طلاق دے تو اس کا تو مجھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، لیکن اگر تم اس کو تین مرتبہ طلاق دو گے تو وہ بیوی تمہارے اوپر حرام ہو جائے گی تا آنکہ وہ تیرے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے۔

بخاری مسلم کے علاوہ یہ روایت احادیث کی دوسری کتابوں میں بھی مذکور ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر:

مؤطا امام مالک میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دی ہیں (تو اب بارے میں آپ کا فتویٰ کیا ہے؟) لوگ تو کہتے ہیں کہ میری بیوی مجھ سے جدا ہوگئی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ جو کہتے ہیں وہ درست کہتے ہیں تیری بیوی تجھ سے جدا ہوگئی، شریعت کا یہی حکم ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا اثر:

مؤطا امام مالک اور احادیث کی دوسری کتابوں میں بھی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے ڈالیں، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تین طلاقوں سے اس کی بیوی اس پر حرام ہوجائے گی، اور باقی طلاقوں کا گناہ اس پر ہوگا جن کے ذریعہ اس نے اللہ کی آیتوں کا ٹھٹھا کیا ہے (۴)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا اثر:

مؤطا و شرح معانی الآثار میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ کوئی اگر اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے تین طلاقیں دیدے تو کیا حکم ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ عورت ایک طلاق سے بائن ہوجائے گی اور تین سے ایسی ہوجائے گی کہ جب تک دوسرا نکاح نہ کرے گی پہلے کے لئے حلال نہ ہوگی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا اثر:

شرح معانی الآثار میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جو شخص غیر مدخولہ عورت کو تین طلاق دیدے تو وہ اس کیلئے حلال نہیں ہوسکتی جب تک وہ دوسرا نکاح نہ کرلے۔

---

(۴) یعنی تین طلاقیں تو حکم خداوندی کے مطابق ہیں کہ اس کا حکم قرآن میں مذکور ہے، باقی جو بلاوجہ اس نے طلاقیں دی ہیں وہ آیات قرآنیہ کے ساتھ گویا مذاق کرنا ہوا، اور اس کا گناہ اس کے سر پر ہوگا۔

دار قطنی میں بھی ایک اثر فاروق اعظم کا ہے جس سے مدخولہ وغیرہ مدخولہ کا حکم یکساں ثابت ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اثر:

طحاوی شریف میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ یہ فتویٰ دیتے تھے کہ تین طلاق دی جانے والی عورت جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرلے وہ پہلے کے لئے حلال نہ ہوگی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اثر:

مؤطا اور طحاوی میں ہے ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے تین طلاقیں دے دی تو حضرت ابوہریرہ نے کہا کہ یہ ایک طلاق سے بائنہ ہوجائے گی، اور تین طلاق سے اپنے شوہر پر ایسی حرام ہوجائے گی کہ جب تک دوسرا نکاح نہ کرلے پہلے کے لئے حلال نہیں ہوسکتی۔ (مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ''الاعلام المرفوعہ'' دیکھو)

یہ چند صحابہ کرام کے فتوے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی متعدد صحابہ کرام سے اسی قسم کے فتاویٰ منقول ہیں، یہ تمام فتاویٰ ان احادیث کے مطابق ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اس طرح اگر بقول غیر مقلدین وہ ساری احادیث ضعیف بھی ہوں جیسا کہ غیر مقلدوں کا دعویٰ ہے تو یہ فتاویٰ ان احادیث کی تائید کرتے ہیں، جن سے وہ احادیث صحت کے اعلیٰ درجہ کو پہونچ جاتی ہیں۔

طلاق کا مسئلہ شریعت کا اہم مسئلہ ہے، اگر حضور ﷺ کا یہی حکم نہ ہوتا کہ تین طلاق واقع ہوجاتی ہے اور بلا دوسرے شوہر کے نکاح کے پہلے کے لئے وہ حلال نہں ہوسکتی ہے تو صحابہ کرام اس طرح کا فتویٰ نہ دیتے اور بیوی کو پہلے شوہر کے لئے حرام نہ قرار دیتے۔

اب غیر مقلدین اگر احادیث رسول ﷺ اور صحابہ کرام کے آثار کے برخلاف ایک مجلس کی تین طلاق کے تین نہ ہونے کا فتویٰ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تقلید میں دیں تو آپ یا ہم ان کے ساتھ زبردستی تو نہیں کرسکتے۔

غیر مقلدین کا بڑا مستدل حضرت ابن عباس کی وہ روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانہ سے لے کر حضرت عمر کے ابتدائی دورِ خلافت تک ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک ہی سمجھا جاتا تھا، یہ تو حضرت عمر نے سیاستہً شریعت میں تبدیلی فرمادی اور تین طلاق کے تین ہونے کا فتویٰ نافذ کیا اور کسی کو دبدبۂ فاروقی کی وجہ سے ان کے حکم کے خلاف لب ہلانے کی جرأت نہ ہوئی، آپ دیکھ رہے ہیں کہ خود ابن عباس کا یہی فتویٰ بھی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہوجاتی ہیں، اگر بات وہی ہوتی جو غیر مقلدین کہتے ہیں تو حضرت ابن عباس اپنی روایت کے خلاف فتویٰ نہ دیتے اور یہ بات کہ حضرت عمر نے سیاستہً شریعت کا حکم بدل ڈالا، تو یہ بات صرف غیر مقلدین کہنے کی جرأت رکھتے ہیں، کوئی ایمان والا اس طرح کی بات نہیں کرسکتا۔

وقوعِ طلاقِ ثلاث پر صحابہ کرام کا اجماع

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے اگر کسی حدیث سے یہ ثابت بھی ہو کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی قرار دی جاتی تھیں تو حضرت عمر کے زمانہ میں تو تین طلاق کے تین واقع ہونے پر اجماع صحابہ ہو چکا تھا، اور تمام امت نے اس اجماع کو تسلیم کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد سے لے کر آج تک جمہور کا یہی مذہب رہا ہے، طحاوی شریف میں ہے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے مجمع میں اس کا اعلان کیا تو لم ینکرہ احد یعنی نہ صحابہ کرام میں سے کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کا انکار کیا اور نہ کسی نے ان کے ارشاد کو رد کیا۔ اور فتح الباری میں ہے کہ:

فالراجح فی الموضعین تحریم المتعة وایقاع الثلاث للاجماع الذی انعقد فی عهد عمر علیٰ ذٰلک ولم یحفظ أن أحداً فی عهده خالفه فی واحدة منهما۔

یعنی راجح بات متعہ کے حرام ہونے اور تین طلاق کے واقع ہونے میں یہی ہے کہ تین طلاقیں پڑ جائیں گی اور متعہ حرام ہے۔ اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ

میں اس پر صحابہ کرام کا اجماع منعقد ہو چکا ہے، اور یہ بات کسی سے منقول نہیں ہے، کہ ایک صحابی نے بھی ان دونوں باتوں سے کسی ایک میں بھی ان کی مخالفت کی ہو۔

اور یہ بات یاد رکھئے کہ اگر حکم فاروقی کتاب وسنت کے خلاف ہوتا تو یہ محال تھا کہ صحابہ کرام ان کی بات کے آگے سر تسلیم خم کرتے، صحابی کرام کے بارے میں اس کا تصور بھی محال ہے۔ یہ تو غیر مقلدین کی ہمت وجرأت ہے جو صحابہ کرام کے بارے میں اس طرح کا باطل خیال رکھتے ہیں، اور اس طرح وہ صحابہ کرام کی عظمت کو مجروح کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

غیر مقلدین کی جرأت وہمت پر داد دینی ہوتی ہے کہ وہ صحابہ کرام کے بارے مین جب گفتگو کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی عقل اور اپنے ایمان دونوں کو کنارے رکھ دیتے ہیں، مثلاً ایک صاحب جنھوں نے اعلام مرفوعہ کا جواب لکھا ہے، وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کے بارے میں فرماتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود نے جو حکم دیا وہ خفگی اور تہدید کا حکم ہے۔

(الآثار المتبوعہ، ص:۱۱۲)

یعنی ان غیر مقلد صاحب کے نزدیک حضرت عبداللہ بن مسعود نے غصہ میں خلافِ حکم شریعت فتویٰ دیا تھا، ہے کسی ایمان والے کا ایسا ایمان جو اس بات کو گوارا کرے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ غصہ اور تہدید کی وجہ سے شریعت کے خلاف فتویٰ دیں گے۔

اور یہی صاحب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کو سیاسی حکم قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں اور بڑے طنطنہ سے فرماتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اس مسئلہ کو نافذ فرمایا .....وہ شرعی نہیں بلکہ ایک سیاسی حکم ہے۔ (ص:۱۱۵ ایضاً)

ماشاء اللہ کیا تحقیق ہے، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیاست کی خاطر حکم شریعت کو بدل ڈالا، اور کمال یہ ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی کے دور میں اور پھر حضرت معاویہ کے دور میں اور ائمہ کرام اور فقہائے اسلام کے دور میں حضرت عمر ہی کے زمانہ

کئے حالات باقی رہے، کسی کو غیر مقلدوں والی عقل نہ آئی کہ جو حکم حضرت عمر نے سیاست کی بنا پر دیا تھا وہ اس کو اصل شریعت کی طرف لوٹائیں، اور اپنے زمانہ میں تین طلاق کے ایک ہونے کا فتویٰ دیں، شریعت کے اصل پاسبان تو یہ غیر مقلدین تیرہویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں اور ان میں جو عمل بالشریعہ کا جذبہ کار فرما ہے اس سے امت کے جمہور خالی تھے، حتیٰ کہ صحابہ کرام تک میں بھی یہ جذبہ معاذ اللہ نہ تھا۔

امید ہے کہ یہ مختصر سی تحریر آپ کے لئے اس مسئلہ میں حق معلوم کرنے کے لئے کافی ہوگی، اگر موقع ملے تو الاعلام المرفوعہ جو اس موضوع پر بہت محقق رسالہ ہے ضرور دیکھ لیں، اور حضرت اعظمیؒ کی کتاب الازھار المربوعہ بھی کہیں مل جائے تو اس کا مطالعہ مزید بصیرت کا باعث ہوگا۔ والسلام

محمد ابوبکر غازی پوری

☆☆☆☆☆

وضو میں گردن پر مسح کے بارے میں

مکرمی حضرت مولانا غازی پوری صاحب دام مجدہ

سلام مسنون!

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

زمزم میں سوالات وجوابات کا جو سلسلہ ہے وہ بہت مفید ہے، یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے سوالات کے جوابات کا جو سلیقہ آپ کو دیا ہے، وہ ''تا نہ بخشد خدائے بخشندہ'' والی سعادت ہے۔

محترم! وضو میں گردن پر مسح کے بارے میں اپنی معلومات سے مستفید فرمائیں، ایک سلفی دوست اس کا بڑی شدت سے انکار کرتے ہیں۔

والسلام

رئیس احمد جوگیشوری ممبئی

زمزم! وضو میں گردن پر مسح کے بارے میں میرا ایک مضمون جواب کی شکل میں شائع ہو چکا ہے، اور جو میری کتاب ارمغان حق میں آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

جو سلفی صاحب اس کا شدت سے انکار کرتے ہیں وہ خاطی ہیں اور ان کا حدیث کا مطالعہ کمزور ہے، وہ اپنے علماء کی کتابوں سے بھی ناواقف ہیں، اور کبارِ محدثین کا اس بارے میں نقطۂ نظر کیا ہے، اس کا بھی ان کو علم نہیں ہے۔

غیر مقلدین علماء میں علامہ شوکانی اور نواب صدیق حسن خاں صاحب کا بہت بلند مقام ہے، یہ دونوں حضرات گردن پر مسح کے قائل ہیں، محدثین میں سے امام بغوی جو کبار ائمہ حدیث میں سے ہیں وہ بھی گردن پر مسح کو مستحب قرار دیتے ہیں، محدث ابن

سیّد الناس بھی گردن پر مسح کے قائل ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود بخاری شریف کی حدیث سے گردن پر مسح ثابت ہے، تو گردن پر مسح کا انکار کیسے درست ہوگا؟ احناف تو گردن پر مسح کو مستحب کہتے ہیں مگر شوافع میں سے تو بعض حضرات تو اس کو سنت بتلاتے ہیں۔

آپ بتلائیے کہ ہم آج کے سلفی حضرات کی بات سنیں جن کا علمی سرمایہ شیخ البانی کی تحقیقات ہیں یا مذکورہ بزرگوں کی سنیں جن کا علمی پایہ اہل علم میں مسلّم ہے۔

میں نے عرض کیا کہ گردن پر مسح تو بخاری شریف کی روایات سے ثابت ہے، شاید اس پر آپ چونکیں، مگر چونکنے کی ضرورت نہیں ہے، بخاری شریف کی روایت آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اسے ملاحظہ فرمائیں:

بخاری شریف **باب مسح الراس کله** میں عبداللہ بن یوسف سے امام بخاری نقل کرتے ہیں، اور وہ امام مالک سے اور وہ عمر ابن یحییٰ المازنی سے، اور وہ اپنے باپ سے کہ ایک شخص نے عبداللہ بن زید (صحابی رسول ﷺ) سے فرمایا کہ کیا آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کیسے وضو کرتے تھے دکھلا سکتے ہیں، تو انھوں نے کہا کہ ہاں، میں دکھلا سکتا ہوں، پھر انھوں نے وضو کر کے اس سائل کو آپ ﷺ کا وضو دکھلایا، تو سر پر مسح کی جو کیفیت اس حدیثِ پاک میں ہے اس کو راوی نے ان الفاظ سے بیان کیا ہے۔

ثم مسح راسه بیدیه فاقبل بهما وادبر، بدأ بمقدم راسه حتیٰ ذهب بهما الیٰ قفاه ثم ردهما الی المکان الذی بدأ منه۔

یعنی پھر انھوں نے سر کا دونوں ہاتھ سے مسح کیا، شروع سر سے ابتدا کی اور دونوں ہاتھوں کو گردن کی گدی تک لے گئے، پھر اسی جگہ سے اپنے ہاتھوں کو وہاں واپس لائے جہاں سے مسح کی ابتدا کی تھی۔

اس روایت میں **قفاه** کا لفظ ہے، اور بعض روایات میں قذال کا لفظ ہے، قذال اور قفا کا معنی ایک ہی ہے یعنی سر کے پیچھے گردن کا حصہ جس کو اردو میں ہم ''گدی'' کہتے ہیں۔ اب آیئے ان تینوں لفظوں کی ہم لغوی تحقیق کریں۔ منجد میں ہے: **القفا**

مؤخر العنق یعنی قفا گردن کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں۔ القذال کے بارے میں لکھا ہے:
مابين الاذنين من مؤخر الراس یعنی قذال کہتے ہیں اس جگہ کو جو دونوں کانوں کے درمیان گردن کا پچھلا حصہ ہے، اسی کو ہم اردو میں گدی کہتے ہیں، گدی کے بارے میں فیروز اللغات میں لکھا ہے: سر کا پچھلا حصہ، گردن کا پچھلا حصہ۔

اب جب بخاری شریف کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے گردن کے پچھلے حصہ پر یا دونوں کانوں کے درمیان جو گردن کا حصہ ہے اس پر مسح کیا تو یہ کہنا کہ آپ ﷺ نے گردن کا مسح نہیں کیا ہے یا گردن کا مسح کسی حدیث سے ثابت نہیں، کس قدر غلط بات ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بعض شوافع علماء نے گردن کے مسح کو سنت بتلایا ہے۔

رویانی مشہور شافعی امام فقہ وحدیث ہیں، ان کی کتاب ''بحر'' ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں: قال اصحابنا هو سنة، یعنی ہمارے فقہا کا قول ہے کہ گردن پر مسح کرنا سنت ہے۔ شوافع میں سے امام بغوی مشہور محدث اور امام سنت ہیں، وہ گردن کا مسح مستحب بتلاتے ہیں، ابن الرفقہ سے شوکانی نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ امام بغوی گردن کے مسح کو مستحب کہتے ہیں، پھر ابن الرفقہ فرماتے ہیں: ولا مأخذ لاستحبابه الا خبر أو اثر لان هذا لا مجال للقياس فيه۔ یعنی امام بغوی نے گردن کے مسح کو جو مستحب بتلایا ہے تو اس کا ماخذ کوئی نہ کوئی حدیث یا اثر ہوگا، اس لئے کہ اس طرح کی بات رائے سے نہیں کہی جاسکتی۔

اور یہی بات حافظ ابن حجر بھی فرماتے ہیں، انھوں نے موسیٰ بن ابی طلحہ کی یہ حدیث اپنی کتاب تلخيص الحبير میں نقل کی ہے۔

حضرت موسیٰ بن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس نے اپنی گردن کی گدی کا مسح کیا وہ قیامت کے روز گردن میں طوق پہنائے جانے سے بچایا جائے گا۔

حافظ نے اس حدیث کو ذکر کرکے فرمایا ہے کہ اگرچہ یہ حدیث صحابی کا قول ہے مگر اس کا حکم مرفوع حدیث کا ہے، اس لئے کہ اس طرح کی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جاسکتی۔

جن لوگوں نے سر کے مسح کو بدعت قرار دیا ہے ان کا رد کرتے ہوئے علامہ شوکانی فرماتے ہیں: **وبجميع هذا تعلم ان قول النووى مسح الرقبة بدعة وان حديثه موضوع مجازفة**، یعنی ہماری ان تمام بحثوں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے گردن کے مسح کو بدعت اور اس کی حدیث کو جو موضوع بتلایا ہے وہ حق وصواب سے دور بات ہے۔ (نیل الاوطار، ج:۱،ص:۱۸۴)

حکیم صادق صاحب اپنی نماز کی کتاب "صلوۃ الرسول" میں لکھتے ہیں:

"اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ سر کا مسح کرتے وقت حضورؐ اپنے ہاتھوں کو گدی تک لے جاتے تھے اور گدی سر کا پچھلا حصہ ہوتا ہے جس میں کچھ گردن بھی آجاتی ہے" اور حوالہ دیا ہے مسلم شریف کا۔

سوال یہ ہے کہ جب سر کے مسح کے ساتھ گردن کا بھی کچھ حصہ حضور اکرم ﷺ کی حدیث پاک سے ثابت ہے تو گردن کے مسح کا مطلق انکار کرنا حکیم صاحب کی انتہائی جرأت کی بات ہے، حکیم صاحب کا اقرار وانکار ساتھ ساتھ چل رہا ہے، عموماً غیر مقلدین اسی طرح چلتے ہیں۔

علامہ شوکانی نے مسند احمد بن حنبلؒ سے گردن کے مسح کے سلسلہ کی یہ روایت نقل کی ہے: **عن ليث عن طلحة بن مصرف عن ابيه عن جده أنه رأى رسول الله ﷺ يمسح راسه حتىٰ بلغ القذال ومايليه من مقدم العنق۔**

یعنی لیث طلحہ بن مصرف اور طلحہ اپنے باپ اور ان کے باپ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اپنے سر کا مسح کیا، یہاں تک کہ آپ کا ہاتھ گردن کے پچھلے حصہ تک اور گردن سے ملے ہوئے حصہ تک پہونچا۔

اس حدیث کو ضعیف بتلایا گیا ہے، اس کے راوی لیث بن ابی سلیم پر لوگوں نے کلام کیا ہے، سوال یہ ہے کہ لیث قابل اعتبار ہے یا نہیں، اگر بالکل قابل اعتبار نہیں ہے تو امام مسلم جیسا امام اس کی حدیث اپنی کتاب میں کیوں لایا ہے؟ (دیکھو نیل الاوطار، ج:۱،ص:۱۸۵)

اس روایت کو لیث راوی کی وجہ سے مجروح قرار دینے کا مطلب ہے کہ امام مسلم کی ہروہ

روایت ضعیف ہے جس کی سند میں یہ راوی ہے، حالانکہ روایت میں وہی بات کہی گئی ہے جس کا ثبوت امام بخاری کی روایت سے ہورہا ہے، البتہ **و مایلیہ من مقدم العنق** کی اس میں زیادتی ہے، مگر یہ زیادتی بھی حسن درجہ کی ہے۔ نیل الاوطار میں ابن سیّد الناس سے نقل کیا گیا ہے: **وفیہ زیادۃ حسنۃ وھی مسح الرقبۃ** ،یعنی اس میں ایک زیادتی ہے وہ گردن کا مسح ہے، امام شوکانی فرماتے ہیں:

فانظر کیف صرح ھذا الحافظ بان ھذہ الزیادۃ المتضمنۃ لمسح العنق حسنۃ ۔یعنی دیکھو اس حافظ حدیث نے کیسی صراحت سے بیان کردیا کہ گردن پر مسح والی اس حدیث میں جو زیادتی ہے وہ حسن درجہ کی ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی انصاف پسند ہماری اب تک کی گفتگو سننے کے بعد گردن کے مسح کا انکار کرے گا۔

ایک بات اور یاد رکھیں کہ اگر ضعیف حدیث بالکل ہی نا قابل اعتبار ہوتی اور اس کا درجہ من گھڑت روایت کا ہوتا تو محدثین اور خصوصاً صحاح ستہ کے محدثین ضعیف روایتوں کو اپنی کتابوں میں ہرگز ذکر نہ کرتے، مگر بچہ بچہ جانتا ہے کہ حدیث کی دوسری کتابوں تو چھوڑیئے صحاح ستہ میں ضعیف احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، محدثین کا ان احادیث کا اپنی کتابوں میں ذکر کرنا یہی سب سے بڑا قرینہ ہے کہ ضعیف حدیثیں موضوع احادیث کے درجہ کی نہیں ہوتی ہیں کہ اس پر عمل کرنا اور اس سے حجت پکڑنا حرام ہو، ہاں اگر ان ضعیف حدیثوں کے مقابلہ میں گردن پر مسح نہ کرنے کے بارے میں حضور ﷺ کی کوئی صحیح حدیث منقول ہوتی تو اس ضعیف حدیث کے بارے میں کلام کی گنجائش ہوتی، **وإلا فلا**

☆☆☆☆☆

کیا مرد اور عورت کی نماز یکساں ہے؟

مکرمی حضرت مولانا ابوبکر صاحب غازی پوری مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے عافیت سے ہوں۔

زمزم کا مطالعہ مستقل چل رہا ہے اور غیر مقلدوں کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہورہا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے (آمین) گذارش یہ ہے کہ ہمارے یہاں غیر مقلدین بہت زور شور سے حدیث کا نام لے کر ناواقف عوام کو بہکا رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کی نماز میں کوئی فرق نہیں ہے، اور دلیل دیتے ہیں صلوا کمارأیتمونی اصلی کیا یہ صحیح ہے؟ براہ کرم حدیثِ رسول کی روشنی میں مرد اور عورت کی نماز کے بارے میں جو تحقیقی بات ہو اس سے ضرور آگاہ کریں۔

والسلام

محمد سرتاج ٹکرا بارہ بنکی

زمزم!

غیر مقلدین کی باتوں کو بہت سنجیدگی سے لینے کی ضرورت نہیں ہے، یہ وہ طبقہ ہے جس نے دین وشریعت کو تماشا بنا رکھا ہے، اللہ نے اس کو حق بات کہنے اور حق بات سننے کی توفیق سے محروم کر رکھا ہے۔ عوام اور ناواقف لوگوں کو دین کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کرنا اس طبقہ کا پسندیدہ مشغلہ ہے، ان کے جاہل بھی عالم بنے نظر آتے

سجدہ کرے گی۔ غیر مقلدین ہی ہیں کہ وہ اپنی عورتوں کا سرین (پچھلا نیچے کا حصہ) اٹھا کر سجدہ کراتے ہیں اور اس طرح وہ عامل بالحدیث بنتے ہیں۔ میں پوری دنیائے غیر مقلدیت کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ کسی ایک محدث، ایک فقیہ، ایک صحابی، ایک صحابیہ کا قول پیش کرے کہ عورت نماز میں اپنا سرین اٹھا کر سجدہ کرے گی۔ شاید غیر مقلدوں کو ابن حزم کا کوئی قول مل جائے مگر کسی صحابی یا صحابیہ کا قول ہرگز نہیں ملے گا جن کے گھر کی عورتیں آنحضور ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر نماز پڑھا کرتی تھیں۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عورت رکوع اور سجدہ میں اور تمام نماز میں سمٹ کر اور سکڑ کر رہے گی، رکوع کرے گی تو سکڑ کر، سجدہ کرے گی تو سکڑ کر یعنی بدن کے بعض حصہ کو بعض سے ملا کر، کیا آنحضور اکرم ﷺ کی نماز اسی طرح کی تھی؟

نسائی شریف میں حضرت عقبہ بن عمرو کی روایت ہے، انھوں نے بھی لوگوں سے کہا کہ کیا میں تم کو رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھ کر نہ دکھلاؤں، لوگوں نے کہا کہ ہمیں رسول اللہ کی نماز پڑھ کر دکھلائیے تو انھوں نے جو نماز پڑھی وہ یہ تھی کہ رکوع میں فجافی ابطیه یعنی جب رکوع کیا تو بغل کو خوب کھلا رکھا، اور سجدہ میں فجافی ابطیه یعنی جب سجدہ کیا تو سجدہ میں بھی بغل کو خوب کھلا رکھا۔

اب میں دنیائے غیر مقلدیت سے سوال کرتا ہوں کہ وہ کسی صحابی کا قول یا کسی صحابیہ کا عمل یا قول کسی حدیث کی کتاب سے پیش کرے، جس سے معلوم ہو کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں عورتیں رکوع اور سجدہ میں بغل کا حصہ کھول کر نماز پڑھا کرتی تھیں یا ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کا قول پیش کرے کہ اس کا یہ مذہب معلوم ہو کہ عورتیں رکوع اور سجدہ میں بغل کا حصہ کھول کر نماز پڑھیں گی، یا کسی محدث کا قول پیش کرے کہ عورتوں کی نماز کا یہی طریقہ ہے جو نسائی کی حدیث میں مذکور ہے، کیا کسی صحابی یا صحابیہ، یا کسی فقیہ، محدث کو صلوا کما رأیتمونی والی حدیث کا علم نہیں تھا، یہ حدیث آج کے غیر مقلدین ہی کے لئے نیا انکشاف ہے کہ اس کو لے کر فتنہ برپا کر رہے ہیں۔

نسائی ہی میں حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے انھوں نے بھی لوگوں کے

سامنے آنحضور ﷺ کی نماز پڑھ کر کے پیش کیا ہے، رکوع کی حالت کے بیان میں ہے:
وجافی بمرفقیه کہ جب رکوع میں وہ گئے تو اپنی کہنیوں کو اپنے بدن سے دور کر کے رکھا۔

اب غیر مقلدین کسی امام، کسی فقیہ، کسی محدث، کسی صحابی، کسی صحابیہ کا کوئی ایک قول نقل کریں جس سے یہ معلوم ہو کہ عورت اسی طرح کہنیوں کو اپنے بدن سے دور رکھے گی۔ امام شافعیؒ کا بیان آپ نے پڑھ لیا کہ رکوع اور سجدہ میں عورت سمٹ کر نماز پڑھے گی، امام شافعیؒ کے اس مذہب کو غیر مقلدین اپنے زور بازو سے دلائل کی روشنی میں غلط ثابت کر کے دکھلائیں، پھر امام شافعی اکیلے کیوں غیر مقلدین کو بڑے سخت سخت مراحل سے گذرنا پڑے گا۔ امام اہل سنت حضرت امام احمد کا بھی یہی مذہب ہے کہ عورت کی نماز مرد سے الگ ہے۔ مغنی ابن قدامہ حنبلی مذہب کی بڑی مشہور کتاب ہے، اس میں ہے:

ان المرأة تجمع نفسها فی الرکوع والسجود وتجلس متربعة اوتسدل رجلیها فتجعل فی جانب یمینها۔

یعنی عورت جب نماز پڑھے گی تو رکوع اور سجدہ میں اپنے آپ کو سمیٹے رہے گی اور چار زانو بیٹھے گی یا داہنی طرف اپنا دونوں پاؤں نکال کر بیٹھے گی۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **السدل اعجب الی** یعنی مجھے عورتوں کا دونوں پاؤں داہنے جانب نکال کر نماز پڑھنا زیادہ پسند ہے۔

آپ غیر مقلدین سے پوچھیں کہ حضرت امام احمد بن حنبل کو **صلوا کما رأیتمونی** والی حدیث معلوم تھی یا نہیں؟ اگر معلوم تھی اور یقیناً معلوم تھی تو پھر انھوں نے عورت کی نماز کا طریقہ مردوں سے الگ کیوں بیان کیا، کیا کسی غیر مقلد میں جرأت ہے کہ وہ امام احمد بن حنبل سے بڑا اپنے کو حدیث کا واقف کار اور حدیث پر عمل کرنے والا کہے؟

خیر امام شافعی اور امام احمد حنبل تو ذرا متاخر ہیں، لطف تو یہ ہے کہ امام دار الہجرۃ حضرت امام مالک **رحمۃ اللہ علیه** کا بھی یہی مذہب ہے۔ مالکی مذہب کی مشہور کتاب **اقرب المسالک الی مذهب الامام مالک** ہے، اس میں ہے کہ مرد کو حالتِ سجدہ میں اپنے پیٹ کو رانوں سے الگ رکھنا مطلوب ہے، اسی طرح کہنیوں، گھٹنوں،

بازؤں اور پہلو کو ایک دوسرے سے جدا رکھنا مطلوب ہے۔ پھر فرماتے ہیں: **واما المرأة فتکون منضمة فی جمیع احوالھا** ۔یعنی لیکن عورت اپنے تمام احوال میں سمٹ کر نماز پڑھے گی ۔ لگادیں غیر مقلدین امام مالک اور تمام مالکیہ پر فتویٰ کہ انھوں نے عورتوں کے لئے نماز کا طریقہ غلط بتا کر **صلوا کمار أیتمونی** والی حدیث کی مخالفت کی ہے ،مگر مصیبت یہ ہے کہ غیر مقلدین کس کس پر فتویٰ لگائیں گے ، ذرا اپنا گھر بھی جھانک کر دیکھیں ، کہ ان کے علماء کیا لکھتے ہیں ، مشہور غیر مقلد عالم نواب وحید الزماں حیدر آبادی اپنی مشہور کتاب نزل الابرار من فقہ النبی المختار میں لکھتے ہیں:

’’عورت بھی مرد کی طرح تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرے گی ،اور عورت کی نماز مرد کی طرح ہے تمام ارکان و آداب میں، البتہ عورت تحریمہ کے وقت اپنا ہاتھ اپنی چھاتی تک اٹھائے گی اور سجدہ میں مرد کی طرح پیٹ کو زمین سے اونچا نہیں رکھے گی بلکہ پست رکھے گی اور اپنے پیٹ کو دونوں رانوں سے چپکا لے گی ۔(ص:۸۵، ج:۱)

اور جو بات نواب صاحب فرماتے ہیں وہی بات غیر مقلدین کے رسالہ **تعلیم الصلوٰۃ** میں بھی ہے، یہ رسالہ غیر مقلدین نمائندہ اجتماع کا منظور شدہ ہے، اور خاص طور پر بچے اور بچیوں کے لئے تعلیم الاسلام کے طور پر اسے تحریر کیا گیا ہے۔

کیا آج کے یہ سلفی غیر مقلدین اپنے اکابر کو بھی جاہل اور خلافِ سنت عمل کرنے والا اور حدیث کا مخالف کہیں گے؟ ہے کسی غیر مقلد سلفی میں دم خم جو کہے کہ ہمارے اکابر **صلوا کمار أیتمونی اصلی** والی حدیث سے لاعلم تھے یا انھوں نے اس حدیث کے خلاف عورت کی نماز کا طریقہ اس رسالہ میں تحریر کیا ہے؟

عورت اور مرد کی نماز کا طریقہ بالکل ایک ہی جیسا ہے یہ بات وہی کہے گا جس کے دماغ میں گودا کی جگہ بھس ہوگا۔ اس لئے کہ سب کو معلوم ہے کہ آنحضور ﷺ کی ازار مبارک نصف ساق (آدھی پنڈلی) تک رہا کرتی تھی ، آپ ﷺ نے کبھی ٹخنہ کے نیچے ازار لٹکا کر نماز نہیں پڑھی ، اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کے لئے ٹخنوں سے نیچے ازار کرنا حرام ہے، تو کیا غیر مقلدین اب اپنی عورتوں کو بھی اسی کی تعلیم دیں

گے، اور صلوا کما رأیتمونی اصلی والی حدیث سنا کر اپنی عورتوں کو پنڈلی سے اوپر پاجامہ اور ساڑی پہنوا کر نماز پڑھوائیں گے؟ ذرا غیر مقلدین بتلائیں کہ ان کی عورتیں کس طرح نماز پڑھتی ہیں، کیا ان کا کپڑا نماز میں نصف ساق (آدھی پنڈلی) تک ہوا کرتا ہے اگر نہیں تو صلوا کما رأیتمونی اصلی والی حدیث پر عمل کرانے کیلئے زور باندھے ہوئے ہیں، ان کے گھر میں ان کی عورتیں کس طرح نماز پڑھتی ہیں اس کی ان کو فکر نہیں دوسروں کی فکر ہے۔

آنحضور ﷺ حج کے موقع پر کھلے سر نماز پڑھا کرتے تھے، اب غیر مقلدین اپنی عورتوں کو صلوا والی حدیث سنا کر حج میں کھلے سر نماز پڑھائیں تو ہم جانیں کہ صلوا کما رأیتمونی والی حدیث پر ان کا عمل ہے؟

آنحضور ﷺ نے صرف ایک چادر میں بھی نماز پڑھی ہے، کیا غیر مقلدین اپنی عورتوں کو بھی صرف ایک چادر میں نماز پڑھنے کو جائز رکھیں گے؟

آنحضور ﷺ ایک چادر میں کس طرح نماز پڑھا کرتے تھے اس کو بھی معلوم کر لیجئے۔ بخاری شریف اور حدیث کی دوسری کتابوں میں ہے: واضعا طرفیه علیٰ عاتقیه، یعنی چادر کا ایک کنارا آپ کے ایک شانہ پر ہوتا اور دوسرا کنارا دوسرے کاندھے پر ہوتا تھا، اب غیر مقلدین اپنی عورتوں کو مسجد اور گھر میں اسی طرح چادر کاندھے پر ڈلوا کر نماز پڑھائیں تا کہ صلوا والی حدیث پر ان کا عمل معلوم ہو، اہل حدیث نام رکھ کر یہ غیر مقلدین بلبل بنے پھرتے ہیں اور حال یہ ہے کہ ان کو احادیث کے معنی اور مفہوم کی ہوا بھی نہیں لگی ہوئی ہے۔

بخاری شریف میں ہے کہ آنحضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام نماز سے سلام پھیرنے کے بعد بلند آواز سے ذکر کرتے تھے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں آنحضور ﷺ کی نماز ختم ہونے کو آپ ﷺ کے بلند آواز سے تکبیر کہنے سے معلوم کیا کرتا تھا۔

اب غیر مقلدین اپنی عورتوں کو مسجدوں میں لے جا کر نماز ختم ہونے پر بلند

سجدہ کرے گی۔ غیر مقلدین ہی ہیں کہ وہ اپنی عورتوں کا سرین (پچھلا نیچے کا حصہ) اٹھا کر سجدہ کراتے ہیں اور اس طرح وہ عامل بالحدیث بنتے ہیں۔ میں پوری دنیائے غیر مقلدیت کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ کسی ایک محدث، ایک فقیہ، ایک صحابی، ایک صحابیہ کا قول پیش کرے کہ عورت نماز میں اپنا سرین اٹھا کر سجدہ کرے گی۔ شاید غیر مقلدوں کو ابن حزم کا کوئی قول مل جائے مگر کسی صحابی یا صحابیہ کا قول ہرگز نہیں ملے گا جن کے گھر کی عورتیں آنحضور ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر نماز پڑھا کرتی تھیں۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عورت رکوع اور سجدہ میں اور تمام نماز میں سمٹ کر اور سکڑ کر رہے گی، رکوع کرے گی تو سکڑ کر، سجدہ کرے گی تو سکڑ کر یعنی بدن کے بعض حصہ کو بعض سے ملا کر، کیا آنحضور اکرم ﷺ کی نماز اسی طرح کی تھی؟

نسائی شریف میں حضرت عقبہ بن عمرو کی روایت ہے، انھوں نے بھی لوگوں سے کہا کہ کیا میں تم کو رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھ کر نہ دکھلاؤں، لوگوں نے کہا کہ ہمیں رسول اللہ کی نماز پڑھ کر دکھلایئے تو انھوں نے جو نماز پڑھی وہ یہ تھی کہ رکوع میں **فجافی ابطیه** یعنی جب رکوع کیا تو بغل کو خوب کھلا رکھا، اور سجدہ میں **فجافی ابطیه** یعنی جب سجدہ کیا تو سجدہ میں بھی بغل کو خوب کھلا رکھا۔

اب میں دنیائے غیر مقلدیت سے سوال کرتا ہوں کہ وہ کسی صحابی کا قول یا کسی صحابیہ کا عمل یا قول کسی حدیث کی کتاب سے پیش کرے، جس سے معلوم ہو کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں عورتیں رکوع اور سجدہ میں بغل کا حصہ کھول کر نماز پڑھا کرتی تھیں یا ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کا قول پیش کرے کہ اس کا یہ مذہب معلوم ہو کہ عورتیں رکوع اور سجدہ میں بغل کا حصہ کھول کر نماز پڑھیں گی، یا کسی محدث کا قول پیش کرے کہ عورتوں کی نماز کا یہی طریقہ ہے جو نسائی کی حدیث میں مذکور ہے، کیا کسی صحابی یا صحابیہ، یا کسی فقیہ، محدث کو **صلوا کما رأیتمونی** والی حدیث کا علم نہیں تھا، یہ حدیث آج کے غیر مقلدین ہی کے لئے نیا انکشاف ہے کہ اس کو لے کر فتنہ برپا کر رہے ہیں۔

نسائی ہی میں حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے انھوں نے بھی لوگوں کے

سامنے آنحضور ﷺ کی نماز پڑھ کر کے پیش کیا ہے، رکوع کی حالت کے بیان میں ہے:
وجافی بمرفقیه کہ جب رکوع میں وہ گئے تو اپنی کہنیوں کو اپنے بدن سے دور کر کے رکھا۔

اب غیر مقلدین کسی امام، کسی فقیہ، کسی محدث، کسی صحابی، کسی صحابیہ کا کوئی ایک قول نقل کریں جس سے یہ معلوم ہو کہ عورت اسی طرح کہنیوں کو اپنے بدن سے دور رکھے گی۔ امام شافعیؒ کا بیان آپ نے پڑھ لیا کہ رکوع اور سجدہ میں عورت سمٹ سمٹ کر نماز پڑھے گی، امام شافعیؒ کے اس مذہب کو غیر مقلدین اپنے زور بازو سے دلائل کی روشنی میں غلط ثابت کر کے دکھلائیں، پھر امام شافعی اکیلے کیوں غیر مقلدین کو بڑے سخت سخت مراحل سے گذرنا پڑے گا۔ امام اہل سنت حضرت امام احمد کا بھی یہی مذہب ہے کہ عورت کی نماز مرد سے الگ ہے۔ مغنی ابن قدامہ حنبلی مذہب کی بڑی مشہور کتاب ہے، اس میں ہے:

ان المرأة تجمع نفسها فی الرکوع والسجود وتجلس متربعة اوتسدل رجلیها فتجعل فی جانب یمینها۔

یعنی عورت جب نماز پڑھے گی تو رکوع اور سجدہ میں اپنے آپ کو سمیٹے رہے گی اور چار زانو بیٹھے گی یا داہنی طرف اپنا دونوں پاؤں نکال کر بیٹھے گی۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **السدل اعجب الی** یعنی مجھے عورتوں کا دونوں پاؤں داہنے جانب نکال کر نماز پڑھنا زیادہ پسند ہے۔

آپ غیر مقلدین سے پوچھیں کہ حضرت امام احمد بن حنبل کو **صلوا کما رأیتمونی** والی حدیث معلوم تھی یا نہیں؟ اگر معلوم تھی اور یقیناً معلوم تھی تو پھر انھوں نے عورت کی نماز کا طریقہ مردوں سے الگ کیوں بیان کیا، کیا کسی غیر مقلد میں جرأت ہے کہ وہ امام احمد بن حنبل سے بڑا اپنے کو حدیث کا واقف کار اور حدیث پر عمل کرنے والا کہے؟

خیر امام شافعی اور امام احمد حنبل تو ذرا متاخر ہیں، لطف تو یہ ہے کہ امام دار الہجرۃ حضرت امام مالک **رحمة الله علیه** کا بھی یہی مذہب ہے۔ مالکی مذہب کی مشہور کتاب **اقرب المسالک الی مذهب الامام مالک** ہے، اس میں ہے کہ مرد کو حالتِ سجدہ میں اپنے پیٹ کو رانوں سے الگ رکھنا مطلوب ہے، اسی طرح کہنیوں، گھٹنوں،

آواز سے ذکر کرنے کی تعلیم فرمائیں، اور پھر یہ بھی بتلائیں کہ کس صحابی اور صحابیہ یا کس فقیہ اور کس محدث کا یہ فتویٰ ہے کہ عورتیں نماز ختم ہونے پر بلند آواز سے ذکر کریں گی، اور اگر کسی کا یہ مذہب معلوم نہ ہو تو بتلائیں کہ صلوا کما رأیتمونی پر ان کا عمل کیوں نہیں ہوا، کیا یہ سارے صحابہ اور ساری صحابیات اور یہ سارے مجتہدین اور فقہاء اور یہ سارے محدثین اور ائمہ حدیث اس حدیثِ پاک کی مخالفت کرتے تھے؟

غیر مقلدین کا کام صرف فتنہ وفساد پھیلانا اور سادہ لوح عوام کو اکابر اور اسلاف سے بدگمان کرنا ہے، آج ان کا طفل مکتب بھی بخاری شریف ہاتھ میں لئے پھرتا ہے، اور اسلام واکابر کے منہ آتا ہے، غیر مقلدیت آج کا عظیم فتنہ ہے، اللہ اس کے شر سے محفوظ رکھے۔

صلوا کما رأیتمونی والی حدیث بلاشبہ صحیح ہے، مگر اس میں اصل خطاب مردوں کو ہے۔ (۱) عورت بھی اس میں ضمناً شامل ہے مگر بہت سے احکام میں وہ مردوں والا طریقہ ان کا نہیں ہے اور اس کی صراحت احادیث میں ہے، فقہائے کرام کی نگاہ ان تمام احادیث پر تھی، اس وجہ سے ہر فقیہ امام نے عورتوں کے نماز کا طریقہ بعینہٖ مردوں والا نہین بیان کیا ہے بلکہ جن جگہوں پر عورتوں کا حکم الگ تھا اس کو الگ بیان کیا ہے، مثلاً ایک حدیث پاک میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کہیں جارہے تھے کہ دیکھا دو عورتیں نماز پڑھ رہی ہیں تو آپ نے ان سے کہا کہ جب تم سجدہ کرو تو بدن کا ایک حصہ دوسرے حصہ سے ملالیا کرو۔ (بیہقی) مردوں کو بدن کھول کر پڑھنے کا حکم ہے، مگر عورتوں کا حکم اللہ کے رسول ﷺ یہ بتلارہے ہیں کہ وہ سمٹ کر نماز پڑھے۔ معجم طبرانی کی روایت میں ہے:

حضرت وائل بن حجر کی روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم نماز پڑھو تو اپنا ہاتھ کانوں تک اٹھاؤ اور عورت اپنا ہاتھ اپنے پستان تک اٹھائے گی۔

---

(۱) اس وجہ سے اس حدیث میں جو صیغہ استعمال ہوا ہے وہ مذکر کا ہے، مؤنث کا نہیں ہے، مذکر کا صیغہ استعمال کرنا ہی یہ دلیل ہے کہ اس حدیث پاک کے اصل مخاطب مرد ہیں عورتیں نہیں ہیں۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ إذا سجدت المرأة فلتحتفز ولتضم فخذيها، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عورت جب سجدہ کرے تو خوب سمٹ کر اور اپنی دونوں رانوں کو ملا کر سجدہ کرے۔

کنز العمال میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ عورت جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو اپنی ران سے چپکا لے، اس طرح کہ زیادہ سے زیادہ پردہ ہو۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے عورت کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کس طرح نماز پڑھے گی تو آپ نے فرمایا کہ تجتمع وتحتفز یعنی وہ اپنے کو جما کر اور خوب سمٹ کر نماز پڑھے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ آنحضور ﷺ کے زمانہ میں عورتیں کس طرح نماز پڑھا کرتی تھیں، تو آپ نے فرمایا پہلے چہار زانو ہو کر پڑھا کرتی تھیں پھر ان کو حکم ہوا کہ خوب سمٹ کر نماز پڑھیں۔

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ: لاتقبل صلوٰة الحائض إلا بخمارها یعنی عورت کی نماز بلا سر ڈھکے درست نہیں ہے مگر مردوں کا یہ حکم نہیں ہے، اگر مرد کھلے سر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز درست ہے۔ غیر مقلد عالم مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری صاحب اس کی شرح میں لکھتے ہیں: والحديث يستدل به علىٰ وجوب ستر المرأة راسها حال الصلوٰة (تحفہ، ص: ۲۹۵، ج: ۱) یعنی یہ حدیث دلیل ہے کہ عورت کا نماز کی حالت میں سر چھپانا واجب ہے۔ اب غیر مقلدین بتلائیں کہ کیا مرد کے لئے سر چھپانا واجب ہے؟ اگر نہیں تو پھر عورت اور مرد کی نماز میں فرق ہوا یا نہیں؟

مرد کے لئے ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہننا حرام ہے، اگر اس نے ٹخنہ کے نیچے کپڑا پہن کر نماز پڑھی تو اس کی نماز مکروہ ہوگی مگر عورت کے لئے ٹخنہ چھپانا اور پاؤں کے اوپر کا حصہ چھپانا نماز میں واجب ہے، ابوداؤد میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ انھوں نے آنحضور ﷺ سے پوچھا کہ اگر عورت قمیص اور اوڑھنی میں نماز پڑھے تو اس کی نماز درست ہو جائے گی؟ تو آپ نے فرمایا: إذا كان الدراع سابغاً يغطي

ظهور قدميها ،یعنی نماز تب درست ہوگی جب اس کی قمیص اتنی لمبی ہو کہ اس کے پاؤں کے اوپر کا حصہ ڈھک جائے۔اب غیر مقلدین فرمائیں کہ یہ مرد اور عورت کی نماز میں فرق ہے یا نہیں؟

معلوم نہیں غیر مقلدین کو یہ شوق کیوں سمایا ہے کہ وہ عورتوں کو مرد بنائیں اور ان سے مرد ہی والی نماز پڑھائیں، کیا انھیں معلوم نہیں کہ شریعت میں عورتوں کو زیادہ سے زیادہ باپردہ رہنے کا حکم ہے، اور اپنے بدن کو چھپانے کا حکم ہے، تو غیر مقلدین نماز میں کیوں عورتوں کو بے پردہ بنانے پر اتارو ہوئے ہیں۔

حضرت علی خلیفہ راشد رضی اللہ عنہ تو یہ فرمائیں کہ **فان المرأة فی ذٰلک لیست کالرجل** یعنی سجدہ ورکوع میں عورتوں کا حکم وہ نہیں ہے جو مردوں کا ہے، اور غیر مقلدین یہ تبلیغ فرمائیں کہ نہیں عورتوں کو بھی سجدہ اسی طرح سے کرنا ہے جس طرح مرد کرتے ہیں، اس لئے کہ آنحضور ﷺ کا فرمان ہے کہ **صلوا کما رأیتمونی اصلی**، حضرت عطا تابعی تو یہ فرمائیں کہ **ان للمرأة هیئة لیست للرجل** ،یعنی نماز میں عورتوں کا ایک خاص طریقہ جو مردوں سے الگ ہے۔(ابن ابی شیبہ) اور آج کے غیر مقلدین اس پر زور لگائیں کہ نہیں جناب عورت اور مرد کا نماز کا طریقہ ایک ہی ہے، اور لوگوں کو **صلوا** والی حدیث سنا کر گمراہ کریں۔

آپ خود اندازہ لگائیں کہ عورت کی نماز کا طریقہ صحابہ وتابعین اور ائمہ فقہ وحدیث امام مالک، امام شافعی، امام احمد کو زیادہ معلوم تھا کہ آج کے غیر مقلدین کو، اور آپ کس کی سنیں گے، آج کے ان بدراہ غیر مقلدین کی یا اپنے اکابر واسلاف کی اور صحابہ وتابعین کی!

آج کے یہ غیر مقلدین نماز کے بارے میں یہ زور دکھلا رہے ہیں کل کے دن یہ حج کے بارے میں بھی زور دکھلائیں گے کہ جیسے مرد حج کرتا ہے ویسے ہی عورت بھی حج کرے اور سر کا بال منڈائے، اور لبیک زور سے عورت بھی کہے اور سعی میں عورت دوڑ کر چکر لگائے، اور طواف میں عورت بھی رمل کرے، ان غیر مقلدوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے

کب بہک جائیں، آپ خوب سمجھ لیں کہ جس طرح شریعت میں عورت کا طریقہ بعض احکام میں الگ ہے اسی طرح نماز میں بھی ان کا طریقہ بعض احکام میں الگ ہے۔ شریعت نے عورتوں کے لئے حج اور نماز دونوں میں زیادہ سے زیادہ باپردہ ہونے کا خیال رکھا ہے، اس لئے کہ عورت اور اس کے بدن کا ہر حصہ عورت ہے سوائے اس حصہ کے جس کے کھلا رکھنے کی شریعت میں ان کو اجازت ہے۔

آخر میں آپ سے گذارش ہے کہ آپ اکابر واسلاف کی راہ پر رہیں، صحابہ وتابعین کی راہ پر رہیں، اسی میں خیر ہے، اسی میں بھلائی ہے، دین وایمان کی سلامتی اسی میں ہے۔ غیر مقلدین کی باتوں پر قطعاً دھیان نہ دیں، اللہ نے ان کو دین کی فہم سے محروم کررکھا ہے، اکابر واسلاف کی راہ سے ان کے راستہ کو الگ کردیا ہے، اس لئے آپ ان کی صحبت سے بچیں اور ان کی سنی باتوں کو اَن سنی کردیں۔

اس تحریر کے بعد بھی اگر کوئی غیر مقلد آپ سے اس بارے میں لڑے جھگڑے تو اس سے دو تین سوال کریں۔

(۱) آنحضور اکرم ﷺ نے کھلے سر نماز پڑھا ہے۔
غیر مقلدین اپنی عورتوں کو کھلے سر نماز پڑھنے کو کیوں جائز نہیں کہتے ہیں؟

(۲) آنحضور اکرم ﷺ کی نصف ساق نماز میں کھلی رہتی تھی۔
کیا غیر مقلدین کی عورتیں اپنی پنڈلیاں کھول کر نماز پڑھتی ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟
صلوا والی حدیث پر غیر مقلدین اپنی عورتوں کو کیوں نہیں عمل کراتے۔

(۳) بخاری شریف کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور اکرم ﷺ سلام پھیر کر بلند آواز سے تکبیر کہا کرتے تھے اور بعض دوسرے اذکار بھی بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ کیا غیر مقلدین اپنی عورتوں کو اسی کی تعلیم کرتے ہیں اور ان کی عورتیں بھی بلند آواز سے سلام پھیر کر تکبیر کہا کرتی ہیں اور ذکر کرتی ہیں؟ اگر نہیں تو صلوا والی حدیث کہاں چلی گئی اور اس پر عمل کیوں نہیں ہے، آپ ان سے یہ تین سوال کریں پھر ان کا تیرہ کرم دیکھیں۔

آپ کا خط ملا تھا پھر فون پر آپ نے جلد ہی اس موضوع پر لکھنے کا اصرار کیا، بعض احباب نے گلبرگہ کرناٹک سے بھی اس موضوع پر لکھنے کا اصرار کیا تھا، اس لئے رمضان ہی میں جس میں عموماً میرا لکھنے پڑھنے کا کام بند رہتا ہے، آپ حضرات کی خواہش کے احترام میں یہ معروضات قلم برداشتہ پیش کردی گئی ہیں، خدا کرے آپ کیلئے اور دوسرے زمزم کے قارئین کیلئے یہ تحریر مفید ثابت ہو۔ والسلام

محمد ابوبکر غازی پوری

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعائے قنوت کیلئے ہاتھ اٹھانے کے بعد اس کا دوبارہ باندھنا

مکرمی حضرت مولانا صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں کئی روز سے فون لگا رہا تھا لیکن رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا، اب جو زمزم کا نیا شمارہ ملا تو اس سے آپ کا نیا موبائل نمبر معلوم ہوا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے رمضان اور شوال والا زمزم نہیں ملا، برائے کرم اسے بھیج دیں۔

دوسری عرض یہ ہے کہ ہمارے ایک رشتہ دار غیر مقلدوں کے ایک ادارہ میں کام کرتے ہیں، ان سے غیر مقلدوں نے سوال کیا ہے کہ حنفیہ جو وتر میں رفع یدین کے بعد دعاء قنوت پڑھتے وقت ہاتھ باندھتے ہیں، یہ کون سی حدیث سے ثابت ہے، براہ کرم اس کا جواب بذریعہ خط جلد دیں، اور مناسب ہو تو زمزم میں بھی اس کا جواب شائع کر دیں۔

والسلام

وحید الرحمٰن مدرسہ تعلیم الدین مہوا

پوسٹ نوگڈھ، سدھارتھ نگر

زمزم! آپ کا فون اس وقت آیا تھا جب میں ظہر بعد سو رہا تھا، موبائل کی گھنٹی سے نیند کھلی، رمضان وشوال والا پرچہ آپ کو دوبارہ بھیجا جا رہا ہے۔

فون پر آپ نے جو سوال کیا تھا اس کے بارے میں عرض ہے کہ کبھی سوال تو ہوتا ہے تحقیق کیلئے جیسا کہ آپ نے سوال کیا، اور کبھی سوال کا منشاء محض شرارت ہوتا ہے جیسا کہ غیر مقلدوں نے آپ کے رشتہ دار سے سوال کیا کہ دعاء قنوت میں رفع یدین کے بعد ہاتھ باندھنا کس حدیث سے ثابت ہے؟ یہ محض شرارت کے لئے سوال ہے اور یہ دکھلانا ہے کہ احناف بلا دلیل فقہی مسائل پر عمل کرتے ہیں۔ غیر مقلدین کی اس قسم کی شرارت کی عام عادت ہے، میں نے اس سوال کو اس کی شرارت اس لئے کہا کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ حالتِ قیام میں جب قیام کا بقاء مستقل رکن کی حیثیت سے ہو تو مصلی ہاتھ باندھ کر ہی کھڑا ہوتا ہے، دعاء قنوت کیلئے محض ہاتھ اٹھانے سے وضع سابق بدلی نہیں، جب سابقہ حالت اور وضع بدلی نہیں اور جیسے پہلے مصلی حالتِ قیام میں تھا ویسے ہی اب بھی حالت قیام ہی میں ہے، تو جس طرح ہاتھ باندھ کر پہلے کھڑا تھا اب بھی وہ اسی طرح کھڑا رہے گا۔

صحابہ کرام نے اللہ کے رسول ﷺ کی نماز کا جو نقشہ احادیث کی کتابوں میں پیش کیا ہے، اس میں رفع یدین کے بعد حالتِ قیام میں وضع الیمین علی الشمال یا وضع الذراع علی الذراع کا لفظ آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ جب نماز میں رفع یدین کے بعد قیام فرماتے تو اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھتے، آپ ﷺ کی نماز کی اس حالت کا بیان احادیث کی عام کتابوں میں ہے، پس حالتِ قیام میں ہاتھ باندھنا ایک دو حدیث سے نہیں بلکہ احادیث کثیرہ سے ثابت ہے، اور جو بات احادیث کثیرہ سے ثابت ہو اس کے بارے میں یہ سوال کرنا کہ وہ کس حدیث سے ثابت ہے محض شرارت ہے، یہ تو اس طرح کا سوال ہوا کہ کوئی غیر مقلدین سے پوچھے کہ تم جو نماز میں کھڑے ہو کر کمر کھجلاتے ہو یا سر کھجلاتے ہو اور پھر سینہ پر ہاتھ باندھ لیتے ہو یہ کس حدیث سے ثابت ہے؟

آپ حضرات سے ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ آپ لوگ صرف غیر مقلدین ہی کو سوالات کا موقع نہ دیں، ان سے بھی سوالات کرنے کی عادت ڈالیں۔ آپ حضرات اسی موقع پر اور اسی مسئلہ میں غیر مقلدین سے سر اور کمر کھجلانے والے سوال کے

بعد درج ذیل سوال کر کے ان سے جواب حاصل کریں۔

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ غیر مقلدین دعاء قنوت میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں، ان کا یہ عمل کس حدیث سے ثابت ہے؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ غیر مقلدین بلا تکبیر کہے ہوئے دعاء قنوت میں ہاتھ اٹھاتے ہیں تکبیر کا نہ کہنا کس دلیل سے ثابت ہے؟

(۳) تیسرا سوال یہ ہے کہ غیر مقلدین دعاء قنوت سراً پڑھتے ہیں یا جہراً، اگر سراً پڑھتے ہیں تو اس کی حدیث پیش کریں، اور اگر جہراً پڑھتے ہیں تو اس کی حدیث پیش کریں؟

(۴) چوتھا سوال یہ کریں کہ فتاویٰ اہلحدیث جلد ۳، ص: ۲۰۶ میں لکھا ہے کہ دعاء قنوت رکوع کے بعد پڑھنا مستحب ہے، بخاری شریف میں رکوع کے بعد ہے۔

اگر غیر مقلدین سچے ہیں تو بخاری شریف میں کوئی ایک حدیث بھی ایسی دکھلائیں جس سے معلوم ہوتا ہو کہ وتر کی دعاء قنوت کو حضور ﷺ نے رکوع کے بعد پڑھا ہو۔

اگر آپ اسی مسئلہ میں غیر مقلدین سے یہ چند سوالات کرلیں تو ان کی ساری اہلحدیثیت ہوا ہو جائے گی، غیر مقلدین کی بیمار ذہنیت کی بات اس مسئلہ میں قدم قدم پر نظر آتی ہے، اور یہ کس قدر فریب سے کام لیتے ہیں تعجب ہوتا ہے، حکیم صادق سیالکوٹی نے اپنی مشہور کتاب ''صلوٰۃ الرسول'' میں یہ ثابت کرنے کیلئے کہ دعاء قنوت رکوع کے بعد ہے، ص: ۳۵۹ اور ۳۶۰ پر نسائی اور ابوداؤد سے دو حدیثیں ذکر کی ہیں، حالانکہ ان احادیث کا تعلق قنوت نازلہ سے ہے، وتر والی قنوت سے نہیں ہے، بات کہاں کی تھی اور جوڑ کہیں دیا، اسی طرح انھوں نے مسلم شریف کے ایک باب سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ قنوت رکوع کے بعد ہے، فرماتے ہیں: امام نووی شارح مسلم، باب استحباب القنوت میں فرماتے ہیں: **ومحل القنوت بعد رفع الراس فی الرکعة الاخیرة**، اور قنوت کا محل آخری رکعت میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہے۔ (صلوٰۃ الرسول، ص: ۳۶۰ حاشیہ) یہاں بھی انھوں نے دھوکا دیا ہے، اس باب کا تعلق قنوت نازلہ سے ہے وتر کی

قنوت سے نہیں ہے، حکیم صاحب نے اس باب کے شروع کی عبارت چھوڑ دی ہے، جس سے ان کی خیانت واضح ہو رہی تھی، باب کے شروع کی عبارت یہ ہے:

باب استحباب القنوت في جميع الصلوٰة إذا نزلت بالمسلمين نازلة والعياذ بالله ۔یعنی قنوت کے مستحب ہونے کا باب تمام نمازوں میں جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو، العیاذ باللہ

غرض اسی مسئلہ قنوت میں غیر مقلدین دھوکا، فریب، خیانت، شرارت سب سے کام لے رہے ہیں، اور بے شرم اتنے ہیں کہ شیشہ کے گھر میں رہتے ہوئے آہنی دیواروں کے قصر ہائے شاہی پر پتھر پھینکتے ہیں۔

اگر اب آپ حضرات سے غیر مقلدین کوئی سوال کریں تو پہلے ان سے ان چاروں مذکورہ سوالات کا جواب احادیثِ صحیحہ صریحہ مرفوعہ کی روشنی میں حاصل کریں، تب ان کے سوالات کی طرف توجہ فرمائیں۔

الحمد للہ آپ حضرات کی رہنمائی کے لئے اور غیر مقلدین کے اعتراضات وسوالات کا جواب دینے کے لئے ہم جیسے بہت سے لوگ موجود ہیں، مگر غیر مقلدوں کی نحوست یہ ہے کہ ان کی جماعت میں آپ کے سوالات کا جواب دینے کے لئے نہ ان کا کوئی عالم آگے آئے گا اور نہ جاہل، اگر تجربہ کرنا ہو تو انھیں مذکورہ چاروں سوالات کے جوابات ان سے احادیث کی روشنی میں معلوم کریں، چونکہ ان کے عالم وجاہل جواب دینے سے عاجز رہتے ہیں تو انھوں نے اپنی خو یہ بنائی ہے کہ صرف سوال کرو، غیر مقلدوں کے اس مکر کو آپ حضرات خوب سمجھ لیں۔ والسلام

محمد ابوبکر غازی پوری

☆☆☆☆☆

نوٹ: اس سوال کا جواب قدرے مختصراً صاحب سوال کو بذریعہ خط مطلع کر دیا گیا تھا۔ افادہ عام کے لئے اب قدرے بسط سے یہ جواب شائع کیا جا رہا ہے۔

مختلف سوالات کے مختصر جوابات

شیعوں میں تین قرآن میں تحریف واقع ہونے کے قائل نہیں

(۱) **سوال**: براہ کرم مطلع فرمائیں کہ شیعوں میں سے کچھ ایسے اہل علم بھی گذرے ہیں جو قرآن میں کسی طرح کی تبدیلی وتحریف کے قائل نہ ہوں؟

زمزم: آپ کا سوال آنے کے بعد میں اس کی تلاش میں تھا کہ اسی دوران علامہ ذہبی کی کتاب ''سیر اعلام النبلاء'' کا مطالعہ کررہا تھا، اس کی تیرہویں جلد میں شریف مرتضیٰ کے حالات میں یہ لکھا ہوا ملا:

''قال ابن حزم: الامامیة کلهم علیٰ أن القرآن مبدل فیه زیادة ونقص سوئی المرتضیٰ فانه کفر من قال ذٰلک و کذٰلک صاحباه ابویعلی الطوسی وابوالقاسم الرازی.'' (سیر اعلام النبلاء، ص:۲۳۱، ج:۱۳)

یعنی ابن حزم کا بیان ہے کہ امامیہ فرقہ کے سبھی لوگ قرآن میں تبدیلی اور اس میں کمی بیشی کے قائل ہیں سوائے تین آدمیوں، ایک ان میں شریف مرتضیٰ ہیں، اور دو ان کے شاگرد ابویعلیٰ اور ابولقاسم رازی، یہ تینوں حضرات ان کی تکفیر کرتے ہیں قرآن میں تبدیلی یا کمی بیشی کے واقع ہونے کے قائل ہیں۔

کیا قرآن وحدیث میں تاویل کرنا صرف اشاعرہ اور ماتریدیہ کا مذہب ہے؟

(۲) غیر مقلدین کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں تاویل جائز نہیں ہے، بلکہ قرآن وحدیث کے جو الفاظ ہیں ان کو اپنے اصل معنی میں لینا واجب ہے، تاویل کرنا اشاعرہ اور ماتریدیہ فرقہ کا طریقہ ہے اور یہ دونوں فرقے سلف کے طریقہ پر نہیں ہیں۔

براہ کرم مختصر میں اس کا جواب دے دیں۔

زمزم: اگر غیر مقلدین کی یہ بات صحیح ہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ سلف کے طریقہ پر نہیں ہیں تو غیر مقلدین کے علاوہ کوئی بھی سلف کے طریقہ پر نہ ہوگا، تمام شوافع، تمام حنابلہ، تمام موالک اور حناف سلف کے طریقہ سے خارج ہو جائیں گے، اور اگر قرآن وحدیث کے بعض الفاظ کو ظاہری معنی پر لینا اور ان کی تاویل کرنا گمراہی ہے اور سلف کے طریقہ کے خلاف ہے تو غیر مقلدین کے تمام بڑے علماء بھی گمراہ ہوں گے، اس لئے کہ قرآن وحدیث کے بعض الفاظ کی تاویل کرنے سے ان کے علماء کو بھی چارہ نہیں رہا ہے، اگر ان لفاظ کی تاویل نہ کی جائے تو قرآن وحدیث کا صحیح مطلب ہی واضح نہ ہوگا۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) شیخ محمد بن عبد الوہاب کے پوتے (جن کا نام سلیمان بن عبد اللہ ہے) نے اپنے دادا کی کتاب ''کتاب التوحید'' کی شرح تیسیر العزیز کے نام سے لکھی ہے، اس میں وہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے سورہ واقعہ میں کو آیت لَا یَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (کہ قرآن کو صرف پاک ہی لوگ چھوتے ہیں) کی تفسیر نقل کرتے ہیں۔

قال البخاری فی صحیحه فی هٰذه الآیة لایجد طعمه إلا من آمن به (ص: ۴۰۷) یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا مزہ انھیں کو ملتا ہے جو قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔

یہ تاویل نہیں ہے تو کیا ہے، اب غیر مقلدین امام بخاری کے بارے میں یہ فیصلہ فرمائیں کہ وہ سلف کے طریقہ پر تھے یا نہیں؟

اور اسی کتاب میں اس حدیث کا مطلب ''وزوی لی الارض'' یعنی حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ (میرے لئے زمین کو سمیٹ دیا گیا) وہ یہ فرماتے ہیں:

وظاهر هٰذا اللفظ يقتضي ان الله تعالىٰ قوى ادراك بصره ورفع عنه الموانع المعتادة (ص:۳۲۲)

یعنی اس لفظ کا ظاہر یہ بتلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی آنکھ کے ادراک کو قوی کردیا تھا، جو چیز عام طور پر دیکھنے سے مانع بنتی ہے اس کو اٹھادیا تھا، (یہ مطلب ہے اس حدیث کا)

فرمایا جائے کہ یہ حدیث پاک کی تاویل ہے کہ نہیں، اب غیر مقلدین شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پوتے کے بارے میں فیصلہ کریں کہ وہ اہل حق میں سے تھے کہ اہل باطل میں سے، ان کا طریقہ سلف کا تھا یا اشاعرہ اور ماتریدیہ کا طریقہ تھا۔

(۳)　حدیثِ پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو یاد کرلے وہ جنت میں جائے گا۔

اس کی تفسیر میں شیخ ابن عبدالوہاب کے پوتے صاحب اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

والمعنى ان له اسماء متعددة، وهٰذا كقولك لفلان الف شاة عندها للاضياف فلايدل علىٰ انه لايملك غيرها۔ (ص:۵۷۹)

یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کئی نام ہیں، (یہ نہیں بس ننانوے ہی نام ہیں) یہ ایسا ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں کے پاس ایک ہزار بکری ہے اس نے ان کو مہمانوں کے لئے رکھا ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کے ان کے علاوہ اس کے پاس بکریاں نہیں ہیں۔

ننانوے کا عدد تو خاص ہے، یعنی ننانوے اس عدد کو کہتے ہیں جو اٹھانوے سے ایک اوپر ہو اور سو سے ایک نیچے ہو، اس خاص عدد میں بھی تاویل کی جارہی ہے، اب غیر مقلدین شیخ بن عبدالوہاب کے ان پوتے صاحب کے بارے میں فتویٰ دیں کہ وہ سلف کے طریقہ پر تھے یا نہیں، وہ اشعری یا ماتریدی تو نہیں تھے؟

کتاب وسنت میں سیکڑوں جگہ ایسی ہیں کہ وہاں تاویل کے بغیر اس کا معنی کھل

ہی نہیں سکتا، اگر ان کے الفاظ کو ان کے اصل معنی میں استعمال کیا جائے تو مرادِ خداوندی واضح نہیں ہو سکتی، اور کلامِ خداوندی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

(۴) مثلاً قرآن میں ہے: يَدُ اللهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ یعنی اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے یعنی مومنین کے اوپر ہے، اب اگر اس کو بالکل ظاہری معنی پر محمول کریں گے تو اس کا کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آتا، اس لئے اس کی تاویل کرنی ضروری ہوگی تا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد واضح ہو، اس کی تفسیر غیر مقلدوں کے قرآن میں جو سعودیہ سے شائع ہوا ہے، یہ لکھا ہے:

''یعنی اللہ ان کے ساتھ حاضر ہے، ان کی باتیں اور ان کی جگہ دیکھ رہا ہے، اور ان کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہے۔ (سورہ فتح آیت نمبر: ۱۰/حاشیہ نمبر: ۸)

(۵) يوم ندعو كل اناس بامامهم میں امام کی تفسیر شوکانی نے جو غیر مقلدین کے بڑے پیشوا ہیں، نامۂ اعمال سے کی ہے۔ (دیکھو غیر مقلدین کا قرآن، سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر: ۷۱/حاشیہ نمبر: ۶)

ان پانچ مثالوں سے واضح ہو گیا کہ خود غیر مقلدین کے اکابر کتاب و سنت میں تاویل کیا کرتے تھے، تو اب یا تو یہ اکابر سلف کے طریقہ پر نہیں تھے، ان میں کا کوئی ماتریدی تھا کوئی اشعری، یا پھر موجودہ غیر مقلدین ہی سلف کے طریقہ پر نہیں ہیں، فیصلہ اب خود غیر مقلدین ہی کر لیں۔

آپ نے کہا تھا کہ جواب مختصر ہو، انتہائی اختصار کے باوجود بھی کچھ طویل ہو گیا۔

دمِ حیض اور دمِ استحاضہ کا فرق

(۳) آپ سے ایک سوال یہ ہے کہ دمِ حیض کو گندگی فرمایا گیا ہے، عورت سے صحبت کرنا ایامِ حیض میں حرام ہے، تو دمِ استحاضہ بھی دم ہے اور وہ بھی گندگی ہے، اس حال میں عورت سے ہم بستری کیوں حرام نہیں ہے؟

زمزم: برادرم زمزم اس طرح کے سوال کے لئے نہیں ہے، یہ تو آپ کسی

مدرسہ کے دارالافتاء سے سوال کرتے ،اگر ہم اس طرح کے سوالوں کا جواب دینے لگیں تو اولاً ہم میں اس کی صلاحیت نہیں ،دوم ،پھر زمزم اسی طرح کے سوالوں اور جوابوں کا ہو کر رہ جائے گا۔

بہر حال آپ کے سوال کا جواب دیا جارہا ہے،مگر آئندہ اس طرح کا سوال نہ کریں۔

دم حیض اور دم استحاضہ میں فرق ہے ،دم حیض فاسد ہے ،اس کا منبع یعنی اس کے نکلنے کی جگہ وہ فضلات ہیں جو عورتوں میں طبعًا پیدا ہوتے ہیں ،جیسے پیشاب ،پاخانہ وغیرہ ،اگر پیشاب پاخانہ کو روک دیا جائے تو عورت بیمار ہو جائے گی ،اسی طرح دم حیض اگر خارج نہ ہو تو عورت مریض ہو جائے ،اس وجہ سے اس کو اذیٰ یعنی گندگی فرمایا گیا ہے ،اور مردوں کو ان ایام میں عورتوں کے پاس جانا حرام قرار پایا ہے۔

اور دم استحاضہ دمِ صالح ہے ،دم فاسد نہیں اس کا منبع عورت کے رحم کے عمق میں جو رگیں ہیں ،وہ ہے ،یعنی دم استحاضہ کا تعلق فضلات سے نہیں ہے ،اس لئے استحاضہ کی حالت میں صحبت کرنا ممنوع نہیں ہوا ،البتہ چونکہ دم استحاضہ عورت کی بیماری کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس حال مین خون زیادہ نکلنے کی وجہ سے عورت کمزور ہو جاتی ہے ،اس وجہ سے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جب عورت اس حال میں ہو تو اس کے ساتھ مجامعت کرنے سے بچا جائے ،اگر آپ عربی جانتے ہوں تو تفسیر کبیر میں اس آیت کی تفسیر دیکھ لیں۔

(۴) غیر مقلدین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہیں اور قرآن کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں ،الرحمٰن علی العرش استویٰ اور اس میں کسی طرح کی تاویل کو جائز نہیں رکھتے ،اور جو تاویل کرتا ہے اس کو گمراہ کہتے ہیں؟

زمزم : غیر مقلدین کا یہ مسئلہ گھسا پٹا بہت پرانا ہے ،اور دوسروں کو گمراہ کہنا یہ ان کا کھانا پینا ہے ،ان کا پیٹ اسی سے بھرتا ہے ،آپ ان غیر مقلدوں سے یہ پوچھیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کا یہی مطلب ہے کہ عرش اللہ کا مکان ہے جس میں معاذ اللہ ،اللہ سمایا ہوا ہے ،تو ہر مکان مکین سے بڑا ہوتا ہے ،اگر مکان چھوٹا ہو اور مکین بڑا

ہوتو اس میں سمانہیں سکتا، جیسے ایک کیلو دودھ والے برتن میں دو کیلو دودھ نہیں سما سکتا۔

اب غیر مقلدین کتاب وسنت سے صرف یہ ثابت کردیں کہ اللہ تعالیٰ معاذ اللہ عرش سے چھوٹا ہے اور عرش اللہ سے بڑا ہے تاکہ عرش اللہ کی جگہ بن سکے اور اللہ تعالیٰ اس میں سما جائے، اور جب وہ کتاب وسنت سے یہ ثابت کردیں کہ اللہ تعالیٰ عرش سے چھوٹا ہے اور عرش اللہ سے بڑا ہے، تو پھر آپ ان سے یہ کہیں کہ اب تم اپنی نمازوں میں اللہ اکبر کی جگہ ''العرش اکبر'' کہا کرو، اس لئے کہ اللہ اکبر کا تو یہ مطلب ہے کہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ ہر چیز سے بڑا ہے، اور اب معلوم ہوا کہ نہیں اللہ سے بڑی بھی ایک چیز ہے اور وہ غیر مقلدوں والا عرش ہے جس پر اللہ تعالیٰ جما ہے۔

اور اگر آپ غیر مقلدوں کے چکر میں رہیں گے تو یہ آپ کو کہیں کا نہیں رکھیں گے، ان کی صحبت سے پرہیز کیجئے، تمام اہل سنت کا مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے مکان، ہر طرح کی جہت، ہر طرح کے جسم اور ہر طرح کی احتیاج سے پاک اور منزہ ہے۔

(۵) دم کئے ہوئے پانی میں پانی ملانا

عام طور پر ہمارے بزرگوں کا یہ معمول ہے کہ وہ کسی مریض کے لئے پانی پر دم کرتے ہیں پھر یہ کہتے ہیں کہ پانی کم ہو جائے تو اس میں پانی ملا کر بڑھا لو، اس کی کوئی اصل ہے یا بزرگوں کا اپنا معمول ہے؟

زمزم : اہل حق اور مستند بزرگوں کا جو معمول ہوا کرتا ہے تو اس کی کوئی اصل ضرور ہوا کرتی ہے، کم از کم اتنا ضرور ہوتا ہے کہ یہ معمولات عام طور پر مشائخ میں رائج ہوتے ہیں اور اس پر کوئی نکیر کسی متدین عالم اور اللہ والے کی طرف سے نہیں ہوتی ہے، اور اگر کسی رائج عمل پر کسی مستند اور پابند شریعت کی طرف سے نکیر نہ ہو تو وہ خود ایک دلیل ہے کہ وہ عمل مباح اور حسن ہے، حدیث پاک میں ہے کہ مسلمان جس عمل کو اچھا سمجھیں وہ اچھا ہے، مسلمان سے یہاں مراد ہر زمانہ کے پابند شریعت علماء ہیں، ہر زید، عمرو، بکر نہیں مراد ہیں۔

خاص اس مسئلہ کے بارے میں جو آپ کا سوال ہے غالباً بزرگانِ دین نے

اس واقعہ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔

قیس بن طلق اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ہم چھ لوگ جن میں پانچ بنی حنیفہ کے تھے اور ایک بنی ضبیعہ کا تھا، وفد کی شکل میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہم نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ کے ساتھ نماز پڑھی، پھر ہم نے آپ کو بتلایا کہ ہم جہاں رہتے وہاں ایک گرجا گھر ہے، رخصت کے وقت آپ ﷺ سے ہم نے آپ کے وضو کا بچا ہوا پانی مانگا، تو آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور وضو کیا، اور جو پانی بچا تھا اس میں کلی کی، پھر ایک برتن میں اس پانی کو رکھ کر ہمیں دیا اور فرمایا اس پانی کو تم لوگ لے جاؤ اور وطن پہونچ کر اس گرجا کو توڑ دو اور اس کی جگہ پر اس پانی میں سے چھڑک دو اور اس جگہ مسجد بناؤ، تو ہم نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارا شہر بہت دور ہے، پانی راستہ میں خشک ہو کر کم ہو جائے گا تو آپ ﷺ نے فرمایا: فامدوہ من الماء فانہ لایزیدہ إلا طیباً یعنی جب پانی کم ہوتا محسوس ہو تو اس میں اور پانی ملا دیا کر و اس سے اس کی پاکیزگی (مراد برکت) میں اضافہ ہوگا۔

خط کشیدہ عبارت مشائخ کے عمل کی صریح دلیل ہے، یہ حدیث صحیح سند سے صحیح ابن حبان جلد ثالث ص: ۴۰۵ و ص: ۴۰۶ پر آپ کو مل جائے گی۔

اس کتاب کا حاشیہ نگار لکھتا ہے کہ یہ حدیث سنن نسائی اور طبرانی میں بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

کا عمل اسی پر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز خیر القرون کے لوگوں کا عمل ہے، اگر کسی بات پر ان کا عمل ہے تو وہ بہت پختہ شرعی حجت ہے، اسی کو اجماع سے تعبیر کرتے ہیں، اور جس چیز پر امت کا اجماع ہو اس کے خلاف بعض لوگ اگر آوازہ بلند کرتے ہیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ نیل الاوطار میں غیر مقلدوں کے پیشوا شوکانی صاحب لکھتے ہیں:

واحتج ایضاً من قال بالمشروعیة بانه لم یزل آداب المسلمین القاصدین للحج فی جمیع الازمان علی تباین الدار واختلاف المذاهب الوصول الی المدینة المشرفة لقصد زیارته ویعدون ذٰلک من افضل الاعمال ولم ینقل ان احداً انکر ذٰلک علیهم فکان اجماعاً (ج:۴،ص:۱۰۴)

یعنی جو لوگ آپ ﷺ کی قبر کی زیارت کرنے کو مشروع سمجھتے ہیں ان کی دلیل یہ بھی ہے کہ ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر مذہب کے لوگ اس زیارت کو افضل اعمال سمجھتے رہے ہیں، اور حج کے موسم میں مدینہ مشرفہ آپ ﷺ کی قبر شریف کی زیارت کے لئے حاضر ہوتے ہیں، مسلمانوں کا یہ دستور ہر دور میں رہا ہے، اور کسی دور میں اس پر نکیر نہیں کی گئی ہے، اس لئے قبر شریف کی زیارت کا عمل امت مسلمہ کا اجماعی مذہب ہے۔

مزید تحقیق کے لئے حضرت لکھنوی کی تصنیف **الرفع والتکمیل** ص:۲۵۲ دیکھ لیجئے، اور **شفاء السقام للسبکی** کا مطالعہ مفید ہوگا۔

محمد ابوبکر غازی پوری

☆☆☆☆☆

کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام فقہ حنفی کے مقلد ہوں گے؟

محترم مولانا صاحب! سلام مسنون

عرض یہ ہے کہ قربِ قیامت جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے تو وہ حضور کے امتی بن کر مسائل شرعیہ میں کیا فقہ حنفی کی تقلید کریں گے؟ غیر مقلدین حضرات کچھ اس قسم کی باتیں عوام کو بتلاتے ہیں کہ احناف کی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے، براہ کرام جواب باصواب سے بذریعہ زمزم مطلع فرمائیں۔

جاوید شیخ اورنگ آباد، مہاراشٹر

زمزم ! حضرت عیسیٰ علیہ السلام فقہ حنفی کے مقلد ہوں گے، احناف کی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے، غیر مقلدین حضرات کچھ اس قسم کی باتیں عوام کو بتلاتے ہیں''

تو جو غیر مقلد ایسا کہتا ہے اس سے پوچھے کہ احناف کی کس کتاب میں یہ لکھا ہے۔ ''احناف کی کتابوں'' کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو اس سے عموماً فقہ اور احادیث وشروح احادیث یا تفسیر کی وہ کتابیں مراد ہوتی ہیں جن کو علمائے احناف نے تصنیف فرمایا ہوتا ہے، ہماری نگاہ سے اب تک احناف کی ایک بھی ایسی کتاب نہیں گذری جس میں یہ لکھا ہو، نہ یہ قول ہمارے امام کا ہے اور نہ ان کے شاگردوں میں سے کسی شاگرد کا ہے، تو جو شخص یہ بات فقہ حنفی یا ائمہ احناف کی حدیث وتفسیر کی کسی کتاب کی طرف منسوب کرتا ہے، تو اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس کی بات کی سچائی کو ائمہ احناف کی کتابوں میں سے کسی

کتاب سے ثابت کرے، پروپیگنڈہ اور جھوٹ کی ذریعہ کسی غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کا فن کوئی غیر مقلدین سے سیکھے۔ ان بیچاروں کی زندگیاں اس فن میں پہلوانی دکھلانے میں گذری ہیں، فقہ حنفی اور فقہائے احناف کے خلاف جھوٹ گڑھنا، بدزبانی کرنا اور بد تہذیبی کا ننگا ناچ ناچنا غیر مقلدوں کی پرانی سنت ہے، و کفیٰ بھم فخراً

اگر کسی اللہ والے کا یہ کشف ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لانے کے بعد شرعی احکام میں فقہ حنفی کی موافقت کریں گے تو اولاً یہ کسی حنفی امام کا قول نہیں ہے، یہ کسی بزرگ کا کشف ہے، اور کشف شرعی دلیل نہیں بنتا۔ دوسرے یہ کہ تقلید نام ہے کسی چھوٹے کا اپنے بڑے کی اتباع کرنے کا، تقلید میں مقلد کم علم اور تابع ہوتا ہے، اور وہ جس کی تقلید کرتا ہے وہ علم اور مرتبہ کے اعتبار سے بڑا ہوتا ہے، وہ تابع نہیں متبوع ہوتا ہے، تو کون ایسا جاہل ہے جو یہ کہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو نبی تھے اور نبی ہی بن کر اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور وہ اپنے سے کم علم اور کم مرتبہ کی تقلید کریں گے؟ اور جو منصب نبوت سے سرفراز ہوتا ہے وہ ہمیشہ متبوع ہی ہوتا ہے، وہ کسی کا تابع نہیں ہوتا ہے۔

البتہ کسی بات میں بڑا چھوٹے کی موافقت کرے تو اس سے بڑے کا مرتبہ گھٹتا نہیں ہے ہاں چھوٹے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، اور اس کا شرف وکمال ظاہر ہوتا ہے، کتنے مسائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت فرمائی ہے، تو کیا اس سے اللہ کی جلالت وعظمت اور اس کے علم میں کچھ فرق پڑا، اور کوئی یہ کہنے کی جرأت کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقلید کی؟

بہت سے مواقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی موافقت فرمائی، صحابہ کرام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت فرمائی۔

ائمہ اربعہ بہت سے مسائل فقہیہ میں ایک دوسرے کی موافقت کرتے ہیں، تو کیا کوئی کہے گا کہ یہ ائمہ ان مسائل میں ایک دوسرے کے مقلد ہیں، دیکھو ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک دوسرے سے موافقت کرتا ہے کہ اکٹھی تین طلاق تین ہوتی ہیں کہ ایک، جیسا

کہ شیعوں کا مذہب، تراویح کسی ایک امام کے نزدیک آٹھ رکعت نہیں، اس میں چاروں امام ایک دوسرے کی موافقت کرتے ہیں، اصول شرعیہ چار ہیں، قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ اس میں ہر امام دوسرے امام کا موافق ہے، جبکہ شیعہ اس کے قائل نہیں ہیں، اور بھی اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جن میں چاروں اماموں سے ہر ایک دوسرے کی موافقت کرتا ہے، اب اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں امام فلاں امام کا مقلد ہے تو یہ اس کا پاگل پن ہے، چاروں اماموں سے ہر امام مستقل مجتہد مطلق ہے اور مجتہد پر تقلید حرام ہے، تو کوئی امام کسی امام کا مقلد کیسے ہوگا، توافق کا نام تقلید رکھنا کھلی جہالت ہے۔

تو اگر کسی اللہ والے کو بذریعہ کشف یہ معلوم ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسائل شرعیہ میں فقہ حنفی کی موافقت فرمائیں گے تو عین ممکن ہے کہ ایسا ہو مگر یہ امکان ہی کے درجہ کی بات ہوگی، یہ کشف کوئی قطعی اور شرعی حجت نہ ہوگا کہ اس کو لے کر غیر مقلدین ہنگامہ مچائیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کرنے کا راگ الاپنے لگیں، رہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فقہ حنفی کے ساتھ موافقت تو یہ فقہ حنفی کا شرف ظاہر کرنے کے لئے ہوگا اور یہ بتلانے کے لئے ہوگا کہ اس فقہ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں شرف قبولیت حاصل ہے، جیسا کہ بہت سے مسائل میں اللہ تعالیٰ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موافقت فرمانا یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا شرف وفضل اور اسلام میں ان کا مقام بلند بتلانے کے لئے رہا ہے، نہ یہ دکھلانے کے لئے معاذ اللہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ علم وکمال میں اللہ تعالیٰ سے بڑھا ہوا ہے، تعالیٰ اللہ علواً کبیراً

اب سنئے کہ اصل قصہ کیا ہے؟ غیر مقلدین کے ایک محدث صاحب تھے، ''گوندلوی'' کی نسبت سے مشہور تھے۔(۱)

غیر مقلدین ان کا اصل نام بہت کم لیتے ہیں ان کو ''حضرت محدث گوندلوی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ صاحب عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے، غیر

(۱) گوندلوی صاحب کا اصل نام محمد یحییٰ ہے، پاکستان کے کسی اہلحدیث مدرسہ کے مدرس اعلیٰ تھے یا ہیں۔ واللہ اعلم

مقلدیت کے سارے جراثیم اکٹھے ان کے اندر موجود تھے، یعنی بد زبانی، بد تہذیبی، بڑوں اور کابر اور اولیاء اللہ کی گستاخی اور بے احترامی، تقلید کی دشمنی، ائمہ احناف رحمہم اللہ سے دلی بغض اور کینہ، کتابون کی عبارتوں میں الٹ پھیر کرنا، یہ ان کی بعض خصوصیات ہیں، ہم نے ان کی کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، ان کی ان خصوصیات کو ہم نے ان کی کتابوں میں جگہ جگہ محسوس کیا ہے، بہر حال ان محدث گوندلوی صاحب کو ترکی سے چھپا ہوا حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے مکتوبات کا منتخب عربی رسالہ مل گیا، انھوں نے اس کے حوالہ سے لکھا کہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد فقہ حنفی پر عمل کریں گے۔

گوندلوی محدث صاحب فرماتے ہیں: سنئے! سید احمد سرہندی حنفی فرماتے ہیں: **ان عیسیٰ یعمل بعد نزوله بمذهب الامام ابی حنیفة**، حضرت عیسیٰ نازل ہونے کے بعد فقہ حنفی پر عمل کریں گے۔ (مطرقۃ الحدید)

گوندلوی محدث صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام جس انداز میں لیا ہے وہ ناظرین کرام دیکھ رہے ہے، جس شخصیت پر برصغیر کے مسلمانوں کو بلا امتیاز ایں وآں ناز وفخر ہے اور جس کے کارناموں سے ہندوستان کی اسلامی تاریخ روشن ہے، اور جس نے اپنی جدوجہد وایثار وقربانی سے اکبر کے دین الٰہی کا قلع قمع کر کے ہندوستان میں اسلام کی بجھتی ہوئی شمع کو روشن کیا اس کو محدث گوندلوی صاحب ''سید احمد سرہندی حنفی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کا لازمی لقب مجدد کو کیا ذکر کرتے، رحمۃ اللہ علیہ تک کہنا ان کو گوارا نہیں ہوا، اس لئے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ حنفی تھے، جی ہاں غیر مقلدیت اسی کا نام ہے، اب اور سنئے کہ ان محدث صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ پر یہ افتراء کیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے ہرگز یہ نہیں فرمایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حنفی فقہ پر عمل کریں گے، اور اپنے اسی دجل اور فریب اور بددیانتی کو چھپانے کے لئے محدث صاحب نے مکتوبات کی پوری عبارت نقل نہیں کی، حضرت مجدد صاحب تو یہ فرماتے ہیں کہ:

''ویمکن أن یکون ماقاله الخواجه باشا قدس سره فی الفصول الستة من أن عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیه الصلوٰة والسلام یعمل بعد نزوله بمذهب الامام ابی حنیفة بواسطة هٰذه المناسبة التی له رضی الله عنه بحضرة روح الله علیه السلام یعنی ان اجتهاده یکون موافقاً لاجتهاد الامام الاعظم لأنه یقلده فان شانه علیه السلام اعلیٰ أجل من أن یلقد علماء الامة۔

یعنی پس ممکن ہے کہ وہ بات جس کو خواجہ پاشا رحمۃ اللہ علیہ نے فصول الستہ میں ذکر فرمائی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر عمل کریں گے، اسی مناسبت کی وجہ سے (جو امام اعظم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مابین رہی ہے) حضرت پاشا رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اجتہاد حضرت امام اعظم کے اجتہاد سے موافقت رکھے گا نہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت امام ابو حنیفہ کی تقلید کریں گے، اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہیں کہ وہ اس امت کے علماء میں سے کسی کی تقلید کریں۔

دیکھئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کیا فرما رہے ہیں اور گوندلوی محدث کیا فرماتے ہیں۔

محدث صاحب نے جو بات خواجہ پاشا کی تھی اس کو حضرت مجدد الف ثانی کے سر مڑھ دیا، حضرت مجدد صاحب تو صاف انکار کر رہے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہے کہ وہ امت کے کسی عالم کی تقلید کریں، اور محدث صاحب فرماتے ہیں کہ مجدد صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ حضرت امام اعظم اور فقہ حنفی کے مقلد ہوں گے۔

ان محدث صاحب کو اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔

افسوس صد افسوس ایسے ہوتے ہیں جماعت غیر مقلدین کے محدث لوگ!

فاعتبروا یااولی الابصار

حضرت مجدد صاحب خواجہ پاشا کے قول کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ چونکہ حضرت امام اعظم کو حضرت عیسیٰ سے ایک خاص روحانی مناسبت ہے، تو ہوسکتا ہے کہ مسائل شرعیہ میں دونوں کے اجتہاد(۱) میں توفق ہو، یہ توافق والی بات بھی بدرجہ امکان کے ہے نہ کہ بطور قطعیت اور لزوم کے، حضرت مجدد صاحب نے اپنی عبارت میں پہلا لفظ **فیمکن** لاکر یہ بتلا دیا ہے کہ خواجہ پاشا کی بات بدرجہ امکان میں ہے نہ یہ کہ یہی واقعہ بطور لازم پیش آئے گا۔

اور میں بتلا چکا ہوں کہ تقلید الگ شئ ہے اور موافقت الگ شئ ہے، تقلید میں مقلِد کا مقلَد یعنی متبوع سے کم ہونا ضروری ہے، تقلید عامی کے لئے ہوتی ہے، مجتہد کسی کی تقلید نہیں کرتا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود مجتہد ہوں گے وہ کسی امتی کی تقلید نہیں کریں گے بلکہ اپنے اجتہاد پر عمل کریں گے اور یہ اجتہاد حضرت امام اعظم کے اجتہاد کے موافق ہوگا تو یہ حضرت امام اعظم کے شرف وبلندئ درجہ اور اللہ کے یہاں فقہ حنفی کی مقبولیت کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے شہادت ہوگی۔

غالباً غیر مقلدین کو یہی پریشانی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فقہ حنفی کے بارے میں کیوں ایسی شہادت مہیا فرمائیں گے جن سے خرمن غیر مقلدیت کو جل کر خاک ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

بہرحال آپ نے دیکھا کہ غیر مقلدین نے اس پروپیگنڈہ میں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فقہ حنفی کے مقلد ہوں گے کیسی دھاندلی کی ہے، اور جو بات کسی حنفی فقہ کے امام سے ثابت نہیں ہے اس کو انھوں نے حضرات فقہائے احناف کے سر مڑھ دیا ہے، اسی سے سمجھ لیجئے کہ غیر مقلدیت کیا ہے اور یہ کتنا بڑا فتنہ ہے۔

☆☆☆☆☆

(۱) چونکہ وحی کا آنا حضور ﷺ کے بعد بند ہوچکا ہے، اس وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی شریعت ہی کی اتباع کریں گے، اور اپنے اجتہاد کے مطابق اس شریعت پر عمل فرمائیں گے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی کتابوں کے بارے میں

مکرمی حضرت مولانا زاد لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمداللہ زمزم پابندی سے مل رہا ہے، اوراس سے ہماری معلومات میں بیش قیمت اضافہ ہوا ہے، اگر ہمارے علماء احناف نے فتنہ غیر مقلدیت کی طرف سے پہلے توجہ کی ہوتی تو آج یہ فتنہ عالمی نہ بنتا، سوالات کے جوابات پڑھ کر مزہ آجاتا ہے، غیر مقلدین حضرات عوام کو ورغلانے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ حضرت امام اعظم کی کوئی تصنیف نہیں ہے، کیا یہ سچ ہے؟ براہ کرم اس کی طرف توجہ فرمائیں۔ والسلام

عزیز الحق میرٹھی 9/4/2007

زمزم ! برادرم آپ کا خط بڑا طویل تھا، کسی کی تعریف میں مبالغہ کرنا مناسب نہیں ہے، زمزم سے آپ کو یا دوسروں کو جو فائدہ ہورہا ہے اس پر بھی خدا کا شکرادا کرتا ہوں ،اورآپ سے واقعی عرض کرتا ہوں کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ سب اکابر کی ہی تحقیقات ہوتی ہیں، میں صرف ان کا ناقل ہوتا ہوں، اس لئے میرا کوئی کارنامہ نہیں ہے، میں نے آپ کے خط کومختصر کردیا ہے۔

رہا آپ کے سوال کا جواب تو اس پر محققانہ گفتگو مولانا عبدالرشید نعمانی نے اپنی مایہ ناز کتاب ماتمس الیہ الحاجۃ عربی اورابن ماجہ اورعلم حدیث اردو میں کی

ہے، اسی طرح مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی نے اپنی بے نظیر کتاب ''امام اعظم اور علم حدیث'' میں کی ہے، اگر یہ کتابیں آپ کو کہیں سے دستیاب ہو جائیں تو اس کا ضرور مطالعہ کرلیں۔

کسی دور میں بھی کتاب کا لکھنا صاحب کمال ہونے کی دلیل نہیں رہا ہے، دیکھئے صحابۂ کرام میں کسی کی کوئی تصنیف ہے؟ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود۔ حضرت زید بن ثابت، حضرت معاذ بن جبل وغیرہ صحابہ کرام کا علم حدیث وفقہ میں جو مقام ہے اس کا کون انکار کرسکتا ہے، مگر ان کی کتابیں اگر آپ تلاش کریں گے تو ان کا وجود نہیں ملے گا۔ امام زہری، امام شعبی، امام مکحول، امام ابراہیم نخعی اور ان کے علاوہ بہت سے وہ بزرگ حضرات ہیں جن کا حدیثی وفقہی مقام اتنا بلند ہے کہ اس کی طرف نظر نہیں اٹھائی جاسکتی، مگر کیا آج دنیا کے کسی کتب خانہ میں ان کی کتابوں کا کوئی وجود ہے؟

کتابوں کے لکھنے لکھانے کا کام تو زور وشور سے دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا ہے، ورنہ اس سے پہلے عام طور پر زبانی احادیث کے بیان کرنے کا رواج تھا، اور اساتذہ کے شاگرد اپنی یادداشت کے لئے کبھی اپنے شیوخ سے جو سنتے اس کو سفینہ میں محفوظ کرلیتے اور پھر وہ کتابیں جو اصلاً شیوخ کا سرمایہ ہوتیں، ان کے شاگردوں کی طرف منسوب ہوجاتیں۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کم از کم چالیس ہزار احادیث کا سرمایہ تھا، انھیں میں سے ان کے شاگردوں نے جو احادیث کا مجموعہ مرتب کیا، وہ آج ہمارے سامنے ''کتاب الآثار'' کے نام سے موجود ہے، اس میں سب سے مشہور نسخہ حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، دوسرا نسخہ حضرت امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اور تیسرا نسخہ حضرت امام زفرؒ کا ہے، چوتھا نسخہ حضرت حسن بن زیاد کا ہے، یہ چاروں نسخے اور احادیث کے مجموعے اگرچہ منسوب حضرت امام اعظم کے شاگردوں کی طرف ہیں مگر اس میں جو روایتیں ہیں وہ حضرت امام ابوحنیفہ کی ہیں، حضرت امام اعظم کے زمانہ میں تصنیف

وتالیف کا وہ طریقہ رائج نہیں تھا جس کا مشاہدہ ہم آج کرتے ہیں یا جو دوسری صدی کے بعد رائج ہوا۔

کتاب الآثار للامام محمد کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

والموجود من حدیث ابی حنیفة مفرداً انما هو کتاب الآثار التی رواها محمد بن حسن۔(تعجیل المنفعة،ص: ۹)

یعنی حضرت امام ابوحنیفہ کی جو احادیث موجود ہیں وہ کتاب الآثار میں ہیں جن کو امام ابوحنیفہ سے امام محمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت امام ابویوسف والے نسخے کے متعلق شیخ ابوزہرہ لکھتے ہیں:

''یہ کتاب علمی طور پر تین وجہ سے قیمتی ہے۔اول یہ کہ امام ابوحنیفہ کی مرویات کا ذخیرہ ہے، اور اس کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف نے استخراج مسائل میں احادیث کو کیسے دلائل کے طور پر استعمال کیا ہے۔دوم یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ امام موصوف کے یہاں مواقع استدلال میں فتاویٰ صحابہ اور احادیث مرسلہ کا کیا مقام تھا۔ سوم یہ کہ اسی کتاب کے ذریعہ تابعین فقہائے کوفہ کے خصوصاً اور فقہائے عراق کے عموماً فتاویٰ تک ہماری رسائی ہوجاتی ہے۔(امام اعظم اور علم حدیث،ص: ۳۵۵)(ابوحنیفہ ،ص: ۲۰۰)

حضرت امام زفر والے نسخہ کو مشہور امام محمد بن نصر مروزی نے اپنی کتاب ''قیام اللیل'' میں امام ابوحنیفہ کی کتاب کہا ہے، اس سے ان کی مراد یہی ہے اس کتاب کو حضرت امام زفر نے امام سے روایت کیا ہے، محمد بن نصر کے الفاظ یہ ہیں: **زعم النعمان فی کتابه**، یعنی امام ابوحنیفہ نے اپنی کتاب میں یہ کہا ہے۔(ایضاً)

امام حسن بن زیاد کی کتاب الآثار کا ذکر حافظ ابن حجر نے **لسان المیزان** میں محمد بن ابراہیم بن جیش بغوی کے حالات میں کیا ہے۔(ایضاً،ص: ۳۵۷)

عبدالعزیز الدراوردی فرماتے ہیں:

کان مالک ینظر فی کتب ابی حنیفه وینتفع بها۔یعنی امام مالک

حضرت امام ابوحنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے نفع اٹھاتے تھے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو امام ابوحنیفہ کی کتاب نہیں، کتابوں سے اپنے زمانہ میں فائدہ اٹھائیں اور ان سے نفع حاصل کریں، اور آج کے اصحاب خرد فرمائیں کہ امام ابوحنیفہ کی کوئی کتاب نہیں تھی۔

تبییض الصحیفہ میں حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ کے مناقب میں سے جن میں ان کا کوئی شریک نہیں، یہ ہے کہ وہی مسائل شرعیہ کے سب سے پہلے مدوّن اور مرتب ہیں، ان مسائل شرعیہ کو الگ باب میں ذکر کرنے کا کارنامہ سب سے پہلے حضرت امام ابوحنیفہ نے انجام دیا ہے، پھر ان کی اتباع امام مالک نے کی ہے۔(ایضاً، ص:۲۶)

آپ غور فرمائیں کہ ان مسائل شرعیہ کی ترتیب کہاں ہوئی ہوگی، جس جگہ ہوئی ہوگی اسی کو عرف عام میں کتاب کہتے ہیں۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا فرمان عام طور پر مناقب کی کتابوں میں نظر آتا ہے کہ:

من لم ینظر فی کتب ابی حنیفه لم یتبحر فی الفقه ۔یعنی جو امام ابوحنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرے گا فقہ میں وہ ماہر نہیں ہو سکے گا۔

تو یہاں کتب ابی حنیفه سے کیا مراد ہے؟ اگر امام شافعی کے پاس حضرت امام اعظم کی کتابیں نہ ہوتیں تو ان کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا؟ یہاں بھی حضرت امام شافعی امام کی ایک کتاب کا نہیں بلکہ کتابوں کا ذکر کر رہے ہیں، اور ہمارے کرم فرما لوگ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی کوئی کتاب ہی نہیں تھی۔

امیر المومنین فی الحدیث حضرت سفیان ثوری جو امام شافعی سے مقدم ہیں اور حضرت امام ابوحنیفہ کے معاصر ہیں، ان کے بارے میں علی بن مسہر کا بیان ہے کہ امام سفیان میرے پاس عشاء کے بعد آئے اور مجھ سے امام اعظم کی کتابیں عاریۃً لے گئے۔

(تذکرۃ الحفاظ، ج:۲، ص:۱۹۳)

ہمارے مہربان لوگ بتلائیں کہ اگر امام ابوحنیفہ کی کتابیں نہیں تھیں تو یہ سفیان ثوری علی بن مسہر سے عاریۃً کیا لے گئے تھے۔

تاریخ الخلفاء ص: ۲۶۳ میں حافظ سیوطی کتب حدیث وفقہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: وصنف ابو حنیفة الفقه والرای، یعنی حضرت امام ابوحنیفہ نے فقہ اور قیاس میں کتابیں تصنیف کیں، کیا اس بیان سے معلوم نہیں ہوتا کہ امام ابوحنیفہ صاحبِ تصانیف تھے۔

فقہ کے موضوع پر حضرت امام اعظم کی قدیم ترین املائی کتاب ''کتاب السیر'' ہے، اسی کا رد امام اوزاعی نے لکھا تھا، جس کا جواب الرد علی سیر الاوزاعی کے نام سے امام ابوحنیفہ کے قابل ترین شاگرد امام ابو یوسف نے لکھا، یہ کتاب مصر سے شائع شدہ ہے۔ (امام اعظم اور علم حدیث، ص: ۴۱۹)

☆☆☆☆☆

کیا کسی نبی یا ولی کی قبر کے پاس دعا کرنا شرک ہے؟

محترم حضرت مولانا محمد ابوبکر صاحب غازی پوری صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

خدا آپ کو اچھا رکھے، آپ کی کتابوں سے اور زمزم سے ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ ہمارے یہاں سلفیت کا بہت زور ہے، بہت سے نوجوان جو سعودیہ برائے ملازمت گئے ہیں، وہ جب واپس آتے ہیں تو سلفیت کی بیماری پالے ہوئے ہوتے ہیں، ان سے لوگ متاثر ہوجاتے ہیں، ہم ان کا علاج آپ کی کتابوں اور زمزم سے کرتے ہیں۔ الحمد للہ بہت سے لوگ تائب بھی ہوئے ہیں۔ کیا ابن تیمیہؒ اہل سنت ہیں، اس رسالہ نے زبردست دھماکہ کردیا ہے اور سلفیوں کو دم مارنا مشکل ہورہا ہے۔

ایک سوال جس کا فوری جواب بذریعہ زمزم مطلوب ہے، وہ یہ کہ کسی ولی یا نبی کی قبر کے پاس دعا کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس جگہ کی برکت سے دعا قبول ہوگی۔ یہ امر جائز ہے کہ ناجائز؟ سلفی لوگ اس عمل کو شرک بتلاتے ہیں اور اس بارے میں حضور ﷺ کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں: اللھم لاتجعل قبری وثناً ، ولاتتخذوا قبری عیداً

محمد سجاد قاسمی، دربھنگہ، بہار

زمزم ! برادرم اگر زمزم سے کچھ لوگوں کو فائدہ پہونچ رہا ہے تو نہ اس میں میرے قلم کا کمال ہے نہ میری ذات کا، جب اللہ کسی کے لئے سعادت مقدر فرماتا ہے تو

کہیں سے بھی اس کے اسباب مہیا فرما دیتے ہیں، یہ ان کے لئے تائید الٰہی اور توفیق ربانی ہوتی ہے۔ بارگاہِ رب العزت میں اپنے لئے ہم سب کو ہدایت کی دعا ہر وقت مانگتے رہنا چاہئے۔

موجودہ دور کی جو سلفیت ہے وہ حق سے انحراف کی بدترین مثال ہے، سلفیت کے پردہ میں گمراہی کا پرچار، احادیث رسول کے معنی و مفہوم کی تحریف، اسلاف کے عمل وطریق کا انکار آج کی سلفیت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اللہ ان کے شروفساد سے امت مسلمہ کو محفوظ رکھے۔

میں واللہ العظیم کانپ جاتا ہوں جب سلفیوں کے منہ سے بڑے دھڑلے سے یہ سنتا ہوں کہ حضور ﷺ کی قبر پاک کے پاس دعا کرنا اور اس جگہ سے برکت حاصل کرنا شرک ہے، میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ ایک مسلمان جس کے دل میں واقعی ایمان ہو، یہ بات اپنے منہ سے کیسے نکالے گا۔

صحابہ کرام کے زمانے سے لے کر آج تک ہر زمانہ میں مسلمانوں نے دعا کی قبولیت کے لئے قبر مبارک علیٰ صاحبہ الصلوۃ والسلام کو دعا کرنے کی مبارک ترین جگہ سمجھا ہے، اور سارے اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ کا روضہ مبارک عرش سے بھی مکانیت کے اعتبار سے افضل واعلیٰ ہے، اور دعا کی قبولیت میں جگہ کے مبارک ہونے یا نہ مبارک ہونے کا بڑا اثر ہوتا ہے، مسجد میں دعا کرنا اور بازار میں دعا کرنا دونوں برابر درجہ کی چیز نہیں ہے، مسجد کی برکت سے دعا کی قبولیت میں بازار کی دعا کے مقابلہ میں بہت فرق ہے۔ حضور ﷺ نے مسجد کو سب سے بہتر جگہ قرار دیا ہے، اور بازار کو بدترین جگہ قرار دیا ہے، تو کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ دعا کرنے کے لئے دونوں جگہیں برابر ہیں۔

عام جگہوں اور عام مساجد کے اعتبار سے کعبۃ اللہ میں دعا کرنا دعا کی قبولیت میں اور حصول برکت میں زیادہ تاثیر رکھتا ہے، پھر کعبۃ اللہ میں بھی مقام ابراہیم کے پاس دعا کرنا، ملتزم کے پاس دعا کرنا، حجر اسود کے پاس دعا کرنا، میزاب رحمت کے پاس دعا کرنا، اجابت دعا میں ان جگہوں کی جو تاثیر ہے وہ بیت اللہ شریف کی دوسری جگہوں کے

مقابلہ میں زیادہ ہے، اس کا انکار تو شاید سلفی لوگ بھی نہ کریں، اس سے معلوم ہوا کہ دعاؤں کی قبولیت میں جگہوں کا بھی بہت دخل ہوا کرتا ہے، تو جو جگہ اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے مطابق عرش سے بھی افضل ہے اس جگہ پر دعا کرنا کیوں نہیں افضل ترین عمل ہوگا؟ اور ہمارا بلکہ تمام اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں تو اس جگہ کی روحانیت کا ہم کیا اندازہ کر سکتے ہیں جہاں حضور خود حیات جسدی کے ساتھ تشریف فرما ہوں۔ حضور ﷺ کے تشریف فرما ہونے کی جگہ کے برکات وخیرات کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پس بلاشبہ آپ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس دعا کرنا بہترین عمل ہے، نہایت بابرکت عمل ہے، اور دعا کی قبولیت میں اس کا بہت زیادہ اثر ہے، جو لوگ اس عمل کو شرک، بدعت اور گمراہی قرار دیتے ہیں وہ خدا کی مخلوق میں بدترین لوگ ہیں، ان کے قلوب مسخ ہو چکے ہیں، ایمان کا نور ان سے رخصت ہو چکا ہے۔

حضرت امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث تھے، فرماتے ہیں کہ **البقاع المبارکة یستجاب عندها الدعاء** یعنی مبارک جگہوں کے پاس دعا قبول ہوتی ہے، پھر فرماتے ہیں **کما ان الدعاء فی السحر مرجو** (سیر اعلام النبلاء، ج:۸، ص:۸۹) یعنی جس طرح سحر کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔ امام ذہبی کا مطلب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت میں مکان کا بھی دخل ہوتا ہے، اور زمان کا بھی دخل ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی قبر مبارک کی جگہ سے مبارک جگہ غیر مقلدین اور سلفیین بتلائیں کہ کون سی ہے؟ تو اس پاک جگہ پر جو دعا کی جائے گی وہ کیوں قبول نہ ہوگی، اور اس پاک اور متبرک ومقدس جگہ پر دعا کرنا کیوں حرام اور شرک ہوگا۔

ابن المقری، طبرانی اور ابوالشیخ یہ تینوں جلیل القدر محدث ہیں، آج کے غیر مقلدین وسلفیین سے زیادہ حدیث کو جاننے والے اور شریعت کے احکام سے زیادہ واقف تھے، ایک دفعہ یہ تینوں محدثین کرام حدیث کی طلب میں مدینہ پاک میں مقیم تھے، ان کے پاس جو کھانے پینے کا سامان تھا ختم ہو گیا، بازار سے کچھ خریدنے کے لئے پیسے بھی نہیں باقی بچے، فاقہ کی نوبت آ گئی۔ ابن المقری کہتے ہیں کہ جب عشاء کا وقت ہوا تو ہم

لوگ حضور ﷺ کی قبر شریف کے پاس گئے اور میں نے کہا یا رسول اللہ الجوع، اے اللہ کے رسول ہم بھوکے ہیں۔ طبرانی نے مجھ سے کہا میں تو یہیں بیٹھ رہوں گا، اب موت آئے یا روزی کھانے کو ملے، میں یہاں سے ٹلنے والا نہیں۔ طبرانی تو حضور ﷺ کی قبر کے پاس روزی حاصل کرنے کے لئے یا مرنے کے لئے بیٹھ گئے، اور ابن المقری اور ابوالشیخ حضور ﷺ کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کر کے قیام گاہ چلے آئے۔ ابن المقری کہتے ہیں کہ تھوڑی ہی دیر میں سیّد خاندان کا ایک آدمی آیا جس کے پیچھے دو غلام دو بڑے جھولے لئے ہوئے تھے، اس میں کھانے پینے کا بہت سارا سامان تھا، اور اس نے کہا کہ تم لوگوں نے حضور سے بھوک کی شکایت کی ہے، میں نے آپ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ مجھے حکم دے رہے ہیں میں تم لوگوں کے پاس کھانے پینے کا سامان پہونچاؤں۔

یہ قصہ کوئی گپ نہیں ہے، اس کو امام ذہبی نے اپنی مشہور کتاب تذکرۃ الحفاظ میں ذکر کیا ہے۔ اب اگر غیر مقلدین اور وقت حاضر کے سلفیین کی بات مانیں تو یہ تینوں جلیل القدر محدثین اور ائمہ حدیث مشرک قرار پائیں گے۔

اس طرح کے واقعات کتابوں میں بہت ہیں، غیر مقلدین کس کو کس کو کافر ومشرک بنائیں گے، ان حضرات پر توحید کا نشہ ایسا چڑھا رہتا ہے کہ جب تک یہ لوگ تمام مسلمانوں کو مشرک نہ بنالیں ان کا توحیدی نشہ اترتا نہیں ہے۔

آپ غور فرمائیں قرآن میں جس کو مقام ابراہیم کہا گیا ہے، وہ کیا ہے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم پاک کا نشان ہی تو ہے، جس کو قدرتِ الٰہی نے عجیب وغریب ڈھنگ سے پتھر پر ثبت کر دیا ہے، اور قرآن نے اسے اللہ کی نشانی بتلایا ہے، وہ جگہ اور وہ نشانِ قدم تو حضور ﷺ کی نگاہ پاک میں ایسا متبرک اور مقدس پایا کہ آپ ﷺ نے حاجیوں کے لئے اور عمرہ کرنے والوں کے لئے طواف کے بعد اس جگہ پر دو رکعت نماز پڑھنے کو مشروع قرار دیا، اور وہ جگہ حضور ﷺ کی نظر مبارک میں دعا کے قبول ہونے کی جگہ قرار پائی، حالانکہ وہ جگہ نہ ابراہیم علیہ السلام کی جگہ ہے نہ ان کا وہاں قدم مبارک ہے بلکہ پتھر پر جما ہوا صرف ان کے قدم کا نشان ہے، لیکن حضور ﷺ اس جگہ کو

اور اس پتھر کے نشانِ قدم کو متبرک سمجھ رہے ہیں، اور وہاں صرف دعا کرنے کو نہیں بلکہ نماز پڑھنے کو مشروع قرار دے رہے ہیں، تو اب وہ جگہ کس قدر بابرکت اور کس قدر مقدس اور کس قدر فیض رساں ہوگی جہاں سیّد الرسل وامام الانبیاء ﷺ کی ذات گرامی بحالتِ حیاۃ موجود ہے، اور اس جگہ پر دعا کرنا کتنا بابرکت عمل ہوگا، اور قبولیت دعا میں اس کی تاثیر کا کیا عالم ہوگا، مگر ان باتوں کو وہ سمجھے گا جس کو خدا نے فہم وفراست اور تفقہ اور دل کی بینائی اور ایمان کی حرارت اور محبت رسول کی دولت عطا کی ہو، یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی جو دو چار حدیث کو رٹ رٹا کر اہلحدیث بننے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

غیر مقلدین حضرات کا حضور ﷺ کی قبر پاک کے پاس دعا کرنے کو شرک ومعصیت اور خلافِ شرع قرار دینے کے لئے وہ حدیث جو آپ نے ذکر کی ہے، یعنی **اللھم لاتجعل قبری وثناً** ۔یعنی اے اللہ میری قبر کو توبت نہ بنا جس کی عبادت کی جائے۔ پیش کرنا انتہا درجہ کی سفاہت اور حماقت اور حدیث پاک کی معنوی تحریف ہے۔ اس حدیث پاک میں دور دور اس کا نشان نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی قبر پاک کے پاس دعا کرنا حرام ہے، آپ ذرا خود اس حدیث کے ترجمہ ومعنی میں غور کریں، اس میں تو یہ بیان کیا جارہا ہے کہ حضور پاک کی قبر کو وثن یعنی بت بنا کر اس کی عبادت کرنا جس طرح مشرکین اپنے بتوں کی عبادت کرتے تھے یا جس طرح بنی اسرائیل میں کے کچھ لوگوں نے انبیاء کی قبروں کو معبود بنا کر اس کی تعظیم اس طرح کرتے تھے جس طرح اللہ کی تعظیم کی جاتی ہے، یہ حرام ہے۔ ان قبروں کو انھوں نے واقعی معبود بنالیا تھا اس وجہ سے اس کو سجدہ بھی کرتے تھے، ان کے نام کی نذر بھی مانگتے تھے، ان پر چڑھاوا بھی چڑھاتے تھے، ان قبروں کو نفع ونقصان کا مالک بھی سمجھتے تھے، جیسا کہ مشرکین کا معاملہ اپنے بتوں کے ساتھ تھا، اس طرح کا معاملہ کسی بھی قبر کے ساتھ کرنا حرام ہے، اور اس کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

لیکن حضور ﷺ کی قبر کے پاس جو دعا کرتا ہے وہ نہ تو حضور کو معبود بناتا ہے نہ آپ کی قبر کو معبود بناتا ہے، نہ اس کے ذہن میں یہ تصور کھٹکتا ہے کہ آپ کی قبر معاذ اللہ مستحق عبادت ہے، جو حاجت روا اور مشکل کشا اور خدائی صفات والی ہے، وہ تو مانگتا اللہ

سے ہے، حضور ﷺ سے تو مانگتا بھی نہیں، ہاں اس جگہ کو برکت کی جگہ اور قبولیت دعا کی جگہ سمجھتا ہے۔ جس طرح مقام ابراہیم کو برکت اور قبولیت دعا کی جگہ سمجھا جاتا ہے، اور یہی اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے، آپ کی قبر پاک کی جگہ کو جو مبارک اور مقدس جگہ نہ سمجھے اور وہاں دعا کرنے کو ایسا سمجھے جیسے کسی بت کے پاس دعا کی جارہی ہے، تو وہ بلاشبہ بے ایمان ہے، زندیق ہے، توہین رسول کا مرتکب ہے، واجب القتل ہے۔

آپ نے جو دوسری حدیث لکھی ہے یعنی **لاتتخذوا قبری عیداً** جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میری قبر کو عیدمت بناؤ۔ اس کا بھی حضور ﷺ کی قبر مبارک کے پاس دعا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ذرا غور کریں کہ حضور فرماتے ہیں کہ تم لوگ میری قبر کو عیدمت بناؤ، مسلمانوں کا عمل یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کی قبر کے پاس دعا کرنے کو افضل ترین عمل شمار کرتے ہیں۔

آپ ﷺ کے ارشاد پاک اور مسلمانوں کے عمل کیا تعلق اور جوڑ ہے، اس حدیث میں مسلمانوں کے اس عمل سے کہاں نہی وارد ہوئی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد کیا ہے اور مسلمانوں کا عمل اور عقیدہ کیا ہے، ان دونوں میں دور دور کا بھی کوئی جوڑ نہیں ہے کہ اس حدیث کو مسلمانوں کے عمل پر فٹ کر کے حضور ﷺ کی قبر پاک کے پاس دعا کرنے کو حرام بتلایا جائے۔

میں نے عرض کیا ان غیر مقلدین اور سلفیوں کا بڑا مرض یہ ہے کہ دو چار حدیث رٹ لی اور پھر ان کا معنی اور مفہوم سمجھے بغیر مسلمانوں پر کفر و شرک کے گولے داغنے شروع کردیئے۔

احمد رضا خاں بیچارہ مرگیا، زندہ رہتا تو خوش ہوتا کہ تشریک وتکفیر کے میدان کے تنہا ہم ہی نہیں شہ سوار ہیں بلکہ اس میدان کے مجاہدین اور بھی ہیں، جن کا آلۂ تکفیر وتشریک ہماری شمشیر سے بھی تیز ہے۔

آیئے میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس حدیث پاک کا مطلب کیا ہے، اور غیر مقلدین اس کی معنوی تحریف کر کے کہاں لے جارہے ہیں۔

حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ میری قبر کو عید نہ بناؤ، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عید کا دن لہو ولعب اور تماشا کا ہوتا ہے میری قبر کو لہو ولعب اور تماشا کی جگہ نہ بناؤ، میری قبر کی جگہ تماشا کی جگہ نہیں ہے بلکہ اس جگہ پر حاضری انتہائی احترام اور انتہائی عقیدت کے ساتھ ہونی چاہئے، قلب کی غفلت کے ساتھ نہیں بلکہ قلب کے استحضار کے ساتھ ہونی چاہئے۔ بتلایئے کہ اس معنی کو قبر کے پاس دعا کرنے سے ممانعت کے معنی سے کیا تعلق ہے؟ رہا یہ کہ ہمنے جو معنی بیان کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط، تو دنیائے علم حدیث کی مشہور و مسلم شخصیت ملک المحدثین علامہ محمد طاہر پٹنی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''**مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار**'' میں یہی معنی بیان کیا ہے، اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

لاتجعلوا قبری عیداً، ای لاتجعلوا زیارة قبری عیداً، او قبری مظهر عیدٍ ای لاتجتمعوا لزیارته اجتماعکم للعید فانه یوم لهو وسرور وحال الزیارة بخلافه، یعنی حضور ﷺ کے قول **لاتجعلوا قبری عیداً** کا مطلب یہ ہے کہ میری قبر کو عید کے دن کی طرح زیارت مت بناؤ کہ جس طرح عید کے دن کھیل کود کا مظاہرہ ہوا کرتا ہے، تم میر قبر کو بھی کھیل کود کی جگہ بناؤ، ایسا نہ کرو، اس لئے کہ یہ کھیل کود اور خوشی کے اظہار کی جگہ نہیں، بلکہ یہ جگہ احترام وتقدیس کی جگہ ہے، اس لئے یہ عید والا تماشا کرنے سے بچو۔

دیکھئے! حضور پاک کی اس حدیث کا مطلب تو محدثین یہ بیان کرتے ہیں اور غیر مقلدین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ حضور کے روضہ کے پاس دعا مت کرو، ''مارو گھٹنا پھوٹے سر'' اسی کو کہتے ہیں۔ اس حدیث پاک میں تو اس کا اشارہ ہے کہ قبر پاک کی جگہ انتہائی مقدس ہے اس لئے انتہائی درجہ اس کا احترام کرنا ہے، وہاں کوئی ایسا عمل نہ ہو جو کھیل کود اور تماشا کے مشابہ ہو، جس سے قبر پاک کے احترام میں خلل پڑے، اور اس جگہ کی تعظیم کے منافی ہو۔

اس حدیث کا دوسرا مطلب ایک یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ملک المحدثین علامہ طاہر

پٹنی ہی فرماتے ہیں:

او هو اسم من الاعتياد من عاده واعتاده إذا صار عادة له واعتياده يؤدى الى سوء الادب وارتفاع الحشمة۔

یعنی اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ میری قبر کی زیارت کو تم لوگ عادت مت بناؤ، اس لئے کہ اس میں سوءادب کا امکان ہے، اور اس کا امکان ہے کہ اس کی تعظیم دل سے نکل جائے۔

یعنی جب انسان کسی بات کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کو عادت بنالیتا ہے تو اس چیز کی اہمیت گھٹ جاتی ہے، اور اس کی تقدیس و تعظیم میں کمی واقع ہو جاتی ہے، تو اگر آپ ﷺ کی قبر کی بھی بار بار زیارت کی جائے گی اور کثرت سے اس جگہ آنا جانا ہوگا تو دل میں اس کا وہ احترام باقی نہ رہے گا، جو کبھی کبھار کی زیارت کے وقت ہوتا ہے، اس وجہ سے آپ ﷺ نے اپنی قبر کی بار بار اور کثرت سے زیارت کرنے سے منع فرمایا تاکہ قبر کا احترام کم نہ ہو اور اس جگہ کی عظمت میں خلل نہ پڑے۔

اس دوسرے معنی کا بھی سلفیوں کے بیان کردہ معنی سے کوئی جوڑ نہیں ہے، اس دوسرے معنی کا بھی مطلب یہی نکلتا ہے کہ آپ کی قبر شریف انتہائی احترام و عظمت کی جگہ ہے، اس کا احترام پوری طرح سے باقی رہے، آدمی کو اس کا خیال رکھنا چاہئے۔

اور غیر مقلدین کہتے ہیں اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی قبر شریف کے پاس جا کر دعا نہ کرو، اس جہالت کا کچھ ٹھکانا ہے؟ اور اگر کوئی داد دینا چاہے تو غیر مقلدین کو کن الفاظ میں اس قابلیت پر داد دے؟

اس حدیث پاک کا اور بھی معنی ہو سکتا ہے، مگر کسی ایک معنی کا بھی تعلق اس سے ہرگز نہیں ہے کہ اس حدیث میں آپ ﷺ کی قبر شریف کے پاس دعا کرنے سے روکا گیا ہے، یہ معنی بیان کرنا صرف سلفیت کا کارنامہ ہے۔

بات یہ ہے کہ سلفیوں نے اپنی جہالت سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ متبرک مقامات پر دعا کرنا بھی شرک و بدعت ہے۔

اب ان کو کون سمجھائے کہ جو جگہ بھی حضور سے یا صحابہ کرام سے یا کسی نبی اللہ اور ولی اللہ سے نسبت رکھے گی وہ مقدس ومبارک ہوگی، اسی طرح سے جو چیز بھی کسی نبی کسی رسول کسی اللہ والے سے نسبت رکھے گی وہ مقدس ہوگی، اور ایسی تمام اشیاء اور مقامات کا احترام کرنا ایمان تقاضا ہے، اور اس ذات مقدس سے محبت وتعلق کی علامت ہے، اور ان اشیاء اور جگہوں کی معنوی تاثیر کا انکار کرنا جہالت اور زندقہ ہے، اور اسی جہالت وزندقہ میں دورِ حاضر کی سلفیت گرفتار ہے، اس لئے وہ حضور ﷺ کی قبر شریف کے پاس دعا کرنے کو ناجائز قرار دیتی ہے، اور اس کے لئے وہ احادیث پاک کے معانی بیان کرنے میں تحریف کرتی ہے۔

آپ پورے اطمینان کے ساتھ ان کے بڑے سے بڑے عالم کو چیلنج کر سکتے ہیں کہ کسی شارح حدیث نے، کسی معتبر ومستند فقیہ ومحدث نے ان دونوں حدیث پاک سے نبی پاک فداہ ابی وامی ﷺ کی قبر شریف کے پاس دعا کرنے کی حرمت کو ثابت کیا ہے تو وہ اس محدث اور اس فقیہ اور اس شارح حدیث کا نام لے، میں آپ کو پورے شرح صدر کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ سوائے ابن تیمیہ اور ابن تیمیہ کے دم چھلوں کے کسی بھی معتبر اہل سنت والجماعت کا نام وہ غیر مقلد نہیں لے سکتا۔

ایک بات خوب یاد رکھئے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمہم اللہ کی ذات یا ان سے منسوب جگہوں اور اشیاء سے توسل حصل کرنا اور چیز ہے، اور خود ان کی ذات کو نفع ونقصان کا مالک سمجھنا اور چیز ہے، پہلی چیز کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور دوسری چیز کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، غیر مقلدین کی جہالت یہ ہے کہ انھوں نے دو الگ الگ چیزوں کا حکم ایک کر دیا ہے۔ ہم اللہ کے رسول ﷺ کی قبر شریف کے دعا کرنے کو باعثِ اجابت وقبولیت سمجھتے ہیں، ہم حضور ﷺ کی ذات اقدس کو معبود کا درجہ ہرگز نہیں دیتے ہیں، نہ ہم اللہ کے نبی ﷺ میں خدائی صفات ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ والسلام

محمد ابوبکر غازی پوری

☆☆☆☆☆

علماء غیر مقلدین اور ضعیف حدیث

مکرمی حضرت مولانا دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاجِ اقدس بخیر ہوگا۔ زمزم کے شمارہ نمبر جلد نمبر۸ میں آپ کا مضمون محدثین نے اپنی کتابوں میں ضعیف حدیثیں کیوں ذکر کی ہیں، بڑا نظر کشا ہے، اس مضمون کو پڑھ کر ہماری معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔ ضعیف احادیث کے بارے میں ہم بہت غلط فہمی میں مبتلا تھے، ہمارا گمان اب تک یہ تھا کہ ضعیف احادیث پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، محدثین نے ان کا قطعاً اعتبار نہیں کیا ہے، اس مضمون سے ہماری غلط فہمیاں دور ہوگئیں، اور فقہ حنفی میں جن بعض مسائل میں ضعیف احادیث سے استدلال کیا گیا ہے اس کی وجہ بھی خوب سمجھ میں آگئی۔ بارک اللہ فی حیاتکم وطبتم بعافیۃ خیر

مولانائے محترم! برائے کرم ایک تحریر زمزم میں اس پر شائع کردیں کہ مذہب غیر مقلدین میں ضعیف احادیث کا اعتبار کیا گیا ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ ہماری یہ عاجزانہ درخواست قبول کی جائے گی۔ والسلام

عبد الرشید قاسمی، سنت کبیر نگر

زمزم! زمزم میں شائع شدہ جس مضمون کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس کے بارے میں عام طور پر لوگوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، بہت سے لوگوں کو جو آپ ہی کی طرح غلط فہمی کا شکار تھے ان کا اشکال دور ہوا، اور انھیں نئی باتیں معلوم ہوئیں۔

بات وہی ہے کہ اگر ضعیف احادیث کا مطلقاً انکار کیا جائے گا تو وضو میں بسم اللہ پڑھنا بھی سنت نہیں قرار پائے گا، اذان کا دینا بھی درست نہیں ہوگا، ثنا اور التحیات کس طرح سے پڑھی جائے اس کا علم بھی نہیں ہوگا، ان تمام مسائل میں مرفوع متصل صحیح حدیث کوئی نہیں ہے، جو حدیثیں ہیں وہ ضعیف ہیں یا موقوف اور مرسل آثار ہیں۔

رہا آپ کا یہ دریافت کرنا کہ غیر مقلدین کے مذہب میں ضعیف احادیث کا اعتبار کیا گیا ہے یا نہیں، تو غالباً آپ نے میرا مضمون جو زمزم میں شائع ہو چکا ہے، جس کا عنوان ہے ''صلوٰۃ الرسول پر ایک نظر'' نہیں پڑھا ہے، اب یہ مضمون مستقلاً رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہو گیا ہے، اس مضمون سے معلوم ہوگا کہ مولانا حکیم صادق سیالکوٹی نے نماز کے موضوع پر لکھی جانے والی اپنی کتاب میں تقریباً چوراسی ضعیف احادیث سے استدلال کیا ہے، اگر غیر مقلدین کے یہاں ضعیف احادیث پر عمل کرنا جائز نہ ہوتا تو ایک موضوع کی اس کتاب میں اتنی ضعیف حدیث وہ ذکر نہ کرتے۔

علماء غیر مقلدین کی عادت عوام کو ہمیشہ فریب میں مبتلا کرنے کی رہی ہے، اور ان کا پیمانہ اپنے لئے کچھ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے لئے کچھ اور ہوتا ہے، ان کی باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے، فقہ حنفی کے خلاف ہرنا کردنی کرنا ان کا ایمان ہے، اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے بارے میں غلط پروپیگنڈہ کرنا ان کا دھرم ہے۔

آپ صلوٰۃ الرسول کے علاوہ غیر مقلدین کی مسئلہ مسائل سے متعلق جو کتابیں بھی دیکھیں گے آپ کو اس میں ضعیف احادیث کا انبار نظر آئے گا، اور یہ حقیقت چمکتی نظر آئے گی کہ غیر مقلدین دینی وشرعی مسائل میں ضعیف احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

آپ کے اس استفسار کے جواب میں ہم دنیائے غیر مقلدیت کے بہت بڑے محدث اور عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کی مشہور زمانہ کتاب **تحفة الاحوذی شرح الجامع للامام الترمذی** سے کچھ مثالیں اس موضوع کے بارے میں پیش کریں گے، ان مثالوں سے آپ کو خوب اندازہ ہوگا کہ غیر مقلدین علماء کے یہاں ضعیف احادیث کا اعتبار ہے کہ نہیں۔

نمبروار مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱)　حضرت علیؓ کی حدیث ہے: **قال مفتاح الصلوٰۃ الطهور وتحريمها التكبير وتحليلها التسليم**، یعنی نماز کی کنجی وضو ہے، اور نماز میں بات چیت اور کھانے پینے حرام کرنے والی چیز اللہ اکبر کہنا ہے، اور ان چیزوں کو حلال کرنے والے چیز نماز کے بعد سلام پھیرنا ہے۔

اس کا ایک راوی عبداللہ بن محمد بن عقیل ہے، امام ترمذی فرماتے ہیں: **هو صدوق وقد تكلم فيه بعض اهل العلم**، یعنی صدوق ہے لیکن بعض محدثین نے اس میں کلام کیا ہے، اور محدثین کا ان کے بارے میں جو کلام ہے، ملاحظہ فرمائیں۔ ابوحاتم فرماتے ہیں کہ اس میں ضعف ہے، امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں **لا يحتج به** ان سے حجت نہیں پکڑی جاتی ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ اس کی حدیثوں سے بچنا ضروری ہے، حاکم کہتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک یہ مضبوط راوی نہیں ہے، امام ابوزرعہ نے بھی اس کو مجروح قرار دیا ہے، فسوی کہتے ہیں کہ اس کی حدث میں ضعف ہے اور وہ سچا ہے، بزار کہتے ہیں کہ یہ حدیث کسی اور سند سے نقل نہیں کی گئی ہے، ابونعیم کہتے ہیں کہ محمد بن عقیل اس حدیث کی روایت کرنے میں منفرد ہے، عقیلی فرماتے ہیں کہ اس سند میں ضعف ہے۔ (تحفہ، ج:۱، ص:۱۴)

غرض یہ حدیث جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اور جس پر محدثین نے مذکورہ بالا کلام کیا ہے، اس کے بارے میں مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں: **الراجح المعول هو حسن** یعنی راجح اور قابل اعتماد بات یہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔

اب دیکھئے کہ ایک حدیث جس پر محدثین کا سخت کلام ہے اور مولانا مبارکپوری صاحب بھی اعتراف کرتے ہیں، کہ ضعیف ہے، مگر چونکہ اس حدیث پر ان کو عمل کرنا ہے اس وجہ سے اس کو حسن بتلا رہے ہیں، اگر عمل نہ کرنا ہوتا تو یہ حدیث قابل احتجاج نہ ہوتی۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ احمد بن حنبل، اسحاق بن ابراہیم اور حمیدی بن محمد عقیل سے حجت پکڑتے تھے اور وہ مقارب الحدیث ہے۔ مولانا

مبارکپوری فرماتے تھے کہ یہ کلمہ الفاظ تعدیل میں سے ہے، مگر یہ نہیں بتلایا کہ اس کا درجہ تعدیل میں کیا ہے، اور جو جرحیں ان کے مقابل میں ہیں ان کلمہ کی تعدیل کے باب میں کیا قیمت ہوگی۔

بہر حال ہمیں عرض یہی کرنا ہے کہ کسی محدث پر سخت جرحیں ہوتی ہیں مگر اس کے باوجود بھی بعض دوسرے وجوہ کی بنا پر وہ حدیث قابل عمل ہوتی ہے۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ جو تم سے یہ کہے کہ آنحضور کھڑے ہوکر پیشاب کرتے تھے اس کی تصدیق مت کرو۔

مولانا مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا طریقہ بیٹھ کر پیشاب کرنے کا تھا، حالانکہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی شریک بن عبداللہ نخعی ہے، اس کے بارے میں مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں کہ اگرچہ وہ صدوق تھا مگر حدیث میں بہت غلطی کرتا تھا، اور جب وہ کوفہ کا قاضی ہوا تھا اس کا حافظہ بھی بہت خراب ہوگیا تھا۔ پھر حافظ ابن حجر سے نقل کرتے ہیں کہ اس بارے میں حضور ﷺ کی کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ **لم یثبت عن النبی ﷺ فی النھی عن البول قائماً شیٔ**۔ یعنی کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے منع کے بارے میں حضور ﷺ سے کوئی بات ثابت نہیں ہے۔(۱)

مولانا مبارکپوری صاحب نے اپنی کتاب ابکار المنن میں بہت سی روایتوں کو

---

(۱) امام ترمذی فرماتے کہ **ھذا الحدیث اصح شیٔ فی ھذا الباب واحسن** یعنی اس بارے میں یہی حدیث سب سے زیادہ صحیح اور اچھی ہے۔ مولانا مبارکپوری صاحب امام ترمذی کے اس کلام کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں **ای ھو اقل ضعفاً وارجح ما ورد فی ھذا الباب** (ج:۱،ص:۲۲) یعنی اس بارے میں جو دوسری حدیثیں آئی ہیں ان میں سب سے کم ضعف والی یہی حدیث ہے، اور یہی سب سے راجح ہے، یعنی اس باب کی ساری حدیثیں ضعیف ہیں، اور ان ضعیف احادیث میں سے یہ حدیث ضعف میں کم ہے، مگر بہر حال ہے یہ بھی حدیث ضعیف ہی، صحیح نہیں ہے، دوسری احادیث کو ملا کر اس کو حسن کہا گیا ہے، مگر سنداً اس حدیث کے ضعیف ہونے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ضعیف قرار دیا ہے، جن میں شریک قاضی موجود ہے(۱)

مگر یہاں مولانا فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنا حضور ﷺ کی عادتِ شریفہ نہیں تھی، یعنی اس مسئلہ میں مولانا نے بلاتکلف ضعیف حدیث سے استدلال کیا ہے۔

(۳) وضو میں بسم اللہ پڑھنے والی حدیث بقول امام ترمذی ضعیف ہے، امام ترمذی فرماتے ہیں: **لااعلم فی هذاالباب حدیثاً له اسناد جید** یعنی مجھے اس باب میں کسی ایسی حدیث کا علم نہیں ہے جس کی سند عمدہ ہو، اور یہی بات امام احمد سے بھی مروی ہے، اور بزار فرماتے ہیں کہ وضو میں بسم اللہ پڑھنے کی جتنی بھی حدیثیں ہیں ان میں کی ایک بھی قوی نہیں ہے۔ حافظ منذری فرماتے ہیں کہ اس باب کی حدیثیں تو بہت ہیں مگر کوئی حدیث بھی کلام سے خالی نہیں ہے۔

خود مبارکپوری صاحب صاف صاف لکھتے ہیں کہ سند کا راوی ابوثفال اور اس کا شیخ رباح بن عبد الرحمٰن مجہول ہیں، اس لئے یہ حدیث صحیح نہیں ہے، بخاری نے ابوثفال کے بارے میں لکھا ہے کہ "**فیه نظر**" اور بخاری جس کے بارے میں یہ لفظ استعمال کرتے ہیں اس کی حدیث متروک ہوتی ہے، پھر رباح اس کو اپنی دادی سے روایت کرتا ہے اور اس کی دادی کے بارے میں حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ مجہول عورت ہے یعنی پتہ نہیں وہ کون ہے۔

غرض وضو میں بسم اللہ پڑھنے والے جو حدیث امام ترمذی نے ذکر کی ہے وہ

(۱) مثال کے لئے دیکھو ص: ۱۴۲/۳۰۲/۳۴۱، جامعہ سلفیہ کا محقق ایڈیشن، اور جس روایت میں یہ راوی ہے اور وہ روایت حنفیہ کا کسی مسئلہ میں متدل ہے تو مولانا مبارکپوری صاحب اسی راوی کی وجہ سے اس کو حسن بھی نہیں قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ص: ۳۰۱ میں فرماتے ہیں: **قلت مداره علی شریک القاضی وان کان صدوقاً لکنه یخطی کثیراً وتغیر منذ ولی القضاء بالکوفة فکیف یکون اسناده حسناً**، یعنی میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کا مدار شریک قاضی پر ہے، وہ اگرچہ صدوق تھا مگر غلطی بہت کرتا تھا، اور جب وہ کوفہ کا قاضی ہوا تو اس کا حافظہ بھی خراب ہوگیا تھا، اس لئے اس حدیث کی اسناد حسن کیسے ہوگی۔

ضعیف ہے مگر مبارکپوری صاحب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس حدیث سے وضو میں بسم اللہ پڑھنے کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔(ج:۱،ص:۳۸)

اور اگر کوئی کہے کہ مبارکپوری صاحب نے اس باب کی دوسری احادیث کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے تو عرض ہے کہ اس باب کی کوئی ایک حدیث بھی تو صحیح نہیں ہے۔

(۴) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے **الاذنان من الراس** والی حدیث ذکر کی ہے یعنی دونوں کان بھی سر ہی کا حصہ ہیں، تو وضو میں سر کے ساتھ کان کا بھی مسح کیا جائے گا۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے، ابن عدی نے اس حدیث کو دو وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ ایک تو اس کی سند کا راوی شہر بن حوشب متکلم فیہ ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ حدیث مرسل ہے کہ مرفوع اس میں اختلاف ہے۔ امام ترمذی اس حدیث کی سند کے بارے میں فرماتے ہیں کہ **لیس اسناده بذاک القائم**، یعنی اس کی سند خوب اچھی نہیں ہے یعنی قوی نہیں ہے۔

بعض محدثین نے شہر بن حوشب کی تعدیل بھی کی ہے مگر اس سے انکار نہیں کہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث اور بعض دوسری وجوہ سے بہت زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے، مگر مولانا مبارکپوری کے نزدیک یہ حدیث قابل احتجاج ہے، **فیمسحان معه وهو القول الراجح المعول عليه** (ج:۱،ص:۴۸) یعنی دونوں کانوں کا مسح سر کے ساتھ کیا جائے گا، یہ راجح اور قابل اعتماد بات ہے۔

(۵) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے جس حاصل یہ ہے کہ وضو کے بعد پیشاب کے مقام والے حصہ پر پانی کا چھینٹا مار لینا چاہئے تا کہ پیشاب کے قطرہ کے شبہ اور وسوسہ کا ازالہ ہو۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے، اور امام بخاری سے نقل کرتے ہیں کہ اس کا راوی حسن بن علی ہاشمی منکر الحدیث ہے۔ امام بخاری کے نزدیک ''منکر الحدیث'' شدید جرح ہے، امام ذہبی فرماتے ہیں کہ حسین بن علی کو امام احمد نسائی، امام احمد اور دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے، اور امام بخاری نے اس کو منکر الحدیث

کہا ہے۔ مولانا مبارکپوری شرح نخبہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب کسی راوی کے بارے میں متروک یا ساقط یا فاحش الغلط یا منکر الحدیث کہا جائے تو یہ جرح ضعیف یا لیس بقوی کہنے سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ خود مبارکپوری صاحب کو اعتراف ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، فرماتے ہیں: **فحديث الباب ضعيف**، یعنی باب کی حدیث ضعیف ہے۔ مگر پھر بھی یہ حدیث ان کے نزدیک بے اصل نہیں ہے، قابل عمل ہے۔ (ج:۱،ص:۵۰)

(۶) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے **باب المنديل بعد الوضو** یعنی وضو کے بعد رومال کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ کے تحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ آنحضور ﷺ کے پاس کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا جس سے آپ وضو کے بعد اعضاء پوچھ لیا کرتے تھے۔

مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وضو کے بعد رومال وغیرہ سے اعضاء کو خشک کرنا جائز ہے، حالانکہ خود فرماتے ہیں کہ لکنہ حدیث ضعیف یعنی یہ حدیث ضعیف ہے۔

اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ **لا يصح عن النبی** ﷺ **فی هذا الباب شئ**، یعنی اس بارے میں حضور ﷺ سے کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔

(۷) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے: **باب كراهية الاسراف فی الوضو** یعنی وضو میں پانی کا زیادہ استعمال کرنا مکروہ ہے، اور اس کے تحت حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند قوی نہیں ہے، پھر فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ سے اس بارے میں ایک بھی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے۔ حضرت اُبی بن کعب کی سند میں خارجہ نامی جو راوی ہے محدثین کے نزدیک ضعیف ہے، عبداللہ بن مبارک نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، خارجہ کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ متروک ہے، اور جھوٹوں سے تدلیس کیا کرتا تھا، یعنی جھوٹے راویوں کی روایت کو صحیح سند سے بیان کرتا تھا۔

اس کمزور اور متروک و مدلس راوی کی اس روایت کے بارے میں مولانا

مبارکپوری کا ارشاد ہے: **والحدیث یدل علیٰ کراھیة الاسراف فی الماء للوضوء** یعنی یہ حدیث دلیل ہے کہ وضو میں پانی کا زیادہ استعمال کرنا مکروہ ہے۔

نیز فرماتے ہیں کہ **وقد اجمع العلماء علی النھی عن الاسراف فی الماء ولو علیٰ شاطئ النھر** (ج:۱، ص:۶۱) یعنی علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وضو میں پانی زیادہ خرچ کرنا اگرچہ آدمی دریا کے کنارے پر ہی کیوں نہ وضو کر رہا ہو، ممنوع اور منہی عنہ ہے۔

(۸) مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں کہ: **قد وردت احادیث تحریم قرأة القرآن للجنب**، یعنی اس بارے بہت سی احادیث ہیں کہ جنبی کو قرآن کی تلاوت کرنا حرام ہے، پھر فرماتے ہیں: **وفی کلھا مقال**، یعنی ان میں سے کوئی حدیث صحیح نہیں ہے، مگر اپنا مذہب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **قلتُ قول اکثر اھل العلم ھو الراجح یدل علیه حدیث الباب**، یعنی اکثر اہل علم کا جو مذہب ہے کہ جنبی کو قرآن پڑھنا جائز نہیں ہے وہی راجح قول ہے، اس کی دلیل باب کی حدیث ہے۔ حالانکہ امام ترمذی نے جو حدیث ذکر کی وہ خود ضعیف ہے۔ (۳)

(۹) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ظہر کی نماز جلد پڑھنے کے بارے میں یہ حدیث ذکر کی ہے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے ظہر کی نماز میں حضور سے زیادہ جلدی کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی حکیم بن جبیر ہے، وہ

---

(۳) حضرت امام بخاری کے نزدیک حائضہ عورت اور جنبی آدمی قرآن کی تلاوت کر سکتا ہے، اس مسئلہ میں غیر مقلدین کے امام مولانا مبارکپوری صاحب نے امام بخاری کے مذہب کے خلاف اپنا مذہب بیان کیا ہے، امام بخاری کے بارے میں مولانا مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک باب باندھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک حائضہ وجنبی کو قرآن کی تلاوت کرنا جائز ہے (تحفہ، ج:۱، ص:۱۲۴) اب معلوم نہیں کون پکا اہلحدیث ہے، امام بخاری یا مولانا مبارکپوری؟ اور غیر مقلدین کی جماعت کس کی تقلید کرتی ہے، امام بخاری کی یا مولانا مبارکپوری کی؟ غیر مقلدین فرمائیں کہ کامل الاسلام کون ہے، امام بخاری یا مولانا مبارکپوری؟

شدید قسم کا مجروح راوی ہے، اس وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے۔ حکیم بن جبیر کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کا کلام ملاحظہ فرمائیں۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے اور منکر الحدیث ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ شعبہ اس کو مجروح قرار دیتے تھے۔ امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ قوی نہیں ہے۔ دار قطنی فرماتے ہیں کہ وہ متروک ہے۔ معاذ فرماتے ہیں کہ میں نے شعبہ سے کہا کہ مجھ سے حکیم بن جبیر کی حدیث بیان کیجئے، تو انھوں نے کہا کہ اگر میں اس سے حدیث بیان کروں تو مجھے جہنم کا ڈر ہے۔ جوزانی نے کہا وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔ اس حدیث کی شرح میں مولانا مبارکپوری صاحب فرماتے ہیں: **فیہ دلیل علیٰ ان التعجیل بالظھر افضل**، یعنی اس حدیث میں دلیل ہے کہ ظہر کی نماز جلدی پڑھنا افضل ہے، (ج:۱،ص:۱۴۵)

(۱۰) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اذان ٹھہر ٹھہر کہنے کے بارے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے، پھر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا روایت کرنے والا صرف عبد المنعم صاحب السقا ہے، اور حدیث کی سند مجہول ہے، عبد المنعم کا شیخ یحییٰ بن مسلم مجہول راوی ہے، عبد المنعم کو دار قطنی نے ضعیف قرار دیا ہے، ابو حاتم نے منکر الحدیث کہا ہے، بلکہ **منکر الحدیث جداً** یعنی بہت زیادہ منکر الحدیث ہے، کہا ہے، اور یہ کہا ہے کہ اس سے حجت پکڑنا جائز نہیں ہے۔ بیہقی اور ابن عدی نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ کسی سند میں عبد المنعم صاحب السقاء کا ہونا اس حدیث کو ضعیف قرار دینے کے لئے کافی ہے، اور یہ حدیث جو اس درجہ ضعیف ہے، مبارکپوری صاحب کے نزدیک قابل اعتبار ہے، چنانچہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں: **حدیث الباب یدل علیٰ ان المؤذن یقول کل کلمۃ من کلمات الاذان بنفس واحدۃ** (ج:۱،ص:۱۷۵) یعنی باب کی حدیث بتلاتی ہے کہ مؤذن کلمات اذان میں سے ہر کلمہ کو ایک سانس میں کہے گا۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ رفع یدین کے بارے میں امام بخاری کا مذہب ان کے رسالہ جزء رفع یدین کی روشنی میں

امام المحدثین حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نماز میں رفع یدین کرنے کے بارے میں ایک مختصر سا رسالہ ہے جو عام طور پر جزء رفع یدین کے نام سے مشہور ہے۔ غیر مقلدین علماء امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس رسالہ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور ناواقف عوام کو اس دھوکہ میں مبتلا کرتے ہیں کہ امام بخاری مسئلہ رفع یدین میں ان کے ہمنوا ہیں، اور انھوں نے رفع یدین ثابت کرنے کے لئے مستقل ایک رسالہ ہی تصنیف کر دیا ہے۔

غیر مقلدین علماء کے بارے میں اس کا اظہار بطور افسوس کیا جارہا ہے کہ یہ عوام کو فریب میں مبتلا کرنے کیلئے نہایت بے شرمی سے کذب و خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں، حدیث کا نام لے کر فریب کرنا اور عوام کو صحیح معلومات نہ پہونچانا ان کا عام شیوہ ہے، اس کے لئے وہ ہر کام روا رکھتے ہیں جن سے علم و دیانت پناہ مانگتے ہیں، زمزم کے شماروں میں ہم نے اس کو بار بار بدلائل واضح کیا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس رسالہ کے سلسلہ میں بھی غیر مقلدین اہل علم کا یہی وطیرہ ہے کہ وہ اس کے بارے میں عوام کو صحیح بات نہیں بتلاتے ہیں کہ اس رسالہ سے امام بخاری کا مقصد کیا ہے، عام طور پر غیر مقلدین نماز میں تین جگہ رفع یدین کرتے ہیں، ان کی تمام کتابوں میں انھیں تین جگہوں میں رفع یدین پر زور دیا جاتا ہے، یعنی نماز کی

ابتداء میں، رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت۔ اب کچھ روز سے بعض غیر مقلدین ایک چوتھی جگہ بھی رفع یدین کے قائل ہو رہے ہیں، اور وہ ہے تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے وقت اگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہوتا کہ رفع یدین تین یا رچار جگہوں ہی پر مسنون ہے تو وہ اپنے اس رسالہ میں صرف انھیں احادیث کو ذکر کرتے جن سے نماز میں تین یا چار جگہوں پر رفع یدین کا ثبوت ہوتا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے اس رسالہ میں وہ حدیث بھی ذکر کی ہے جس سے ایک دفعہ یعنی ابتداء نماز میں رفع یدین ثابت ہوتا ہے، ..

....وہ حدیث

بھی ذکر کی ہے جس سے دو دفعہ رفع یدین ثابت ہوتا ہے، وہ حدیث بھی ذکر کی ہے جس سے تین دفعہ اور چار دفعہ بھی رفع یدین ثابت ہوتا ہے، اور وہ حدیث بھی ذکر کی ہے جس سے ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کا ثبوت ہوتا ہے، یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رفع یدین کے بارے میں وہ مذہب نہیں ہے جو غیر مقلدین کا ہے کہ نماز میں تین یا چار جگہوں ہی پر رفع یدین مسنون ہے، بقیہ جگہوں پر نہیں، بلکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب مطلق رفع یدین کی مسنونیت کا ہے، خواہ ایک مرتبہ ہو یا دو مرتبہ ہو، چار مرتبہ ہو یا ہر تکبیر کے ساتھ ہو، خواہ نماز میں ہو خواہ دعا میں ہو، قنوت میں ہو جنازہ میں ہو، قبر پر دعا کیلئے ہو یا قحط وغیرہ کے موقع پر ہو، رہا جہاں تک خاص نماز کا مسئلہ ہے تو ان کا مذہب یہ ہے کہ بہر حال نماز میں رفع یدین ہونا چاہئے بلا رفع یدین نماز مسنون طریقہ سے ادا نہ ہوگی، یہ ہے امام بخاری کا اس رسالہ کی تالیف کا میرے نزدیک **مقصود غیر مقلدین کی طرح امام بخاری کا یہ مذہب ہرگز نہیں ہے کہ صرف تین یا چار جگہوں پر رفع یدین کرنے ہی سے مسنون نماز کی ادائیگی ہوگی، اگر کسی نے ایک مرتبہ یا دو مرتبہ یا سجدوں سے اٹھتے ہوئے یا ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کیا تو اس کی نماز مسنون نہیں قرار پائے گی۔** (۱)

(۱) اگر کسی کو میری بات سے اختلاف ہو تو وہ امام بخاریؒ کی تصریح سے ثابت کرے کہ امام بخاری کا رفع یدین کے باب میں اصل مذہب کیا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس رسالہ جزءرفع یدین کا جس نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہوگا وہ ہماری اس بات کو تسلیم کرے گا کہ امام بخاری اور غیر مقلدین کے مذہب میں زمین وآسمان کا فرق ہے، اور غیر مقلدین کا یہ سراسر دھوکہ ہے کہ رفع یدین کے بارے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی وہی مذہب ہے جو غیر مقلدین زمانہ حاضر کا ہے، اگر کسی طرح حسن ظن سے کام لیا جائے تو پھر یہی کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری کا اس رسالہ کو غیر مقلدین علماء نے غائر نگاہ سے دیکھا ہی نہیں، اس وجہ سے امام بخاری کا اس رسالہ سے ان کا مقصد اور ان کا مذہب غیر مقلدین علماء سے مخفی رہا۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اور غیر مقلدین کا مذہب رفع یدین کے بارے میں الگ الگ ہے۔ امام بخاری مطلق رفع یدین کے قائل ہین جبکہ غیر مقلدین تین یا چار جگہوں پر رفع یدین کرتے ہیں، امام بخاری کا مذہب یہ ہے کہ صرف شروع نماز میں تکبیر کہتے وقت رفع یدین کرنے سے نماز مسنون ادا ہوگی جبکہ غیر مقلدین ایسی نماز کو غیر مسنون بتلاتے ہیں، امام بخاری فرماتے ہیں کہ سجدہ میں بھی رفع یدین مسنون ہے جبکہ اس کو غیر مقلدین غیر مسنون قرار دیتے ہیں، امام بخاری کا مذہب ہے کہ دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع یدین مسنون ہے، غیر مقلدین کا یہ مذہب نہیں ہے۔

ہمارے اس دعویٰ پر کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ مطلق رفع یدین کی مسنونیت کے قائل ہیں اور اپنے اس رسالہ میں یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں، مندرجہ ذیل دلائل ہیں۔

(۱) اس رسالہ میں پہلی روایت حضرت علیؓ کی ہے، اس میں چار جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

عن علی ابی طالب ان رسول اللہ ﷺ کان یرفع یدیہ إذا کبر للصلوٰۃ حذو منکبیہ وإذا أراد ان یرکع وإذا رفع راسہ من الرکوع وإذا قام من الرکعتین فعل مثل ذٰلک۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے لئے تکبیر کہتے وقت

اور رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرتے تھے، اور جب دو رکعت سے اٹھتے اپنے کندھوں کے برابر تک اپنے ہاتھ اٹھاتے تھے۔(۱)

(۲) اس رسالہ کی دوسری حدیث حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی ہے، اس میں صرف دو جگہ رفع یدین کا ذکر ہے یعنی تکبیر افتتاح کے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت، رکوع میں جاتے وقت رفع یدین کا ذکر نہیں ہے۔

عن سالم بن عبد الله عن ابيه قال رأيت رسول الله ﷺ يرفع يديه إذا كبر وإذا رفع راسه من الركوع ولا يرفع ذٰلك بين السجدتين .

سالم بن عبد اللہ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ (ﷺ) کو دیکھا ہے آپ جب تکبیر کہتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین کرتے اور دو سجدوں کے درمیان رفع یدین نہ کرتے۔

(۳) تیسری حدیث حضرت ابوحمید ساعدی کی ہے، جس میں چار جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۴) چوتھی حدیث بھی انھیں کی ہے، اور اسی طرح کی ہے۔

(۵) پانچویں حدیث بھی انھیں کی ہے۔ اس میں صرف دو جگہ رفع یدین کا ذکر ہے، ابتداء کے وقت اور رکوع میں جاتے وقت۔

عباس بن سهل قال اجتمع ابو حميد وابو سهيل وسهل بن سعد ومحمد بن مسلمه فذكروا صلوٰة رسول الله ﷺ فقال ابو حميد أنا اعلم بصلوٰة رسول الله ﷺ قام فكبر فرفع يديه ثم رفع يديه حين كبر للركوع

عباس بن سہل سے روایت ہے ابوحمید، ابو اسید، سہل بن سعد، محمد بن مسلمہ ایک جگہ جمع ہوئے، انھوں نے رسول اللہ کی نماز کا ذکر کیا، ابوحمید نے کہا کہ رسول اللہ کی

(۱) ہمارے نزدیک خط کشیدہ عبارت قابل غور ہے، یہ صحیح ترجمہ نہیں ہے مگر چونکہ یہ ترجمہ ایک غیر مقلد عالم کا ہے اس وجہ سے اسی کو باقی رکھا گیا ہے، آنے والی احادیث کے ترجمے انھیں غیر مقلد صاحب کے ہوں گے، ناظرین اس کا دھیان رکھیں۔

نماز کو تم سے زیادہ جانتا ہوں، وہ کھڑے ہوئے تکبیر کہی، رفع یدین کیا پھر جب رکوع کیلئے تکبیر کہی تو رفع یدین کیا۔(۱)

(۶) چھٹی روایت رفع یدین کے ذکر سے مطلق خاموش ہے۔

(۷) ساتویں روایت حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی ہے، جس میں صرف تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔ ابتداء کے وقت، رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت۔

(۸) آٹھویں روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے، جس میں صرف ایک جگہ رکوع میں جاتے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔

عن انس رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرفع یدیه عند الرکوع۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

(۹) نویں روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے، جس میں چار جگہ رفع یدین کا ذکر ہے، چوتھی جگہ دونوں سجدوں سے کھڑے ہوتے وقت کی ہے۔

عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان إذا قام الی الصلوٰۃ المکتوبة کبر ورفع یدیه حذو منکبیه وإذا أراد أن یرکع ویصنعه إذا رفع راسه من الرکوع ولایرفع یدیه فی شئ من صلوته وهو قاعد وإذا قام من الجسدتین رفع یدیه کذٰلک وکبر۔

عبید اللہ بن ابی رافع سے روایت ہے کہ علیؓ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فرض نماز کے لئے کھڑے ہوتے تکبیر کہتے اور اپنے کندھوں تک اٹھاتے، اور جب

---

(۱) ناظرین ملاحظہ فرمائیں، متعدد صحابہ کرام کی موجودگی میں وہ صحابی نماز پڑھا رہے ہیں جن کو یہ دعویٰ تھا کہ اس مجلس کے موجود صحابہ کرام میں وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں، انھوں نے صرف دو جگہ رفع یدین کر کے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا نقشہ کھینچا، اور موجود صحابہ کرام میں سے کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا کہ تمہاری نماز خلافِ سنت ہے۔

رکوع کا ارادہ کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے رفع یدین کرتے ،قعدہ کی حالت میں نماز کے کسی حصہ میں رفع یدین نہ کرتے اور جب دوسجدے کرکے کھڑے ہوتے تو رفع یدین کرتے اور تکبیر کہتے۔

(۱۰) دسویں حدیث حضرت وائل بن حجر کی ہے،جس میں تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۱۱) گیارہویں حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے،اس میں بھی تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۱۲) بارہویں حدیث بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے،اس میں سجدوں سے سر اٹھاتے قت اور سجدوں سے کھڑے ہوتے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔

عن العلاء انه سمع سالم بن عبد الله ان اباه كان إذا رفع راسه من السجود وإذا أراد ان يقوم رفع يديه۔

سالم بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ان کے والد سجدوں سے فارغ ہوکر اپنے سر کو اٹھاتے ،اور کھڑے ہونے کا ارادہ کرتے تو رفع یدین کرتے۔

(۱۳) تیرہویں حدیث بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے،جس میں چار جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۱۴) چودہویں حدیث بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے،جس میں اس کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر جب کسی کو رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرتے نہ دیکھتے تو اس کو کنکریاں مارتے۔اس میں صرف دوجگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۱۵) پندرہویں روایت میں صرف دوجگہ رفع یدین کا ذکر ہے،نماز کی ابتداء میں اور رکوع میں جاتے وقت۔

عن عطاء قال رأيت ابن عباس و ابن الزبير وأباسعيد وجابراً رضي الله عنهم كانوا يرفعون ايديهم إذا افتتحوا الصلوٰة وإذا ركعوا۔

عطاء سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ ،ابن زبیر،ابوسعید اور جابر کو دیکھا

ہے وہ رفع یدین کرتے تھے، جب نماز شروع کرتے اور رکوع کو جاتے تھے۔

(۱۶) سولھویں حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے، اس میں تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۱۷) سترہویں حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے، وہ بھی اسی طرح کی ہے۔

(۱۸) اٹھارہویں حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے، اس میں صرف دو جگہ رفع یدین کا ذکر ہے، ابتداء کے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت۔

عن ابی حمزة قال رأیت ابن عباس رضی اللہ عنہ یرفع یدیه حیث کبر وإذا رفع راسه من الرکوع۔

ابی حمزہ سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ میں نے ابن عباس کو دیکھا ہے کہ وہ رفع یدین کرتے جب تکبیر کہتے اور جب اپنا سر رکوع سے اٹھاتے۔

(۱۹) انیسویں حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے، وہ بھی اسی طرح کی ہے۔

(۲۰) بیسویں حدیث حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی ہے، اس میں صرف ایک جگہ یعنی رکوع سے پہلے رفع یدین کا ذکر ہے۔

علقمة بن وائل یحدث عن ابیه قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرفع یدیه قبل الرکوع۔

علقمہ بن وائل اپنے باپ کی طرف سے حدیث بیان کر رہے تھے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے پہلے رفع یدین کرتے تھے۔

(۲۱) اکیسویں حدیث ام الدرداء کی ہے جس میں جگہ کی تعیین کے بغیر مطلق رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۲۲) بائیسویں حدیث بھی انھیں کی ہے، جس میں تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۲۳) تئیسویں حدیث حضرت عبد اللہ بن عمر کی ہے، اس میں حالت رکوع میں رفع یدین کا ذکر ہے۔

عن محارب بن دثار رأیت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما رفع

يديه في الركوع۔

محارب بن دثار نے بیان کیا کہ میں نے ابن عمر کو دیکھا ہے کہ وہ رکوع میں رفع یدین کرتے تھے۔

(۲۴) چوبیسویں حدیث حضرت وائل بن حجر کی ہے، اس میں صرف دو جگہ رفع یدین کا ذکر ہے، یعنی ابتداء کے وقت اور رکوع میں جاتے وقت۔

عن وائل بن حجر رضي الله عنه انه صلىٰ مع النبي صلى الله عليه وسلم فلما كبر رفع يديه ولما أراد أن يركع رفع يديه۔

وائل بن حجر سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، پس جب تکبیر کہتے رفع یدین کرتے، اور جب رکوع کا ارادہ کرتے رفع یدین کرتے۔

اس کے بعد روایتیں وہ ہیں جن میں تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۲۵) امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ والی روایت بھی ذکر کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں۔

عن علقمة قال قال ابن مسعود رضي الله عنه ألا اصلی لكم صلوٰة رسول الله صلى الله عليه وسلم فصلىٰ فلم يرفع يديه إلا مرةً۔

علقمہ کہتے ہیں عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا میں تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں؟ پھر انھوں نے نماز پڑھی اور ایک دفعہ رفع یدین کیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بعض روایت میں **فلم يرفع يديه إلا مرةً** کے بعد **ثم لم يعد** کا لفظ بھی ہے، بخاری کو اس لفظ پر کلام ہے، مگر **الا مرة** (یعنی صرف ایک مرتبہ رفع یدین کیا) تک کی روایت پر ان کا کوئی کلام نہیں ہے، اس روایت سے صرف ایک مرتبہ ابتداء صلوٰۃ کے وقت رفع یدین کا ثبوت ہوتا ہے۔

(۲۶) امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر کی ایک روایت ذکر کی ہے جس میں پانچ جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

ان ابن عمر رضي الله عنه كان يكبر بيديه حين يستفتح وحين يركع

وحين يقول سمع الله لمن حمده وحين يرفع راسه من الركوع وحين يستوی قائماً ۔یعنی ابن عمرؓ رفع یدین کے ساتھ تکبیر کہہ کرنماز شروع کرتے اور جس وقت رکوع کرتے اور جب سمع الله لمن حمده کہتے اور جس وقت رکوع سے سر اٹھاتے اور جس وقت برابر کھڑے ہوجاتے۔

(۲۷) حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث میں صرف دوجگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔

عن ابی الزبير قال رأيت ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما حين قام الی الصلوٰة رفع يديه حتیٰ يحاذی باذ نيه وحين يرفع راسه من الركوع فاستوی قائماً فعل مثل ذٰلک ۔

ابوالزبیر نے بتایا کہ میں نے ابن عمرؓ کو دیکھا ہے جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے ہاتھ اپنے کانوں کے برابر تک اٹھاتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے سیدھے کھڑے ہوجاتے تو رفع یدین کرتے۔

(۲۸) حضرت عبداللہ بن عمر دو سجدوں سے اٹھتے تو رفع یدین کرتے۔

عن نافع ان عبد الله كان إذا استقبل الصلوٰة يرفع يديه وإذا ركع وإذا رفع راسه من الركوع وإذا قام من السجدتين كبر ورفع يديه۔

نافع نے بتایا کہ عبداللہ جب نماز کی طرف متوجہ ہوتے تو رفع یدین کرتے اور جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے اور جب دو سجدوں سے اٹھتے تو رفع یدین کرتے۔

(۲۹) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ آنحضور صرف دوجگہ رفع یدین کرتے۔

عن نافع عن ابن عمر ان رسول الله كان إذا كبر رفع يديه وإذا رفع راسه من الركوع ۔

ابن عمر نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب تکبیر کہتے رفع یدین کرتے اور جب اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تو رفع یدین کرتے۔

(۲۹) حضرت مالک بن الحویرث کو اس روایت میں بھی آنحضور ﷺ کا عمل صرف دو

جگہ رفع یدین کا مذکور ہے۔

عن مالک بن الحویرث ان النبی ﷺ کان إذا دخل فی الصلوٰۃ رفع یدیه الیٰ فروع اذنیه وإذا رفع راسه من الرکوع فعل مثله۔

مالک بن حویرث نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں داخل ہوتے تو اپنے ہاتھ کانوں کے اوپر کے حصے تک اٹھاتے اور جب اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تو اسی طرح رفع یدین کرتے۔

(۳۰) حضرت طاؤس حضرت عبداللہ بن عباس کا عمل نقل کرتے ہیں جس میں صرف دو جگہ رفع یدین کا ذکر ہے، نماز شروع کرتے وقت، اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت۔

عن طاؤس ان ابن عباس کان إذا قام الی الصلوٰۃ رفع یدیه حتی یحاذی اذنیه وإذا رفع راسه من الرکوع فعل مثل ذٰلک۔

طاؤس سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عباس جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے ہاتھ اپنے کانوں کے برابر کرتے، اور جب رکوع سے سر اٹھاتے اور سیدھے کھڑے ہو جاتے تو رفع یدین کرتے۔

(۳۱) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں بھی صرف دو جگہ کا ذکر ہے، ابتداء کے وقت اور رکوع کے وقت۔

عن ابی هریرة قال کان رسول الله ﷺ یرفع یدیه حذو منکبیه حین یکبر یفتتح الصلوٰۃ وحین یرکع۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے کندھوں تک رفع یدین کرتے تھے، جب نماز شروع کرتے تکبیر کہتے اور جب رکوع کو جاتے۔

(۳۲) حضرت عبداللہ بن عمر کا عمل یہ بھی تھا کہ صرف دو جگہ رفع یدین کرتے۔

عن نافع عن عبد الله بن عمر کان إذا افتتح الصلوٰۃ رفع یدیه حذو منکبیه وإذا رفع راسه من الرکوع۔

نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر جب نماز شروع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو

اپنے کندھوں کے برابر تک اٹھاتے، اور جب رکوع کرتے تو اسی طرح رفع یدین کرتے۔

(۳۳) امام بخاری فرماتے ہیں:

وکیع بن ربیع سے روایت کی ہے، اس نے کہا میں نے حسن، مجاہد، عطاء، طاؤس، قیس بن سعد اور حسن بن مسلم کو دیکھا ہے کہ وہ رفع یدین کرتے تھے جب رکوع کرتے اور جب سجدہ کرتے۔

یہ تمام حضرات تابعی ہیں اور ان کا عمل یہ تھا کہ یہ سجدہ کے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے، امام بخاری عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں کہ رکوع اور سجدہ میں رفع دیدین کرنا سنت ہے۔

(۳۴) امام بخاری عمر بن یونس سے نقل کرتے ہیں کہ عکرمہ بن عمار نے بیان کیا کہ میں نے القاسم، طاؤس، مکحول، عبداللہ بن دینار اور سالم کو دیکھا ہے، ان میں سے کوئی بھی نماز پڑھتا تو رفع یدین کرتا رکوع اور سجدہ کے وقت بھی۔

(۳۵) وکیع نے اعمش سے انھوں نے ابراہیم سے روایت کی ہے، ابراہیم کے پاس وائل بن حجر کی حدیث کا ذکر ہوا کہ رسول اللہ ﷺ رکوع اور سجدہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

(۳۶) حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں:

میں مدینہ میں آیا تاکہ رسول اللہ ﷺ کی نماز دیکھوں، پس آپ نے نماز شروع کی، تکبیر کہی اور رفع یدین کی، پھر جب اپنے سر کو اٹھایا رفع یدین کی (یعنی صرف دو جگہ)

(۳۷) حکم بن عتبہ نے بیان کیا میں نے طاؤس کو دیکھا ہے کہ وہ رفع یدین کرتے تھے جب تکبیر کہتے اور جب اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تھے۔ (یہاں بھی صرف دو جگہ کا ذکر ہے)

(۳۸) وکیع حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ رفع یدین کرتے تھے جب وہ رکوع کرتے اور سجدہ کرتے۔ (اس روایت میں سجدہ کے وقت بھی رفع یدین کا ذکر ہے)

(۳۹) حضرت انس ﷺ کی درج ذیل روایت میں دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔

عن یحییٰ بن ابی اسحٰق قال رأیتُ انس بن مالک یرفع یدیه بین السجدتین۔

یحیٰ بن اسحٰق نے بیان کیا کہ میں نے انس بن مالک کو دیکھا کہ وہ دو سجدوں کے درمیان رفع یدین کرتے تھے۔

(۴۰) اسی **جزء رفع یدین** میں حضرت مجاہد کا حضرت ابن عمرؓ کی نماز کے بارے میں یہ بیان بھی ہے۔

عن مجاهد قال مارأیتُ ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما یرفع یدیه إلا فی التکبیرة الاولیٰ۔

مجاہد سے روایت ہے انھوں نے کہا میں نے تکبیر اولیٰ کے سوا نماز کے کسی حصہ میں ابن عمر کو رفع یدین کرتے نہیں دیکھا۔(۱)

میں نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ **جزء رفع یدین** سے یہ چالیس حدیثیں نقل کی ہیں، جو شخص ان میں غور کرے گا تو اسے ماننا پڑے گا کہ امام بخاری کا مذہب رفع یدین کے بارے میں غیر مقلدوں والا نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک مطلقاً رفع یدین مسنون ہے اور نماز کے متعدد مواقع پر رفع یدین کرنا ثابت ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں جو تین اور چار جگہوں والی حدیث نقل کی ہے اس کی وجہ محض یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی جامع کیلئے جو سخت قیدیں

(۱) اس روایت پر امام بخاری کو کلام ہے، مگر ان کا یہ کلام ان کی شان جلالت سے فروتر ہے، فرماتے ہیں کہ جس نے یہ روایت مجاہد سے کی ہے اس کا حافظہ آخر میں متغیر ہو گیا تھا۔ اگر اسی قسم کی جرحوں سے احادیث کو رد کر دیا جائے تو بہت سی حدیثوں کو رد کرنا پڑے گا، اگر امام بخاری نے یہ ثابت کر دیا ہوتا کہ یہ روایت راوی کے حافظہ کے تغیر کے بعد کی ہے تو کوئی بات بھی تھی۔ محض اتنے سے کہ کسی کا حافظہ آخر عمر میں کمزور ہو جائے اس کی روایت کو رد کیا جانے لگے تو نہ معلوم کتنی روایت کو رد کرنا پڑے گا۔

لگائی ہیں ان قیدوں وشرائط پر یہی دونوں روایتیں پوری اتری ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امام بخاری کا یہی مذہب ہے، ورنہ جزء رفع یدین جو خاص مسئلہ رفع یدین کے بارے میں ان کی تالیف ہے، رفع یدین کے سلسلہ کی متعدد الانواع روایتیں لانے کا کوئی مقصد نہیں ہوگا، اگر امام بخاری کا یہی مقصد تھا کہ صرف تین یا چار جگہوں پر رفع یدین ثابت ہے تو ان کو صرف انھیں روایتوں کو ذکر کرنا چاہئے تھا جن سے صرف انھیں جگہوں پر رفع یدین ثابت ہوتا، مگر جب انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ رفع یدین کے سلسلہ کی ہر قسم کی احادیث کو بلا نقد وجرح نقل کیا ہے تو اس کا مطلب صاف یہی ہے کہ ان کے نزدیک مطلق رفع یدین مسنون ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ امام بخاری کو ان سے بھی اختلاف ہے جو صرف ایک جگہ رفع یدین کو تسلیم کرتے ہیں اور بقیہ جگہوں پر رفع یدین نہ کرنے کو بدعت کہتے ہیں، امام بخاری کا اختلاف اس خاص فکر سے ہے نہ کہ اس سے کہ ایک جگہ رفع یدین کرنا غیر مشروع وغیر مسنون ہے۔ دوسرے لفظوں میں امام بخاری کا مذہب یہ ہے کہ رفع یدین خواہ صرف ابتداء نماز میں کیا جائے، خواہ اس کے ساتھ صرف رکوع میں جاتے وت، خواہ رکوع سے سر اٹھائے ہوئے بھی، خواہ ابتداء والی رفع یدین کے ساتھ صرف رکوع سے سر اٹھاتے وقت خواہ اس کے ساتھ سمع اللہ لمن حمدہ کہتے وقت بھی، سجدہ میں جاتے وقت بھی، سجدوں سے سر اٹھاتے وقت بھی، دو رکعت پر کھڑے ہوتے وقت بھی، ہر تکبیر کے ساتھ بھی، بہر حال ابتداء نماز کے بعد ان تمام جگہوں پر جو رفع یدین کا عمل کرتا ہے یا ان میں سے کچھ جگہوں پر کرتا ہے اور کچھ جگہوں پر نہیں کرتا وہ کسی بدعت کا مرتکب نہیں ہے بلکہ آنحضور اکرم ﷺ اور اسلاف کا مختلف مواقع اور مختلف اوقات میں مختلف عمل رہا ہے، اس لئے جہاں جہاں اسلاف سے رفع یدین کا عمل ثابت ہے وہ خلاف سنت نہیں قرار پائے گا، جو لوگ اس کو بدعت قرار دیتے ہیں وہ خاطی ہیں۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ امام بخاری نے یہ رسالہ (جزء رفع یدین) مذہب حنفی کے خلاف تحریر نہیں کیا ہے بلکہ ان کے پیش نظر وہ لوگ ہیں جو مطلقا رفع یدین

کے منکر ہیں، ابتداء صلوٰۃ کے علاوہ دوسرے مواضع پر رفع یدین کرنے کو بدعت قرار دیتے ہیں، امام بخاری نے انھیں لوگوں کی غلطی واضح کرنے کیلئے اس رسالہ کی تالیف فرمائی ہے۔

مگر غیر مقلدین زمانہ اس رسالہ کو حنفیہ کے خلاف امام بخاری کی کاوش قرار دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس رسالہ کو ترجمہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں، اور پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ دیکھو امام بخاری جیسے محدث نے حنفیہ کے خلاف مسئلہ رفع یدین میں ایک مستقل رسالہ تصنیف کردیا ہے۔

میرا یہ دعویٰ کہ امام بخاری کا یہ رسالہ حنفیہ پیش نظر رکھ کر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ امام بخاری کا قلم ان گمراہ فرقوں یا اشخاص کے خلاف اٹھا ہے جو نماز میں رفع یدین کو بدعت کہتے تھے اس دعویٰ کا ثبوت خود امام بخاری کے اس رسالہ میں ہے، ناظرین امام بخاری کی اس عبارت میں غور فرمائیں۔

"قال البخاری من زعم ان رفع الایدی بدعة فقد طعن فی اصحاب النبی ﷺ والسلف ومن بعدھم۔

یعنی امام بخاری فرماتے ہیں کہ جس کا یہ دعویٰ ہے کہ رفع یدین کرنا بدعت ہے تو اس نے نبی اکرم ﷺ کے صحابہ اور ان کے بعد کے سلف کے بارے میں زبان طعن دراز کی ہے۔

امام بخاری کی یہ عبارت چیخ چیخ کر یہ پکار رہی ہے کہ امام بخاری کا یہ رسالہ ان کے خلاف ہے جو مطلقاً رفع ید کو بدعت قرار دیتے ہیں، اور یہ بات کسی مستند و معتبر حنفی امام وفقیہ کے بارے میں نہیں ثابت کی جاسکتی کہ معاذ اللہ رفع یدین کرنے کو وہ بدعت قرار دیتا ہو، اس لئے امام بخاری کا یہ رسالہ مذہب حنفی کے خلاف نہیں ہے۔

امام بخاری کا یہ رسالہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں کوئی گروہ ایسا رہا ہے جس کا مذہب یہی تھا کہ ہاتھ کا اٹھانا نماز وغیر نماز میں بدعت ہے، یعنی اس کے نزدیک رفع یدین کے ساتھ کسی عبادت کا ثبوت تھا ہی نہیں، نہ نماز میں نہ استسقاء

میں نہ تکبیرات عیدین میں نہ جنازہ میں نہ دعا کے وقت، اور جو ان جگہوں پر رفع یدین کرتا اس کو یہ فرقہ بدعتی قرار دیتا۔ امام بخاری نے اسی فرقہ کے خلاف نعرہ بزن بولا ہے اور یہ رسالہ تصنیف کر کے ثابت کر دیا کہ عبادت میں رفع یدین کا ثبوت ہے، اور اس کو جو بدعت کہتا ہے وہ خود گمراہ ہے، امام بخاری نے اسی وجہ سے نماز میں رفع یدین کو متعدد جگہوں پر بطور خاص ثابت کرنے کے بعد ان احادیث کو بھی ذکر کیا ہے جس سے نماز کے علاوہ بھی رفع یدین کا ثبوت ہوتا ہے۔ مثلاً امام بخاری نے یہ ثابت کیا ہے کہ آنحضور نماز استقاء میں بھی رفع یدین کرتے تھے، **کان یرفع یدیه فی الاستسقاء**، اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ آنحضور دعاء میں بھی رفع یدین کرتے تھے، حضرت عائشہ کی روایت ہے:

انها رأت النبی ﷺ یدعو رافعاً یدیه۔

حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ آنحضور اکرم ﷺ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے قبیلہ دوس کیلئے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

استقبل رسول الله ﷺ القبلة وتهیا ورفع یدیه وقال اللهم اهدِ دوساً وأت بهم۔

رسول اللہ ﷺ قبلہ کی طرف متوجہ ہوئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر فرمایا، اے اللہ دوس کو ہدایت دے اور ان کو لے آ۔

حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں آپ ﷺ نے ایک مرے آدمی کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے اہل بقیع کیلئے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی (**فوقف فی ادنی البقیع ثم رفع یدیه**) آپ بقیع کے قریب کھڑے ہوئے پھر ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔

محمد بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ مجھے اس شخص نے خبر دی ہے جس نے رسول اللہ

ﷺ کو احجار الزیت کے پاس دعا کرتے دیکھا ہے کہ اپنی دونوں ہتھیلیاں پھیلا رکھی تھیں۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضرت عثمانؓ جب مکہ میں محصور ہوئے تو آپ ﷺ نے خوب ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔

قالت رأيتُ رسول الله ﷺ رافعاً يديه حتىٰ بدا ضبعاه يدعو فرد عثمان ﷛۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں رسول اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ دعا کیلئے اپنے ہاتھ کو اٹھائے ہوئے تھے حتیٰ کہ آپ کے بازو ننگے ہوگئے، پس عثمان لوٹ آئے۔

ولید کی بیوی نے آنحضور سے شکایت کی ہے کہ اس کا شوہر اس کو مارتا ہے تو آپ نے اس کے لئے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی۔

فرفع رسول الله ﷺ يده وقال اللهم عليک بالوليد۔

رسول اللہ نے ہاتھ اٹھایا اور فرمایا اے اللہ ولید کو پکڑ لے۔

قحط پر آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، امام بخاری نے بہت سی روایتیں نماز جنازہ میں ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہنے کی ذکر کی ہیں۔

اس رسالہ جزء رفع یدین میں یہ تمام روایتیں موجود ہیں، جن سے صاف معلوم ہو رہا ہے اور جیسا کہ امام بخاری کے کلام سے واضح ہے کہ ان کا یہ رسالہ اس گمراہ فرقہ کے رد میں ہے جو نماز یا دعا یا عبادت کے کسی اور موقع پر ہاتھ اٹھانے کو بدعت قرار دیتا ہے، نہ کہ معاذ اللہ حضرات احناف اور مذہب حنفی کے خلاف ان کا یہ رسالہ ہے۔

☆☆☆☆☆

امام بخاری کا رسالہ
"جزء القرأة خلف الامام"
پر ایک طائرانہ نظر

مکرمی حضرت مولانا غازی پوری صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

مزاج گرامی!

زمزم کا تازہ شمارہ جلد نمبر ۹، شمارہ نمبر ۳ نظر نواز ہوا، نیز ارمغان حق جلد دوم نے دیدۂ مشتاق کو آسودہ کیا، آپ کو اللہ نے تحریر کا جو سلیقہ دیا ہے اس پر رشک آتا ہے، مشکل مضامین کو ایسے انداز میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے، اور دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، ارمغان جلد دوم بھی پہلی جلد کی طرح اہم عنوانات پر مشتمل ہے، اور ہر مضمون قابل مطالعہ ہے۔

''امام ابوحنیفہ کے بارے میں محدثین کی جرحوں کی حقیقت'' والا مضمون بڑا اہم ہے، اس کو الگ سے شائع کر دیا جائے اور اس کا ترجمہ ہندی اور انگریزی میں بھی ہو جائے تو بہت نفع ہوگا، میرا یقین ہے کہ حضرت امام اعظم کی روح آپ کو دعا دیتی ہوگی، کتنے پیارے اور تحقیقی انداز میں امام رحمۃ اللہ علیہ پر جرحوں کی حقیقت کو آپ نے واضح کیا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا نام لے کر غیر مقلدین عوام کو امام اعظم کے بارے

میں جو بدگمان کرنے کا کارنامہ انجام دیتے ہیں، آپ کے اس مضمون سے ان کی کارستانیوں پر اللہ نے چاہا تو پانی پھر جائے گا۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ جزء قرأت خلف الامام کے نام سے ہے، یقیناً یہ رسالہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا، ہمیں اشتیاق ہے کہ اس رسالہ کے مشمولات اور ان کی حقیقت سے آپ قارئین زمزم کو آگاہ کریں، امید ہے کہ یہ درخواست درخور اعتناء ہوگی۔

والسلام

محمد شفیع انصاری، اعظم گڈھ

☆☆☆☆☆

امام اعظم پر جرحوں والا مضمون آپ کو پسند آیا، یہ آپ کی حق شناسی کی دلیل ہے، ورنہ یہی مضمون بعض اپنے ہی لوگوں کی نگاہ میں حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں صاحب مضمون کی جرأت بیجا قرار پایا۔ امام بخاریؒ کی ہر بات کو جوں کا توں مان لینا ہمارا ابھی مزاج بن گیا ہے، اب آپ نے مدیر زمزم کو مزید ایک امتحان میں ڈال دیا ہے، آپ کی یہ خواہش کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ'' **جزء القرأة خلف الامام** '' کے بارے میں مدیر زمزم کچھ اظہار خیال کرے، میرے لئے بڑی آزمائش ہے اور اندیشہ ہے کہ اس بارے میں میرا کچھ کہنا بہت سی طبائع نازک کے لئے جن کے دلوں میں امام بخاری کا بے انتہا احترام ہے اور جن کے نزدیک امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کسی طرح کی لب کشائی خطرناک جرم ہے، میری تحریر ان کے لئے ناقابل برداشت ہوگی۔

بہر حال اس رسالہ کے بارے میں میرا اجمالی تاثر یہ ہے کہ یہ رسالہ نہ بہت زیادہ تحقیقی ہے اور نہ امام بخاری کے مشہور فضل وکمال اور علم حدیث میں ان کی مہارت وامامت کے حسب حال ہے، اور نہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے جب یہ رسالہ تحریر فرمایا تھا تو وہ بہت پراگندہ ذہن اور پراگندہ خاطر

تھے، ان کی یہ پریشان خاطری و پراگندہ ذہنی پورے رسالہ میں جگہ جگہ عیاں ہے، امام بخاری کا قرأت خلف الامام کے بارے میں معروف مذہب یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے ہر نماز میں صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا، مگر پورا رسالہ پڑھنے کے بعد بھی امام بخاری کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کا صحیح مذہب اس بارے میں کیا ہے؟ مقتدی صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا یا سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی سورہ بھی ملائے گا، پھر وہ کب پڑھے گا، ثناء کے بعد امام کی سورہ فاتحہ سے پہلے یا امام کے ساتھ امام کی قرأت کی حالت میں، یا امام کے سکتات میں، صرف سرّی نماز میں پڑھے گا یا جہری نماز میں بھی پڑھے گا؟ آپ پورا رسالہ پڑھ جائیں، امام بخاری کا قرأۃ خلف الامام کے بارے میں مذہب واضح نہیں ہوتا ہے، صاف محسوس ہوتا ہے کہ امام بخاری نہایت پریشان خاطری کا شکار ہیں۔

پھر رسالہ کی ترتیب بھی بڑی بے ترتیب ہے، امام بخاری جن کو اپنا خصم سمجھے ہوئے ہیں یعنی جن حضرات کے یہاں امام کے پیچھے مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے، ان کا استدلال قرآن سے ہے، پھر احادیث سے ہے، پھر اقوال صحابہ وفتاوی صحابہ سے ہے، پھر اکابر تابعین کے آثار سے ہے۔ اب امام بخاری کو بھی اسی ترتیب سے اپنا رسالہ مرتب کرنا چاہئے تھا، مگر اس رسالہ میں امام بخاری نے کوئی ترتیب قائم نہیں کی ہے، بلکہ کیف مااتفق حدثنا، حدثنا کہتے چلے جاتے ہیں، بعض باتیں تو امام بخاری نے بڑی ہی بے تحقیق لکھی ہیں جو ان کے کمالات وفضائل کو مجروح کرتی ہیں، نیز امام بخاری نے اس رسالہ کی احادیث کی چھان پھٹک میں بھی اپنی معروف مہارتِ فن کا ثبوت نہیں دیا ہے، ضعیف احادیث اور مجروح راویوں سے بھی وہ سند لاتے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس رسالہ جزء قرأت خلف الامام کے بارے میں یہ میرا اجمالی تبصرہ ہے، اس اجمال کی اب تھوڑی سی تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اس رسالہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو سب سے پہلی حدیث ذکر کی ہے وہ یہ ہے:

(۱) عن اسحٰق بن راشد عن الزھری عن عبد اللہ بن ابی رافع مولیٰ

بني هاشم حدثه عن علي ابن ابي طالب ، إذالم يجهر الامام في الصلوات فاقرأ بام الكتاب وسورة اخرىٰ في الاوليين من الظهر والعصر وبفاتحة الكتاب في الاخريين من الظهر والعصر وفي الآخرة من المغرب وفي الاخريين من العشاء۔

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر امام نمازوں میں جہر نہ کرے (یعنی نماز سری ہو) تو تم (امام کے پیچھے) سورہ فاتحہ اور ایک اور کوئی سورت پڑھو، اور یہ ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں اور صرف سورہ فاتحہ پڑھو، اور ظہر اور عصر کی دوسری دو رکعتوں میں اور مغرب کی آخری رکعت میں اور عشاء کی آخری دو رکعتوں میں۔

یہ اس رسالہ کی پہلی روایت ہے، آپ اس روایت کے مضمون میں غور فرمائیں کہ کیا اس سے امام بخاری کے معروف مذہب کا پتہ چلتا ہے، امام بخاری کا معروف مذہب یہ ہے کہ مقتدی ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں امام کے پیچھے صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا کوئی دوسری سورہ نہیں ملائے گا، جبکہ حضرت علیؓ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱) امام کی جہری قرأت پر مقتدی خاموش رہے گا۔

(۲) جب امام سرّی نماز پڑھائے گا تو مقتدی ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ نہیں پڑھے گا بلکہ اس کے ساتھ کوئی دوسری سورۃ بھی ملائے گا۔

(۳) مقتدی ظہر اور عصر کی دو اخیر کی رکعتوں میں اور مغرب کی تیسری رکعت میں اور عشاء کی دو اخیر رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا۔

آپ غور فرمائیں کہ ان تینوں باتوں کو امام بخاری کے معروف مذہب سے کیا تعلق ہے۔

(۲) دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ امام بخاری کو اپنا رسالہ شروع کرنے کیلئے نہ قرآن پاک کی کوئی آیت ملی، نہ رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث نہ حضرت ابو بکر و حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان کا کوئی ارشاد ملا، چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک اثر ملا اور وہ بھی ایسا اثر جس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قرأت خلف الامام کے سلسلہ میں

معروف ومشہور مذہب معلوم بھی نہیں ہوتا ہے کہ، بلکہ اس سے ان کا معروف ومشہور مذہب مردود قرار پاتا ہے۔

(۳) اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ حضرت علی کا اثر بھی ائمہ محدثین کے نزدیک ناقابل اعتبار ہے، اس کی سند میں جو اسحٰق بن راشد راوی ہے اس کے بارے میں حضرت امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ **لا یحتج بحدیثه** یعنی اس کی حدیث لائق حجت نہیں ہوتی ہے (میزان، ج:۱،ص:۱۹۱)

اور حافظ ابن حجر تقریب میں فرماتے ہیں: **فی حدیثه عن الزهری بعض الوهم** (ص:۱۰۰) یعنی ان کی جو روایتیں امام زہری سے ہیں اس میں کچھ وہم ہوتا ہے، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہاں جو اثر نقل کیا ہے وہ بھی امام زہری سے ہی سے نقل کیا ہے۔

بہرحال اس رسالہ میں جو پہلی حدیث ہے اس کا حشر آپ نے معلوم کرلیا، اور میری اوپر کی گفتگو سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جو میں نے ابتداءً یہ عرض کیا تھا کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رسالہ نہ ترتیب کے لحاظ سے قابلِ لحاظ ہے نہ یہ کوئی بہت تحقیقی ہے، بلکہ امام بخاری کی پریشان خاطری اور پراگندہ ذہنی کا یہ رسالہ پتہ دیتا ہے، ہماری یہ بات صداقت سے بالکل خالی نہیں ہے۔

جب ہم حقائق کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں تو ہمارے بعض کرم فرما فرماتے ہیں کہ تم اپنی تحریر میں امام بخاری کی شان وعظمت کا لحاظ نہیں کرتے ہو، یعنی اب حقائق کا اظہار بھی جرم ہے۔

(۲) حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس رسالہ میں دوسری حدیث وہ ذکر کی ہے جو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی ہے، جو بہت مشہور ہے، جس کا مضمون یہ ہے:

”حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہے۔“

اس روایت کو امام بخاری نے پہلے تین سندوں سے ذکر کیا ہے، پھر اسی کو

حضرت معمر عن الزہری کی سند سے ذکر کیا ہے، جس میں **لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب فصاعداً** کا لفظ ہے، یعنی اس روایت میں **فصاعداً** کا لفظ بھی ہے جس کے ساتھ پوری روایت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اس شخص کی نما نہیں ہوتی ہے جو سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور نہ پڑھے، (چونکہ یہ صحیح روایت امام بخاری کے معروف مذہب کے خلاف ہے، اس لئے کہ ان کا مذہب تو یہ ہے کہ مقتدی صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا، سورہ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور نہیں ملائے گا. جبکہ حضرت عبادہ کی اس سند والی روایت میں حضور کا یہ فرمان ہے کہ قاری سورہ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور بھی ملائے ورنہ اس کی نماز نہیں ہوگی) تو حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کی زیادتی کو غلط ٹھہرانے کے درپے ہوگئے، فرماتے ہیں: **قولہ فصاعداً غیر معروف**، یعنی حضرت معمر کی روایت میں **لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب** کے ساتھ **فصاعداً** کا جو لفظ ہے وہ غیر معروف ہے، حضرت امام بخاری کی اس بات میں کتنی صداقت ہے اگر اس کے بیان کرنے کے درپے ہم ہوں تو خاصا وقت صرف ہوگا اور مضمون بہت طویل ہو جائے گا، اس لئے ہم صرف یہ عرض کریں گے کہ حضرت معمر ثقہ اور نہایت قابل اعتبار راوی ہیں، اور محدثین نے یہ اصول ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی ثقہ راوی کسی حدیث میں کوئی بات زیادہ بیان کرتا ہے تو اس کی وہ زیادتی قابل قبول ہے اس کو رد نہیں کیا جائے گا، ورنہ اس سے اس راوی کی ثقاہت مجروح ہو جائے گی اور وہ ثقہ باقی نہیں رہے گا، البتہ اتنی شرط ضرور ہے کہ اس کی وہ زیادہ مضمون والی روایت اس سے زیادہ ثقہ راویوں کی روایت کے خلاف نہ ہو۔

اب اس روایت میں آپ غور فرمائیں کہ حضرت معمر ثقہ راوی ہیں جو اس زیادتی کے ساتھ اس روایت کا ذکر کرتے ہیں، اور ان کی یہ زیادتی کسی ثقہ راوی کی روایت کے خلاف بھی نہیں ہے، فرق یہ ہے کہ دوسروں نے اس حدیث کو ناقص ذکر کیا تھا، حضرت معمر نے پوری حدیث ذکر کردی، ناقص کے مقابلہ میں پوری حدیث ذکر کرنے کو مخالفت نہیں کہا جاتا ہے، مخالفت کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ دونوں احادیث کے مضامین ایک دوسرے کے ضد اور مخالف ہوں، اگر حضرت معمر کی حدیث میں یہ ہوتا کہ سورہ فاتحہ کے

بغیر ہی نماز ہو جائے گی تو یہ البتہ مخالفت ہوتی، مگر یہاں تو سورہ فاتحہ کے اثبات کے ساتھ مزید کچھ پڑھنے کا ذکر ہے، مزید پڑھنے والی بات بعض دوسرے محدثین نے نہیں ذکر کی ہے، مگران محدثین کے اس کو نہ ذکر کرنے کی وجہ سے اس کا حدیث کا حصہ نہ ہونا تو نہیں ثابت ہوتا ہے، محدثین کا یہ عام دستور ہے کہ وہ کبھی پوری حدیث ذکر کرتے ہیں اور کبھی اس کا ایک حصہ ذکر کرتے ہیں، اور امام بخاری کے یہاں خصوصاً صحیح بخاری میں یہ بات بہت عام ہے، جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے، اور یہی وجہ ہے کہ محدثین کو یہ قاعدہ بنانا پڑا کہ کوئی ثقہ راوی کسی زیادتی کو ذکر کرتا ہے تو وہ مقبول ہوگی، اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص جو سچا اور ثقہ ہے وہ کہتا ہے کہ آج فلاں مسجد میں فلاں سلفی امام صاحب نے نماز پڑھائی، ایک دوسرا شخص کہتا ہے کہ ان امام صاحب نے ننگے سر نماز پڑھائی، اور یہ بات کہنے والا بھی سچا ہے تو چونکہ اس کی یہ بات پہلے شخص کی بات کے خلاف نہیں ہے، نماز پڑھانے کا دونوں تذکرہ کررہے ہیں، فرق یہ ہے کہ پہلے نے پوری بات نقل نہیں کی تھی اور دوسرے نے پوری بات نقل کردی ہے، اس لئے اب اس دوسرے کی بات کو چونکہ وہ سچا اور قابل اعتبار ہے، رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ورنہ اس کی سچائی اور ثقاہت پر حرف آئے گا، حالانکہ اس کی سچائی مسلّم ہے، بالکل اسی طرح حضرت معمر نے پوری بات نقل کی ہے، اس وجہ سے ان کی بات کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

پھر امام بخاری کا یہ کہنا کہ فصاعداً کی زیادتی غیر معروف ہے، اس وجہ سے وہ نا قابل قبول ہے، حد درجہ تعجب خیز ہے۔ اس طرح کی باتوں سے احادیثِ رسول کے بارے میں تشکیک کا ذہن پیدا ہوتا ہے اور لوگوں میں انکارِ حدیث کا جذبہ پرورش پانے لگتا ہے، میں نے حد درجہ تعجب خیز اس لئے کہا ہے کہ کیا امام بخاری صرف انھیں حدیثوں کو قبول کریں گے جو معروف ہوں گی، اور جو احادیث غیر معروف ہوں گی اگر چہ واقع میں وہ حدیثِ رسول ہو امام بخاری اس کا انکار کریں گے؟ کیا کسی چیز کا غیر معروف ہونا اس بات کو لازم ہے کہ وہ موجود بھی نہ ہو، مکہ مکرمہ جتنا معروف لفظ ہے سعودیہ کا شہر الخبر اور بریدہ بھی اتنا ہی معروف ہے؟ اور کیا ان کا غیر معروف ہونا ان شہروں کے

وجود کی نفی کردے گا؟ اگر حضرت امام بخاری کا یہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو ہر غیر معروف کی نفی کرنی پڑے گی۔

پھر کیا ضروری ہے کہ جو چیز امام بخاری کے نزدیک غیر معروف ہو وہ دوسرے محدثین کے یہاں بھی غیر معروف ہو۔ حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ امام بخاری کے معاصر ہیں اور فن حدیث میں ان کے ہم پلہ ہیں، بس انیس بیس کا فرق ہے، ان کے نزدیک **فصاعداً** کا لفظ ایسا مشہور تھا کہ انھوں نے حضرت معمر کی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ مسلم شریف میں ذکر کیا ہے۔

اس حدیث کا مسلم شریف میں ہونا ہی اس کے قابل اعتبار ہونے کی دلیل ہے ، پس جن لوگوں نے حضرت عبادہ والی حدیث سے فصاعداً کا ٹکڑا حذف کردیا ہے قصور ان کا ہے کہ انھوں نے ناقص حدیث ذکر کی ہے، حضرت معمر نے پوری حدیث ذکر کر کے حضور ﷺ کی پوری بات امت تک پہونچانے کا کام انجام دیا ہے، حضرت معمر نے اس حدیث کو حضرت امام زہری سے نقل کیا ہے، اور محدثین فرماتے ہیں کہ امام زہری کے شاگردوں میں سے ان کی حدیث کے بارے میں امام معمر سب سے زیادہ ثبت ہیں۔ امام ذہبیؒ تذکرہ میں فرماتے ہیں: **هو من أثبت الناس في الزهري** یعنی امام معمر امام زہری کی حدیثوں کے بارے میں سب سے زیادہ قابل اعتبار ہیں، امام معمر کے حافظہ کا حال یہ تھا کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت قتادہ سے چودہ سال کی عمر میں جو حدیثیں سنی ہیں وہ میرے سینہ میں آج بھی اس طرح محفوظ ہیں **کأنه مکتوب في صدري** (تذکرہ) گویا کہ وہ میرے سینہ میں لکھی ہوئی ہیں۔

اب کتنی عجیب بات ہے کہ جو شخص حضرت زہری کے باب میں سب سے زیادہ قابل اعتبار ہو اس کی اس حدیث کو جو زہری سے نقل کرتا ہے غیر معروف کہہ کر رَد کردیا جائے، اور جو **أثبت في الزهري** نہ ہو ان کی زہری والی اسی حدیث کو قبول کیا جائے۔ امام بخاری الٹی گنگا بہانا چاہتے ہیں۔

بہر حال امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا معمر کی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کہ وہ

قابل قبول نہیں ہے، اس لئے کہ غیر معروف ہے اور اس کی کسی نے متابعت نہیں کی ہے، قطعاً واقعہ کے خلاف ہے۔ اس کا معروف ہونا تو اس طرح معلوم ہوگیا کہ حضرت امام مسلم نے اس کو اپنی مسلم شریف میں ذکر کیا ہے، اور رہا یہ کہ اس کا کوئی متابع نہیں ہے ،تو یہ بھی خلافِ تحقیق بات ہے۔ حضرت معمر کی متابعت حضرت سفیان بن عیینہ جیسا محدث کرتا ہے۔ حضرت ابن عیینہ کی حدیث ابوداؤد میں ملاحظہ کرلی جائے، نیز حضرت عبدالرحمٰن بن اسحٰق نے بھی اس زیادتی کو نقل کیا ہے۔ خود امام بخاری فرماتے ہیں: **ویقال ان عبد الرحمٰن بن اسحٰق تابع معمراً** ۔یعنی کہا یہ جاتا ہے کہ عبدالرحمٰن بن اسحٰق نے معمر کی متابعت کی ہے، اگرچہ امام بخاری نے حضرت اسحٰق کی حدیث کو کو یہ کہہ کر **ولا نعلم ان هٰذا من صحیح حدیثه أم لا** ،یعنی ہمیں پتہ نہیں ہے کہ یہ حدیث ان کی صحیح حدیثوں میں سے ہے یا نہیں، عبدالرحمٰن والی حدیث کو نا قابل اعتبار قرار دیا ہے، مگر اس مسئلہ میں امام بخاری کے ہمنوا امام بیہقی نے یہ کہہ کر کہ **وهو کما قال** یعنی امام بخاری کا یہ کہنا کہ عبدالرحمٰن بن اسحٰق نے معمر کی متابعت کی ہے، صحیح اور درست ہے، امام بخاری نے اس حدیث کے بارے میں جو شک پیدا کیا تھا اس کا ازالہ کردیا ہے، اور امام بیہقی نے تو حضرت معمر کے دو متابع اور بھی ذکر کئے ہیں اور وہ ہیں امام اوزاعی اور شعیب بن حمزہ، اور ان دونوں نے جو لا صلوٰۃ والی حدیث میں **فصاعداً** کی زیادتی ذکر کی ہے امام بیہقی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اتنا کہا کہ **کذا أتی بهذه الزیادة** یعنی اس زیادتی کو امام بیہقی تسلیم کرتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ حضرت معمر کی متابعت کرنے والے کئی جلیل القدر محدث ہوگئے، حضرت سفیان بن عیینہ، حضرت عبد الرحمٰن بن اسحٰق، حضرت امام اوزاعی اور حضرت شعیب بن حمزہ، اور یہ چاروں کے چاروں جلیل القدر محدث ہیں، اس واضح حقیقت کے باوجود حضرت امام بخاری کا یہ کہنا کہ اس زیادتی کو روایت کرنے والے صرف معمر ہیں اور ثقات محدثین ان کی متابعت نہیں کرتے انصاف سے کتنی بعید بات ہے، اگر یہ ثقات محدثین نہیں ہیں تو پھر دنیا میں ''ثقہ محدث'' صفت کا کوئی محدث نہیں ہوگا، اور خود امام بخاری کی ان تمام روایتوں سے دست کشی

اختیار کرنی ہوگی جن کی سندوں میں یہ ائمہ حدیث مذکور ہیں، ناظرین یہ جان کر حیران ہوں گے کہ امام معمر کی متابعت کرنے والے یہ چاروں وہ ہیں جن کی روایتوں سے امام بخاری کی کتاب صحیح بخاری بھری ہوئی ہے، اور جن کی روایتوں پر خود بخاری کو اعتماد ہے۔

ایک اور بات جو ہماری نگاہ میں حضرت معمر کو امام بخاری کے رد کرنے کی روش کو بے اعتبار کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امام بخاری نے اپنے اس رسالہ کی ابتداء حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جس حدیث سے کی ہے اس میں خود حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورہ بھی مقتدی پڑھے، اور امام بخاری اس رسالہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے ان کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ **ان لا صلوٰۃ إلا بفاتحۃ الکتاب و ما زاد** ، یعنی یہ کہ بلا سورہ فاتحہ اور کچھ مزید کے نماز نہیں ہوگی۔ اور اسی کچھ مزید کو **فصاعداً** سے حضرت معمر کی روایت میں ظاہر کیا گیا ہے، تو جب حضرت امام بخاری خود ایسی حدیثیں ذکر کر رہے ہیں اور ان پر کوئی کلام بھی نہیں کرتے جن میں سورہ فاتحہ پر زیادتی کو ذکر کیا گیا ہے تو اب حضرت معمر کی حدیث میں جو **فصاعدا** کا لفظ ہے اس کا انکار کرنا یہ محض زبردستی ہے، اور ایک مسلّم حقیقت کا انکار کرنا ہے، اور ثقہ محدثین کو بے اعتبار کرنے کی ناروا کوشش ہے۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رسالہ جب میں پڑھتا ہوا آگے بڑھتا ہوں تو میری حیرانی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے، اور امام بخاری کے بارے میں میرا حسن عقیدت شدید مجروح ہوتا ہے، ابھی آپ نے دیکھا کہ حضرت معمر کی حدیث میں جو **فصاعداً** کی زیادتی ہے اور جس کی متابعت بہت سے ائمہ حدیث نے کی ہے، اس پر تو امام بخاری کو کلام ہے، مگر امام بخاری محمد بن اسحٰق سے سند والی ایک حدیث ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ فرمار ہے تھے کہ ہر وہ نماز جس میں قرآن نہ پڑھا جائے وہ ناقص ہوتی ہے، اور پھر فرماتے ہیں کہ اس میں یزید بن ہارون نے بفاتحۃ الکتاب کا لفظ زیادہ کیا ہے، اس زیادتی کو وہ بسر وچشم قبول کرتے ہیں، حالانکہ یہاں تو محمد بن اسحٰق کی وجہ سے اصل حدیث ہی مخدوش ہے،

محدثین نے محمد بن اسحٰق پر جتنا کلام کیا ہے کم ہی محدثین ہوں گے جن پر اتنی جرحیں کی گئی ہوں، محمد بن اسحٰق پر محدثین کی ان جرحوں کو نقل کرنے میں کافی طوالت ہے، ان کے بارے میں جو عام اتفاقی بات ہے وہ یہ ہے کہ مغازی میں تو یہ حجت ہیں مگر حلال وحرام کے مسئلہ میں یہ نا قابل اعتبار راوی ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کے بارے میں محدثین کی جرحوں اور تعدیلوں کو نقل کر کے اپنا فیصلہ یہ سنایا ہے: **والذی تقرر علیه العمل ان ابن اسحٰق الیه المرجع فی المغازی والایام النبویة مع انه یشذ باشیاء وانه لیس بحجة فی الحلال والحرام**۔ (تذکرہ)

یعنی ابن اسحٰق مغازی اور غزوات میں مرجع ہیں، اور اس میں بھی وہ بہت سی شاذ چیزیں نقل کرتے ہیں، حلال وحرام میں وہ حجت نہیں ہیں۔

ابن اسحٰق کے بارے میں یہ انتہائی درجہ کا معتدل فیصلہ ہے، اور معتدل فیصلہ کا حاصل یہ ہے کہ ابن اسحٰق کی روایتیں حلال وحرام اور دینی وشرعی مسائل میں نا قابلِ قبول ہیں۔ مذہباً ابن اسحٰق قدری تھے، یعنی ان کا شمار اہل سنت والجماعت میں سے نہیں تھا، اور ابن اسحٰق کی ظاہری حالت یہ تھی کہ حافظ ابن عدی فرماتے ہیں کہ: **کان یلعب بالدیوک**، کہ یہ صاحب مرغ بازی بھی کرتے تھے۔ (تذکرہ)

بہر حال امام بخاری کی ابن اسحٰق کی سند سے جو حضرت عائشہ کی روایت ہے وہ محدثین کے فرمان کے مطابق نا قابل اعتبار ہے، مگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس کو اپنے اس رسالہ میں ذکر کرتے ہیں، اور چونکہ اصل روایت میں فاتحہ کا ذکر نہیں ہے، مطلق قرآن پڑھنے کا ذکر ہے جو امام بخاری کے مذہب کے خلاف ہے، اس لئے ان کو اس حدیث میں سورہ فاتحہ کا پیوند ڈھونڈنا پڑا، اور اس پیوند کو امام بخاری بے چوں چرا تسلیم کرتے ہیں، اس لئے کہ اس پیوند کے ساتھ ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث سے امام بخاری کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

ناظرین حیران ہوں گے کہ امام بخاری حضرت **معمر** کی حدیث جس میں **لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب** کے ساتھ **فصاعداً** کا لفظ مذکور ہے، اس کو تسلیم

کرنے سے کیوں گھبرا رہے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاری کا مذہب قرأت خلف الامام کے سلسلہ میں یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا، اور اس حدیث میں اللہ کے رسول سورہ فاتحہ کے ساتھ مزید کچھ پڑھنے کا حکم فرمارہے ہیں، اور یہ حکم مقتدی کا نہیں بلکہ امام اور منفرد کا ہے، یعنی اب اس حدیث عبادہ بن صامت کا تعلق منفرد اور امام سے ہوگا مقتدی سے نہیں، اور چونکہ حضرت عبادہ والی یہی حدیث ان لوگوں کے مذہب کے لئے سب سے قوی دلیل تھی جو مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنے کو واجب قرار دیتے ہیں، اور یہ اس شکل میں ہوگا جب پوری حدیث کو صرف **لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب** تک مانا جائے گا، اور اس میں سے **فصاعداً** کا کلمہ نکال دیا جائے گا، اس وجہ سے امام بخاری اور ان کے ہمنوا کا پورا زور اس پر صرف ہوتا ہے کہ حضرت معمر کی نے اس حدیث میں جو **فصاعدا** کا لفظ بھی ذکر کیا ہے اس کو غلط قرار دیا جائے، اور اس عمل کے لئے محدثین کے اصولوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی جاتی ہیں اور صحیح حدیث کو غلط ثابت کرنے پر پورا زور صرف کیا جاتا ہے، اس کی ابتداء امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، اور انھیں کا سہارا لے کر دوسرے بھی جن کا مذہب یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا اس صحیح حدیث سے جان چراتے ہیں۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون**

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ میں عمارہ بن میمون رحیب بن الشہید عن عطاء کے طریق سے ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ ذکر کی ہے:

وفی کل صلوٰۃ تقرأ فما اسمعنا النبی ﷺ اسمعناکم وما اخفیٰ علینا اخفینا کم۔ ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ ہر نماز میں قرأت کی جاتی ہے، پس جس نماز میں حضور ﷺ نے قرأت زور سے کی اور ہم کو سنایا ہم بھی ان نمازوں میں قرأت زور سے کرتے ہیں اور تم کو سناتے ہیں، اور جن نمازوں میں حضور ﷺ نے اپنی قرأت کو ہم سے مخفی رکھا ہم بھی تم سے اپنی قرأت کو مخفی رکھتے ہیں۔

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اس روایت کو امام بخاری اور ان کے ہمنواؤں کے مذہب سے کیا تعلق ہے، مگر چونکہ اس میں **وفی کل صلوٰۃ تقرأ** کا لفظ ہے، اس وجہ سے

امام بخاری نے اس سے یہ کشید کیا کہ مقتدی کی بھی نماز چونکہ نماز ہی ہے اس وجہ سے وہ بھی قرأت کرے گا، اور امام بخاری نے اس پر قطعاً دھیان نہیں دیا کہ پھر مقتدی کو جہری نماز میں جہراً قرأت کرنی ہوگی اور سرّی نماز میں سرّاً قرأت کرنی ہوگی، اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہؓ یہ فرماتے ہیں کہ حضور نے ہم کو جن نمازوں میں سنایا ہم بھی تم کو سناتے ہیں، یہ سنانا جہراً قرأت سے ہوگا نہ کہ سرّاً۔

حضرت امام بخاری نے اپنے اس رسالہ میں بہت سی ایسی روایتیں ذکر کی ہیں جن کا ان کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور جن میں مطلق قرأت کا ذکر ہے سورہ فاتحہ کا ان میں کوئی تذکرہ ہی نہیں، مگر امام بخاری بلا تکلف ان روایتوں کو ذکر کرتے جاتے ہیں، امام بخاری نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ آپ ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا أفي كل صلوٰة قرأة ، کیا ہر نماز میں قرأت ہے؟ تو آپ نے فرمایا نعم، ہاں ہر نماز میں قرأت ہے۔ اب اس روایت کا قرأت خلف الامام سے کیا تعلق ہے، مگر امام بخاری اس طرح کی روایتوں کو بھی ذکر کرتے ہیں اور زبردستی ان سے اپنے مذہب قرأت فاتحہ خلف الامام کی تائید حاصل کرتے ہیں۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب جیسا کہ معلوم ہے یہ ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے صرف سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، مگر وہ اپنے اس رسالہ میں ایسی روایتیں بھی لیتے ہیں جن سے سورہ فاتحہ کا صرف جواز ثابت ہوتا ہے، مثلاً اس روایت کو دیکھیں:

ابو عالیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مکہ میں پوچھا کہ کیا میں نماز میں قرأت کیا کروں؟ تو انھوں نے فرمایا: انی لاستحيي من رب هذا البيت أن أصلي صلوٰة لا أقرأ فيها ولو بام الكتاب ، یعنی میں اس گھر کے رب سے شرم کھاتا ہوں کہ کوئی نماز پڑھوں اور اس میں قرآن نہ پڑھوں اگر چہ سورہ فاتحہ کیوں نہ ہو۔

اس روایت سے نماز میں مطلق قرآن پڑھنے کا وجوب ثابت ہوتا ہے نہ کہ بطور خاص سورہ فاتحہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے، اور اس روایت میں یہ بھی نہیں ہے کہ یہ

پڑھنا مقتدی کے لئے ہے کہ امام کے لئے، کہ تنہا نماز پڑھنے والے کیلئے، مگر امام بخاری رحمہ اللہ اپنی فقاہت سے اس کو اپنے مذہب کی دلیل سمجھتے ہیں۔

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو بھی امام بخاری نے ذکر کیا ہے:

عن یحییٰ البکاء (۱) سئل ابن عمر عن القرأة خلف الامام فقال ما کانوا یرون باساً أن یقرأ بفاتحة الکتاب فی نفسه ۔یعنی یحییٰ البکاء فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے جو قرأت خلف الامام کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ لوگ اپنے جی میں سورہ فاتحہ پڑھنے میں کچھ حرج نہیں سمجھتے تھے۔

اس روایت سے کیا سورہ فاتحہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے؟ بلکہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر صحابہ کرام سورہ فاتحہ پڑھتے ہی نہیں تھے، اور اگر پڑھتے بھی تھے تو اس کو واجب نہیں سمجھتے، اس طرح کی روایتوں کو ذکر کر کے معلوم نہیں امام بخاری کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، مجھے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ امام بخاری کو صرف **حدثنا حدثنا** کہنے کا فن تو آتا تھا، مگر ان کو دین میں تفقہ سے کچھ زیادہ حصہ نہیں ملا تھا، جس کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکے کہ کون سی روایت ان کے مطلب کے لئے مفید ہے اور کون سی مضر اور کس روایت سے وجوب ثابت ہوتا ہے اور کون سی روایت اباحت اور جواز کو بتلاتی ہے، جو اتنی موٹی موٹی باتوں کا بھی احادیث سے پتہ نہیں چلا سکے اس کو دین میں فقاہت سے کیا نسبت، ایسے مجرد قسم کے محدثین کو دین کے معرکہ خیز مسائل میں دخل اندازی سے گریز کرنا چاہئے تھا۔

---

(۱) تعجب ہے کہ امام بخاری نے یحییٰ البکاء کی روایت کو کیسے قبول کیا؟ یہ شخص انتہائی درجہ کا ضعیف راوی ہے، ائمہ جرح و تعدیل اس کی روایتوں کو مردود قرار دیتے ہیں۔ ابو ذرعہ فرماتے ہیں کہ **لیس بقوی**۔ امام نسائی فرماتے ہیں: وہ **متروک الحدیث** ہے۔ دار قطنی فرماتے ہیں: **ضعیف**۔ ابن حبان فرماتے ہیں: اس سے حجت پکڑنا جائز نہیں۔ ابن معین فرماتے ہیں: وہ گنتی کے قابل نہیں ہے۔ دیکھو میزان الاعتدال، ج:۴، ص:۴۰۹ و تقریب لابن حجر، امام بخاری ایسے ضعیف و متروک راویوں کی روایت کا سہارا لیتے ہیں۔ **فسبحان اللہ ما اعظم شانه**

یادش بخیر! حضرت امام بخاری باایں قابلیت وتفقہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جب منہ آتے ہیں تو ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ جن صاحب کی فہم کا حال یہ ہو کہ ان کو اس کا بھی ادراک نہ ہو سکے کہ کون سی روایات ان کے مذہب کی مؤید ہیں اور کون سی روایتیں ان کے لئے مضر ہیں، کن روایتوں سے کسی چیز کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور کن روایتوں سے محض اباحت وجواز کا اثبات ہوتا ہے، ان کو حوصلہ ہوتا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کے خلاف جنبش قلم کریں اور اپنی زور آزمائی دکھلائیں اور وہ بھی بلاتحقیق اور خلاف واقعہ باتوں سے۔

اس رسالہ میں بھی امام بخاری نے امام ابوحنیفہ کو بخشا نہیں ہے، موقعہ ملا تو ان کو اپنے قلم کا نشانہ ضرور بنایا ہے، بلکہ بالقصد والارادہ انھوں نے اس کا موقع نکالا ہے، چنانچہ اپنے اس رسالہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''وقال بعض الناس يجزيه آية آية في الركعتين الاوليين بالفارسية ولايقرأ في الاخريين۔(ص:۷)
>
> یعنی بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ پہلی دونوں رکعتوں میں فارسی زبان میں ایک ایک آیت پڑھنا کافی، اور آخر کی دو رکعتوں میں کچھ نہ پڑھے۔

جب امام بخاری **بعض الناس** کہتے ہیں تو عموماً اس سے ان کی مراد حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ذات ہوتی ہے، بخاری کی یہ اصطلاح اہل علم میں بہت مشہور ہے، بخاری شریف میں یہی بعض الناس کہہ کر انھوں نے مذہب ابوحنیفہ اور امامؒ ابوحنیفہ پر ضربِ کاری لگانے کی کوشش کی ہے۔

یہاں بعض الناس سے مراد حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی ذات گرامی ہے، محشی نے حاشیہ میں امام ابوحنیفہ کے نام کی صراحت بھی کردی ہے، اس عبارت میں حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کی ہے، وہ بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ سے اس طرح کی کوئی

بات بسند صحیح یا غیر صحیح قطعاً ثابت نہیں ہے، اگر میری یہ بات غلط ہے تو کوئی بخاری کا حمایتی اٹھے اور سند صحیح سے امام ابوحنیفہ سے اس بات کو ثابت کرے۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی اسی طرح کی غیر ذمہ دارانہ باتوں میں سے ایک بات وہ ہے جس کو انھوں نے اپنے اسی رسالہ میں نقل کیا ہے۔

اہل علم کو معلوم ہے کہ حضرت علقمہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مخصوص ترین تلامذہ میں سے تھے اور ان کے علوم کے امین، فقہ وحدیث میں ان کا مقام معلوم کرنا ہو تو حافظ ذہبی کا تذکرہ دیکھو۔ امام ذہبی نے صحابہ کرام کے بعد کبار تابعین کا ذکر شروع کیا ہے تو پہلے نمبر پر ان کا ذکر کیا ہے، امام ذہبی فرماتے ہیں: کان فقیھا اماماً بارعاً طیب الصوت بالقرآن، ثبتاً فیما ینقل، صاحب خیر وورعٍ، کان یشبہ ابن مسعود فی ھدیہ ودلہ وسمتہ وفضلہ۔ یعنی علقمہ فقیہ، بلند مرتبہ امام، قرآن بہترین آواز میں پڑھنے والے تھے، احادیث کے بیان کرنے میں ثبت (انتہائی درجہ احتیاط سے بیان کرنے والے) تھے، صاحب خیر وورع تھے، چال ڈھال، عادت وسیرت اور فضل وکمال میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کے مشابہ تھے۔

نیز فرماتے ہیں کہ حضرت اُبی بن کعب سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ صحابہ کرام کو چھوڑ کر حضرت علقمہ کے پاس کیوں آتے ہیں، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے بہت سے صحابہ کرام کو دیکھا ہے کہ وہ حضرت علقمہ سے علمی سوالات کرتے ہیں اور ان سے فتویٰ معلوم کرتے ہیں۔

صرف اتنے سے اندازہ لگائیے کہ حضرت علقمہ کا دین اور علم میں کیا مقام تھا، مگر چونکہ حضرت علقمہ کے واسطہ ہی سے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ابراہیم نخعی تک اور ان سے حماد تک اور ان سے حضرت امام ابوحنیفہ اور تمام فقہاء کوفہ تک پہونچا ہے، اور کوفہ والوں کی فقہ سے حضرت امام بخاری کو بیزاری ہے، اس وجہ سے انھوں نے حضرت علقمہ جیسے شخص کو بھی نہیں بخشا، اور ان کے بارے میں اسی کتاب میں خدا کا خوف کھائے بغیر یہ لکھ مارا کہ علقمہ اور ان جیسے لوگوں کے بارے میں یہ مروی ہے کہ ان لوگوں نے

قرآن سے سورہ فاتحہ کو مٹا دیا تھا (یعنی نکال دیا تھا) امام بخاری کے الفاظ یہ ہیں:
ویروی ایضاً عنهم انهم محوا فاتحة الكتاب من المصحف ،اس کا ترجمہ وہی ہے جو اوپر میں نے کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہتے وقت امام بخاری کے ذہن سے رسول پاک ﷺ کا وہ ارشاد بالکل محو ہو گیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے بیان کرتا پھرے، امام بخاری نے حضرت علقمہ کی شان میں یہ غلط بات اس لئے کہی کہ ان کا مذہب قرأت خلف الامام کا نہیں تھا، تو اب امام بخاری یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ حضرت علقمہ وغیرہ سورہ فاتحہ ہی کے دشمن تھے، اس کو وہ امام کے پیچھے پڑھیں گے کیا انھوں نے تو اس کو قرآن ہی سے نکال دیا تھا۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ان کے حاسدوں نے بہت سی خلاف واقعہ باتوں کو ان کے زمانہ میں مشتہر کرنا شروع کر دیا تھا، جو بعد میں رواج پاتی چلی گئیں، اور اس کی تحقیق کئے بغیر کہ حضرت امام کی طرف ان باتوں کی نسبت صحیح بھی ہے یا نہیں، بہت سے بزرگوں نے ان کو اپنی کتابوں میں نقل کرنا شروع کر دیا، حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کا شکار ہوئے، اللہ ان کی اور ہم سب کی زلات کو معاف کرے۔

ان چند باتوں سے آپ نے معلوم کر لیا ہوگا کہ امام بخاری کے رسالہ جزءقرأۃ خلف الامام کی حقیقت کیا ہے، اور وہ کتنا قابل بھروسہ اور تحقیقی اور اپنے مقصد میں کتنا کامیاب رسالہ ہے۔

میں اسی مختصر تحریر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں، پورے رسالہ پر تبصرہ کرنا اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے۔

اطلاعاً عرض ہے کہ اگر کسی کو میری بات سے اختلاف ہو تو اس کے لئے زمزم کے صفحات حاضر ہیں، وہ آئے اور اپنی تحقیق پیش کرے۔

☆☆☆☆☆

نواب صدیق حسن بھوپالی کے
”فارسی دیوان“
پر ایک نظر

علامہ نواب صدیق حسن صاحب غیر مقلد علماء میں مجددیت کے مقام پر فائز تھے، زندگی بھر تقلید اور فقہ سے لوگوں کو برگشتہ کرتے رہے، نواب صاحب آخر عمر میں تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے اور مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، فقہ ورائے سے علامہ کی بدگمانی وفات سے کچھ عرصہ قبل ختم ہو چکی تھی، اور وہ نماز بھی حنفی طریقہ پر پڑھنے لگے تھے۔ **نزھۃ الخواطر** میں اس کی تصریح ملتی ہے، اس کی تائید ان کی سوانح حیات میں ان کے صاحبزادے سیّد حسن علی خاں کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ نواب صاحب کے متعلق فرماتے ہیں:

”وہ ہمیشہ طریقۂ اسلاف پر مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے۔“

(مآثر صدیقی، ج:۴، ص:۱)

اگر ایسا ہی ہے تو نواب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یقیناً خاتمہ بالخیر ہوا ہوگا، اور ہماری خواہش یہی ہے کہ علامہ ممدوح کا خاتمہ بالخیر ہوا ہو، تمام مسلمانوں کے لئے ہماری یہی خواہش ہے کہ وہ فقہاء ومحدثین کے بارے میں خوش گمان رہیں اور اللہ والوں کی محبت سے اپنے دل کو آباد کریں اور ان کا خاتمہ بالخیر ہو۔

تو اب ہماری آئندہ کی گفتگو نواب صاحب کے اس دور کے متعلق ہوگی جب

وہ اپنا زورِ قلم فقہ اور فقہاء کے خلاف چلاتے رہے۔

نواب صاحب ممدوح کی ایک کتاب ''**نفح الطیب من ذکر المنزل والحبیب**'' دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، یہ نواب صاحب کا فارسی دیوان ہے، یہ پورا دیوان نواب صاحب نے فقہ اور فقہاء کی مذمت میں تصنیف کیا ہے، اس دیوان کی کوئی غزل اس وصف سے خالی نہیں، مقلدین کو اعدائے سنت بتلاتے ہیں اور تقلید کو سب سے بڑی گمرہی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہے ؎

تابتقلید بدگماں شدۂ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ شیخ سنت دریں جہاں شدۂ

یعنی اگر تم تقلید سے بدگمان رہو گے تو اس دنیا میں شیخ سنت ہو جاؤ گے۔

''شیخ سنت'' ہونے کا کتنا آسان اور سستا نسخہ ہے، نہ پڑھو نہ لکھو، نہ کتاب وسنت کا علم حاصل کرو بس تقلید سے بدگمانی پیدا کر لو شیخ سنت کا تمغہ تمہیں حاصل ہو جائے گا، خاں صاحب کے اسی نسخہ پر عمل کر کے آج تمام غیر مقلدین شیخ سنت بن گئے ہیں۔

نواب صاحب فرماتے ہیں، کیا فرماتے ہیں غور سے سننے کی بات ہے ؎

نکنی باک در خلاف حدیث ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ زانکہ فی الحال فقہ داں شدۂ

یعنی تم کو حدیث کی مخالفت کا کچھ ڈر نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ تم فی الحال فقہ والے ہو۔

نواب صاحب اسی غزل میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ تم کو قاضی شوکانی کا شکر ادا کرنا واجب ہے، اس وجہ سے کہ انھیں کے طفیل تم کو علم حدیث حاصل ہوا ہے، نواب صاحب کا ارشاد ہے ؎

شکر شوکانیت بود واجب ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بار دیگر حدیث خواں شدۂ

یعنی علامہ شوکانی کا شکر واجب ہے، انھیں کی وجہ سے دوبارہ حدیث کا پڑھنا لکھنا جاری ہوا ہے

ہم نے ناظرین کی سہولت کی خاطر اس شعر کا عام فہم ترجمہ کیا ہے، ورنہ ''شوکانیت'' کا مفہوم بہت وسیع ہے، یہ اسی طرح کا کلمہ ہے جیسے حنفیت، شافعیت، مالکیت اور حنبلیت، یعنی ان چاروں مذاہب کی طرح خاں صاحب کے نزدیک شوکانیت بھی ایک مذہب ہے اور یہ دین اسلام میں پانچواں مذہب ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ پہلے

چاروں مذاہب کی تقلید عین گمراہی اور اس شوکانیت کی تقلید عین ایمان!

نواب صاحب کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے،

منع حدیث خیر بشر می کند فقہ

یعنی نواب صاحب فرماتے ہیں کہ فقہ، رسول اکرم ﷺ کی حدیث سے روکتا ہے۔ اللہ اکبر نواب صاحب فقہ کی دشمنی میں کتنا تجاوز کر گئے اور انھیں ذرا بھی ڈر نہیں ہوا کہ وہ اس جھوٹ پر خدا کے یہاں پکڑے جائیں گے۔

ایک جگہ لوگوں کو مقلدین کی صحبت میں جانے سے یوں روکتے ہیں۔

بزم رائے بہ تقلیدیاں مشو ہمدم   کتاب وسنت احمد گزین وخدمت کن

یعنی مقلدین کے ساتھ رائے کی مجلس میں مت رہو، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو اختیار کرو اور دین کی خدمت کرو۔

بزم رائے میں کیوں مت جاؤ اور مقلدین کی صحبت سے کیوں دور رہو، اس لئے کہ مقلدین بدعتی ہیں اور اہل الرائے کا راستہ سنت کا نہیں ہے، نواب صاحب فرماتے ہیں:

خردوراں پئے تقلید گر کمر بندد   تو در طریق سنن کوش وترک بدعت کن

اگر اہل عقل وخرد تقلید پر کمر باندھے ہوئے ہیں تو تم سنتوں کے راستہ کو اختیار کرو اور بدعت سے دور رہو۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ خاں صاحب کے نزدیک اہل خرد اور اہل عقل کا طریق تو تقلید ہے، البتہ عقل سے بیگانوں کا راستہ غیر مقلدیت کا ہے۔

خاں صاحب کو عقل اور اہل عقل سے معلوم نہیں کیوں بہت چڑھ ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

بسے بہ بزم خرد رفتی وزیاں کردی   دمے بصحبت اہل حدیث رغبت کن

تم نے عقلمندوں کی مجلس اختیار کر کے اپنا بہت نقصان کیا، اب تھوڑی دیر اہل حدیث کی صحبت بھی اختیار کرو۔

نواب صاحب فرماتے ہیں کہ اہل خرد کی مجلسوں میں تقلید کا جلوہ رہتا ہے، اس وجہ سے بجلی کی طرح میرا دل تڑپتا رہتا ہے (کہ عقلمندوں نے تقلید کی راہ کیوں اختیار کی) فرماتے ہیں:

بہر جا جلوۂ تقلید در بزم خرد باشد ۔۔۔ دل خود را برنگ برق بے تاب می بینم

یعنی عقلمندوں کی مجلس میں ہر جگہ تقلید ہی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے (اس وجہ سے)
میں اپنے دل کو بجلی کی طرح تڑپتا پاتا ہوں۔

عقلمندوں کی اس حرکت پر نواب صاحب کا تڑپتے تڑپتے وصال ہو گیا، مگر اہل خرد نے نواب صاحب کی بات کا خیال کر کے تقلید کی راہ چھوڑی نہیں۔

عقلمندوں کی اس تقلیدی روش پر نواب صاحب ایک جگہ یوں برستے ہیں۔

خرابی ہائے بسیار در بند خرد منداں
گرفتم دامن سنت سلامت از فتن رفتم

یعنی عقلمندوں کے بندھن میں رہنے سے بڑی خرابی ہے، میں نے تو سنت کا
دامن تھام لیا اور فتنوں سے محفوظ رہا۔

چونکہ عام طور پر ارباب عقل وخرد مقلد تھے، اس وجہ سے خاں صاحب ان پر بہت برہم ہیں، فرماتے ہیں:

نواب جز حدیث مگو قصۂ خرد ۔۔۔ فتوائے صد ہزار مقلد دریدہ ام

یعنی مجھ سے حدیث کے علاوہ قصہ مت سناؤ، میں نے ہزاروں مقلدین کا فتویٰ پھاڑ ڈالا ہے۔

نواب مرحوم تمام مسلمانوں کو عقل وخرد سے پیدل ہو جانے کا درس پڑھاتے ہیں سبحان اللہ! عقل وخرد سے پیدل ہو جانے کا نام غیر مقلدیت ہے۔

ایک جگہ تو نواب صاحب پورے جوش خاں صاحبی میں تلوار کھینچے نظر آتے ہیں ،ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے سنت ذوالفقار سے تمام مقلدین واہل خرد کو تہ تیغ کر دیا ہے ،بڑے مزے کا شعر ہے، فرماتے ہیں:

مقلدان خرد را کہ دشمن دین اند ۔۔۔ بذوالفقار احادیث خونچکاں رفتم

یعنی مقلدان عقل وخرد جو کہ دین کے دشمن ہیں میں نے انھیں احادیث کی ذوالفقار سے ختم کر دیا ہے۔(ذوالفقار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کا نام تھا)

ایک جگہ نواب صاحب عقل کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

روئے قرطاس سیہ میشود از نقش خرد ‏ ‏ ‏ ‏ نشود کاش دریں ملک میسر کاغذ

یعنی عقل وخرد کی باتوں سے صفحۂ قرطاس سیاہ ہوتا ہے، کاش اس ملک میں کاغذ ہی میسر نہ ہوتا۔(تو بہتر تھا کہ عقل کی باتیں صفحۂ قرطاس پر نہ لکھی جاتیں)

نواب صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مقلدین رائے کے بت کدہ کا طواف کرتے ہیں، اور ہم لوگ سنت کے کعبہ کے طواف کی ہوس رکھتے ہیں، ان کا شعر ہے۔

گردش بدیرِ رائے نصیب مقلداں ‏ ‏ ‏ ‏ باشد طواف کعبہ سنت ہوس مرا

یعنی مقلدوں کی قسمت میں رائے کے بت کدہ کا طواف ہے، اور ہماری ہوس یہ ہے کہ ہم سنت کے کعبہ کا طواف کریں۔

نواب صاحب کو تقلید سے بہت چڑھ ہے، ایک شعر میں اپنے اس جذبہ کا اظہار اس طرح کیا ہے:

تقلید را بگو کہ بجائے دگر رود ‏ ‏ ‏ ‏ کردند در مدینہ سنت عسس مرا

یعنی تقلید سے کہہ دو کہ کہیں اور جائے، میرا آشیانہ تو بلدۂ سنت میں ہے۔

نواب صاحب کا دین ومذہب کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میرا دین اہل الرائے کی تقلید انکار کرنا ہے۔

دین من است کفر بتقلید اہل رائے

اہل رائے پر نواب صاحب کو قہر خداوندی کا اندیشہ ہے، فرماتے ہیں:

ترسم زبا دقہر تو یارب براہل رائے ‏ ‏ ‏ ‏ ابطال راست می کندایں قوم عادِ ما

اے رب مجھے اہل رائے پر آپ کے قہر کا اندیشہ ہے، یہ وہ قوم ہے جو ہماری عاد کا براہ راست ابطال کرتی ہے۔

''عاد ما'' سے خاں صاحب کی مراد کیا ہے، انھوں نے اس لفظ کا استعمال کہیں

بلا سمجھے بوجھے تو نہیں کر دیا ہے۔ اہل علم غور فرمالیں، عاداس کافر قوم کو قرآن میں کہا گیا ہے جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو ایمان کی دعوت دیکر بھیجا گیا تھا، تو پھر نواب صاحب کے ''عادما'' کا کیا مفہوم ہے؟ اس قوم کافر سے نواب صاحب کا کیا رشتہ تھا کہ وہ ''عادما'' فرمارہے ہیں۔

نواب صاحب کے دیوان میں اس طرح کے اشعار بہت ہیں، ان اشعار سے مفہوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کو مقلدین واہل رائے واہل خرد سے بڑی نفرت تھی، خدا کرے عمر کے آخر دور میں یہ نفرت ختم ہوگئی ہو۔

نواب صاحب کے دیوان میں حدیث وسنت سے متعلق بہت سے اشعار ہیں، ان اشعار میں نواب صاحب نے کتاب سنت سے اپنی وارفتگی وعشق کا مختلف اُسلوب میں اظہار کیا ہے، اس سلسلے کے چند اشعار پیش خدمت ہیں، فرماتے ہیں:

غیر از کتاب راہ ندارد بیاد ما — باشد حدیث احمد مرسل مراد ما

یعنی میری یاد میں کتاب اللہ کے سوا کوئی اور چیز راہ نہیں پاتی ہے، اور میری مراد صرف احمد مرسل (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیث ہے۔

ترکیب پاک یافتہ باسنت وکتاب — روز نخست آب وگل اعتقاد ما

یعنی میرے اعتقاد میں روز اول ہی سے کتاب وسنت کی ساخت وترکیب رہی ہے۔

از نزد رائے سوئے تو رفتیم اے سنن — اکنوں بود ز تو ہمہ بست وکشاد ما

یعنی رائے کو چھوڑ کر سنتوں کی طرف میں پلٹا ہوں، اور اب میرے تمام معاملات کی بست وکشاد سنت ہی سے ہوتی ہے۔

بے جلوہ تو خانۂ دل بے چراغ بود — از خیر مقدمت شدہ روشن سواد ما

یعنی سنت کے جلوہ کے بغیر میرا دل اندھیرے میں تھا، اب سنت کے آنے کی وجہ سے میری تاریکی روشنی سے بدل گئی۔

خاں صاحب مرحوم نے اپنے اشعار میں قاضی شوکانی سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا ہے، (قاضی شوکانی یمن کے زیدی شیعہ تھے)

اگر سلامت دین خود از خرد خواہی   بخواں صحیفۂ علم جناب شوکانی

یعنی اگر تم عقل وخرد سے اپنے دین کی سلامتی چاہتے ہوتو جناب شوکانی کا صحیفۂ علم پڑھو۔

اس سے معلوم ہوا کہ خاں صاحب کے پاس جو کچھ تھا وہ نہ کتاب اللہ سے تھا نہ احادیث کی کتابوں سے، ان کے سرمایۂ علم کا مدار قاضی شوکانی کے صحیفۂ علم پر تھا، عدم تقلید کی جڑ کا منبع یہی صحیفہ تھا، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ خاں صاحب کا عقیدہ یہ تھا کہ کتاب وسنت سے دین کی سلامتی نہیں ہوسکتی، دین کی سلامتی کا واحد ذریعہ قاضی شوکانی کا یہی صحیفہ ہے۔

قاضی شوکانی صاحب کے بارے میں خاں صاحب کے غلو کا عالم یہ تھا کہ وہ ان سے مدد بھی مانگا کرتے تھے، ایک شعر میں فرماتے ہیں:

زمرۂ رائے دراوفتاد بارباب سخن   شیخ سنت مددے قاضی شوکاں مددے

یعنی ارباب سنن کو رائے والوں نے بڑا گھیر رکھا ہے، شیخ سنت مدد فرمایئے، قاضی شوکانی مدد کیجئے

ناظرین مرنے کے بعد غیر اللہ کو پکارنا اور ان سے مدد طلب کرنا شرک ہے، لیکن نواب صاحب قاضی شوکانی کی محبت میں اس شرک کے ارتکاب سے بھی باز نہیں رہتے، البتہ مقلدین کو مشرک بنانے پر بڑا زور صرف کرتے ہیں۔

نواب صاحب فرماتے ہیں کہ ہندوستان والوں کی رائے کی بو سے زکام ہوجاتا ہے، اس لئے قاضی شوکانی کی مہک کے شوق میں یمن کے گلستاں میں جاتا ہوں۔نواب صاحب کا شعر یہ ہے:

زکام میرسد از نکہت آراء ہندوستاں   بشوق بوئے شوکاں درگلستاں یمن رفتم

نواب صاحب نے بعض اشعار میں غیر اللہ کی قسم بھی کھائی ہے، جو شرعا حرام ہے، مثلاً ان کا ایک شعر ہے:

قسم بشاہ رسالت قسم بشوکت او   کہ نیست درسرمن جز ہوائے سنت او

یعنی شاہ رسالت (رسول اللہ) کی قسم اور ان کی شوکت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے سر میں صرف ان کی سنت ہی کی خواہش ہے۔

حدیث میں آتا ہے:من حلف بغیر اللہ فقد أشرک کہ جس کسی نے غیر

اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا، معلوم نہیں غیر مقلدین اپنے مجدد صاحب کو اس شرک سے کس طرح نکالیں گے۔

نواب صاحب غیر اللہ سے توسل اور استغاثہ کو جائز رکھتے ہیں، چنانچہ قاضی شوکانی کی مدح میں اوپر ان سے استغاثہ واستمداد کا ایک شعر گزر چکا ہے، اللہ کے رسول ﷺ سے استغاثہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

گفت نواب غزل در صفت سنت تو — خواجۂ دیں صلۂ قبلۂ پاکاں مددے

آپ کی سنت کے بیان میں نواب نے غزل کہی ہے، اے دین کے خواجہ اور اے نیکوں کے قبلہ مدد فرمائیے۔

دوسرا اگر رسول اللہ ﷺ سے استغاثہ وتوسل کرے تو وہ مشرک، کافر، بے دین اور بدعقیدہ، اور نواب صاحب کیلئے یہ استغاثہ واستمداد عین ایمان اور خوش عقیدگی کی علامت!

نواب صاحب کا ذوق استغاثہ واستمداد اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ خود اپنی قسمت سے استغاثہ واستمداد کرتے تھے، ان کے اوپر والے شعر کی غزل کے مطلع کا دوسرا شعر یہ ہے:

مددے طالع صدیق حسن خاں مددے

یعنی اے صدیق حسن کی قسمت تو میری مدد فرما

ان تمام عقیدوں وخیالات کے ساتھ جب نواب صاحب یہ فرماتے ہیں:

ساقیا سنت پرستم — از مئے توحید مستم

اے ساقی میں تو سنت پرست ہوں، میں تو توحید کے نشہ سے مست ہوں۔

تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حقیقت

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

☆☆☆☆☆

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ کی کتاب
”کتاب الجنائز“
پر ایک نظر

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ غیر مقلدین علماء میں بڑی امتیازی اوصاف کے مالک ہیں، ان کی کتاب ”تحفۃ الاحوذی“ جو ترمذی شریف کی شرح ہے، اہل علم میں متعارف ہے، اس کتاب سے مولانا کی شہرت بہت ہوئی۔

حالیہ دنوں میں مجھے ان کی ایک کتاب ”کتاب الجنائز“ کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا، اس کتاب کے اندرونی ٹائٹل پر لکھا ہے:

> ”اس کتاب میں جاں کنی کے وقت سے لے کر تجہیز و تکفین اور اس کے بعد تک کے تمام وہ ضروری احکام و مسائل جمع کئے گئے ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں۔“

اور اس کے ٹائٹل صفحہ :۴ پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا نام اس طرح لکھا ہے:

فقیہ العصر محدث وقت مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ

اس کتاب کی بڑی خاص بات یہ ہے کہ زبان مولانا نے بڑی سادہ استعمال کی ہے، ہر شخص اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے اس کا پورا حوالہ بھی دیا ہے، اس طرح یہ کتاب بہت مستند اور اس خاص موضوع پر بہت جامع ہے۔

البتہ جو بات اس میں ہم جیسوں کو الجھن میں ڈالنے والی ہے وہ یہ ہے کہ اس

کتاب کو پڑھنے کے بعد ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مولانا کا موقف ضعیف حدیث کے بارے میں کیا ہے؟ آیا اس کو مطلقاً قبول کرنے کا ہے یا مطلقاً رد کرنے کا یا کہیں قبول کرنے کا ہے اور کہیں رد کرنے کا، بعض جگہ تو مولانا ضعیف حدیث کو ایسا رد کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کا ضعیف ہونا وہ شجرِ ممنوعہ ہے کہ اس کے قریب بھٹکنا بھی حرام ہے، اور کہیں مولانا بلا تکلف ضعیف حدیث سے استدلال بھی کرتے ہیں۔

دوسری بات جو قابلِ ملاحظہ ہے وہ صحابہ کرام کے اقوال اور ان کے واقعات سے استدلال کرنے کا مسئلہ ہے، ایک طرف تو غیر مقلدین کا دعویٰ اور اصول یہ ہے کہ صحابہ کرام کا قول و فعل اور فہم حجت نہیں ہے، اور دوسری طرف مولانا مبارکپوری صاحب نے جگہ جگہ اس کتاب میں صحابہ کرام کے اقوال و واقعات سے استدلال بھی کیا ہے، اور کہیں تضاد کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کے اقوال کو قابل توجہ نہیں گردانا ہے۔

تیسری بات جو اس کتاب میں قابل ملاحظہ نظر آئی وہ یہ کہ مولانا نے کہیں بھی یہ واضح نہیں کیا ہے کہ خود غیر مقلدوں کا مسلک کیا ہے، دوسروں کا مذہب تو مولانا نے بتلا دیا مگر خود اپنا مسلک واضح نہیں کیا ہے۔

میں نیچے کی سطروں میں ترتیب وار اِن تینوں باتوں کی تفصیل پیش کرتا ہوں۔

(۱) پہلی بات مولانا کے ضعیف حدیث کے بارے میں متضاد رویہ کی ہے، اور یہ کہ اس کتاب سے ان کا موقف واضح نہیں ہوتا کہ ضعیف حدیث ان کے یہاں مطلقاً مقبول ہے یا مطلقاً مردود، یا ان کا موقف بین بین کا ہے کہ کبھی وہ قبول کریں گے اور کبھی قبول نہیں کریں گے، اس کی وضاحت درج ذیل مثالوں سے ہوگی۔

مولانا لکھتے ہیں:

عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جو شخص جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات کو مرے گا اللہ تعالیٰ اس کو قبر کے فتنہ سے بچائے گا۔"

پھر فرماتے ہیں:

"یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کی تائید و توثیق متعدد حدیثوں سے ہوتی

ہے۔''ص:۱۵

اس سے معلوم ہوا کہ اگر حدیث ضعیف ہو اور اس کی تائید کئی حدیثوں سے ہو تو وہ ضعیف حدیث قابل قبول ہوتی ہے۔

اب اس کے برخلاف مولانا مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات سنئے، فرماتے ہیں:

''نماز جنازہ کی چار تکبیروں میں رفع یدین کرنا کسی حدیث مرفوع صحیح سے ثابت نہیں ہے، اور جو مرفوع حدیثیں اس بارے میں آئی ہیں وہ ضعیف ہیں۔''ص:۵۵

مولانا کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ چاروں تکبیروں میں رفع یدین کرنے کے بارے میں متعدد حدیثیں ہیں اور ہر ایک کا مضمون دوسرے کا مؤید ہے، یعنی ہر ایک حدیث دوسری حدیث کی تائید کر رہی ہے، مگر مولانا یہاں چاروں تکبیروں کے رفع یدین کو مسنون نہیں سمجھتے اور ان متعدد ضعیف حدیثوں کو قبول کرنے سے انکاری ہیں، حالانکہ مولانا کو خود اعتراف ہے کہ چاروں تکبیروں کے ساتھ رفع یدین کرنا بعض صحابہ کرام کا معمول تھا۔ فرماتے ہیں:

''ہاں حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس کا نماز جنازہ کی چاروں تکبیروں میں رفع یدین کرنا بہ سند صحیح ثابت ہے۔''ص:۵۵

جب متعدد ضعیف حدیثوں سے بھی نماز جنازہ کی چاروں تکبیروں میں رفع یدین کرنا ثابت ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بسند صحیح رفع یدین کرنا ثابت ہے تو اب پھر مولانا رفع یدین کے انکاری کیوں ہیں؟ جبکہ یہ معلوم ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اتباعِ سنت میں بہت سرگرم تھے، ان دونوں جلیل القدر صحابیوں کا جنازہ کی چاروں تکبیروں میں رفع یدین کرنا اپنی طرف سے قطعاً نہیں ہوگا، انھوں نے آنحضور ﷺ کا عمل دیکھا ہوگا، اور اس پر ان کا عمل رہا ہوگا۔

یہ ضعیف حدیثوں کے سلسلہ میں مولانا کے موقف کے واضح نہ ہونے کی ایک مثال ہوئی، دوسری مثال لیجئے:

مولانا فرماتے ہیں:

''نماز جنازہ کے ساتھ کوئی کلمہ یا کوئی دعا یا قرآن مجید بآواز بلند پڑھتے ہوئے نہیں چلنا چاہئے، کیونکہ حدیث صحیح سے اس کا کچھ ثبوت نہیں ہے۔''

اور حضرت ابن عمرؓ سے جو اس مضمون کی ایک روایت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نماز جنازہ کے پیچھے چلتے تھے اور ہم لوگ جنازہ کے ساتھ جانے اور واپس آنے میں آپ سے کچھ نہیں سنتے تھے مگر لا الہ الا اللہ، سو یہ روایت ضعیف ہے۔ (ص:۴۵)

مولانا کے اس کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا صرف وہی حدیث قابل عمل سمجھتے ہیں جو صحیح ہو، ضعیف حدیث قابل عمل نہیں ہے۔

مگر زیارت قبور جمعہ کے روز مسنون ہونے کے بیان میں مولانا نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔

''محمد بن نعمان سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو شخص جمعہ کو اپنے ماں باپ دونوں کی قبر کی یا ان میں سے ایک کے قبر کی زیارت کرے تو اس شخص کی مغفرت کی جاتی ہے۔''

جبکہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کے ضعیف ہونے کی صراحت مولانا نے حاشیہ میں خود کر دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل اور مرفوع دونوں طرح روایت کی گئی ہے، مگر دونوں کی سندیں ضعف سے خالی نہیں ہیں۔

مولانا مبارکپوری کی یہ تضاد بیانی ہمیں بہت الجھن میں ڈالتی ہے کہ آخر مولانا کا ضعیف حدیث کے سلسلہ میں مسلک کیا ہے، اور کسی حدیث کے ردو قبول کا ان کے نزدیک معیار کیا ہے؟

مولانا نے جمعہ کے روز قبر کی زیارت کے سلسلہ کی دو حدیثیں اور ذکر کی ہیں مگر یہ دونوں حدیثیں بھی ضعیف ہیں، اوپر والی اور دونوں حدیثوں کو ذکر کرکے مولانا ان تینوں حدیثوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

''لیکن یہ تینوں حدیثیں ضعیف ہیں۔'' ص:۸۸

یعنی جمعہ کے روز قبر کی زیارت کی فضیلت میں ایک بھی مرفوع یا غیر مرفوع

حدیث صحیح نہیں ہے، مگر اس کے باوجود مولانا فرماتے ہیں:

"ہاں جمعہ کے روز قبروں کی زیارت کرنا بہ نسبت اور دنوں کے افضل ہے۔" ص: ۸۷

اگر کوئی یہ کہے کہ فضائل کے بارے میں ضعیف حدیثیں قبول کی جاتی ہیں، اس وجہ سے مولانا نے ضعیف حدیثوں کی بنیاد پر جمعہ کے روز قبر پر حاضر ہونے کو افضل بتلایا ہے، تو عرض کروں گا کہ بلاشبہ عام محدثین اور علماء وفقہاء کا یہی مذہب ہے کہ فضائل کے بارے میں ضعیف حدیثیں قبول کی جاتی ہیں، مگر غیر مقلدین کا یہ مذہب نہیں ہے، غیر مقلدین تو فضائل کے بارے میں بھی ضعیف حدیث قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور اس وجہ سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے رسائل "تبلیغی نصاب" پر ان کا اعتراض ہے کہ تبلیغی نصاب میں ضعیف حدیثیں ہیں، غیر مقلدین کو تبلیغی نصاب میں تو ضعیف حدیثیں خوب نظر آتی ہیں مگر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری فقیہ العصر محدث وقت کی کتاب الجنائز میں ان کو ضعیف حدیثیں نظر نہیں آتی ہیں، کیا یہی انصاف کا تقاضا ہے؟

بہر حال مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کا یہ رسالہ پڑھنے والے کو الجھن میں ڈالتا ہے، ان الجھنوں کے ساتھ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا اہل علم کے لئے مشکل ہے، ہاں جاہل لوگ جو ان باریکیوں تک نہیں پہونچ سکتے اس سے کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اوپر آپ نے دیکھا کہ مولانا نے ضعیف احادیث کی بنیاد پر جمعہ کے روز قبر کی زیارت و حاضری کو افضل بتلایا ہے، لیکن اس بارے میں قرآن کی تلاوت اور نماز وغیرہ کا ثواب مردہ کو پہونچتا ہے یا نہیں، اس کا انکار کیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ اس کا ثبوت کسی حدیث صحیح سے ثابت نہیں ہوا، حالانکہ اس بارے میں ایک نہیں کئی حدیثیں ہیں، مولانا جو فرماتے ہیں پہلے اس کو سن لیں۔ فرماتے ہیں:

"اور عبادات بدنیہ جیسے تلاوت قرآن اور نماز اور روزہ وغیرہ کا ثواب میت کو پہونچنا کسی حدیث صحیح صریح سے ثابت نہیں ہوتا، اور جو روایتیں عبادات بدنیہ کے ثواب کے پہونچنے کے بارے میں نقل کی جاتی ہیں وہ ضعیف ہیں۔"

جبکہ مولانا کے بیان میں یہ مذکور ہے اس بارے میں میت کو عبادت بدنیہ یعنی

تلاوت قرآن وغیرہ کا ثواب پہونچتا ہے، پانچ بلکہ اس سے زیادہ حدیثیں ہیں، مولانا پانچوں حدیثوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''اس کے علاوہ بعض اور روایات بھی آئی ہیں اور وہ بھی ضعیف ہیں۔''(۱) ص: ۹۵

یہ تضاد نہیں تو کیا ہے کہ مولانا کہیں تو ضعیف حدیث کو قبول کرتے ہیں اور کہیں ایک مضمون کی کئی کئی حدیثوں کو رد کر دیتے ہیں اور اس کی بنیاد بقول مولانا یہ ہوتی ہے کہ وہ مضمون کسی صحیح صریح حدیث سے ثابت نہیں ہوتا، اگر کسی حدیث کو قبول کرنے کا معیار یہی ہے کہ وہ صحیح اور صریح ہو تو پھر انھوں نے اسی کتاب میں بہت سی ضعیف حدیثوں کو کیوں قبول کیا ہے؟ گزشتہ مثالوں میں آپ نے دیکھا کہ مولانا اسی کتاب میں ضعیف حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں، مزید ایک مثال ملاحظہ فرمائیں، مولانا فرماتے ہیں کہ میت کو وہ لوگ غسل دیں جو میت کے قریبی ہوں، اوران کو غسل دینے کا طریقہ معلوم نہ ہو تو دوسرے لوگ غسل دیں جو دیندار اور پرہیز گار ہوں، اور اس کے بارے میں مولانا نے جو حدیث نقل کی ہے وہ بقول خود ان کے ضعیف ہے۔ فرماتے ہیں: لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔''

بہر حال مولانا کا ضعیف حدیث کے قبول کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں

---

(۱) یہاں پر یہ واضح کردوں کہ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کے انداز سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عبادات بدنیہ مثلاً نماز، روزہ اور قرآن کی تلاوت کا ثواب مردہ کو نہیں پہونچتا، اگر مولانا کا یہی مذہب ہے تو ان کا یہ مذہب جمہور علماء ومحدثین کے خلاف ہے، خود مولانا شرح فقہ اکبر سے نقل کرتے ہیں:

''عبادات بدنیہ جیسے روزہ اور نماز اور قرأت قرآن اور ذکر کے ثواب پہونچنے میں علماء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ اور امام احمد اور جمہور سلف کا مذہب یہ ہے کہ پہونچتا ہے۔'' ص: ۹۶

عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ غیر مقلدین کا مذہب جمہور سلف سے الگ ہوتا ہے جیسا کہ تراویح، طلاق اور جمعہ کی اذان کے بارے میں ان حضرات نے جمہور سلف سے الگ اپنا مذہب بنایا ہے۔

موقف بالکل واضح نہیں ہے، تو بھلا اس کتاب سے اہل علم کیسے فائدہ اٹھاسکیں گے۔

(۲) اب آیئے دوسری بات کی طرف، ایک طرف غیر مقلدین کہتے ہیں صحابہ کرام کا قول وفعل اور فہم نا قابل حجت ہے، اور دوسری طرف یہ ان سے استدلال بھی کرتے نظر آتے ہیں، خود مولانا مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے جگہ جگہ اقوال صحابہ وافعال صحابہ سے دلیل و حجت پکڑی ہے، مثلاً قبر کی زیارت کے تذکرہ میں وہ فرماتے ہیں:

''حضرت فاطمہؓ ہر جمعہ کو حضرت حمزہؓ کی قبر کی زیارت کرتی تھیں۔'' ص:۸۸

یعنی جمعہ کے روز قبر کی زیارت کے جائز ہونے کی ایک دلیل حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا یہ عمل بھی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا عمل دین وشریعت میں حجت اور دلیل ہے۔

میت کو قبر میں قبلہ کی طرف سے داخل کرنے کے جواز پر حضرت علی ﷜ کے فعل سند لائے ہیں۔ ص:۶۹

میت کو قبر میں رکھنے کے بعد کپڑے کو کھولنا چاہئے یا نہیں، اس بارے میں آنحضور ﷺ سے کچھ منقول نہیں ہے، مگر مولانا کا فرمان یہ ہے کہ:

''جب میت کو لحد میں رکھیں تو ان دونوں گرہوں کو کھول دیں۔''

اور مولانا اس بارے میں حضرت سمرہ بن جندب ﷜ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ ان کا جب ایک لڑکا مر گیا تو انھوں نے اپنے غلام سے کہا کہ اس کو لے جا کر دفن کر دو اور اس کے سر اور پیر کی گرہ کو کھول دینا۔ ص:۳۵

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کا قول وفعل بھی حجت اور دلیل ہے۔(۱)

شوہر اپنی متوفی بیوی کو غسل دے سکتا ہے، اس بارے میں مولانا عبد الرحمٰن

---

(۱) تعجب ہے کہ مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری نے حضرت سمرہ بن جندب ﷜ کے قول سے کیسے استدلال کیا، اس لئے کہ یہ تو بقول نواب صاحب حیدرآبادی معاذ اللہ ان صحابہ کرام میں سے تھے جو فاسق تھے اور جن کا ذکر بھلائی سے نہیں کرنا چاہئے، شاید زمزم کے قارئین کو معلوم ہوگا کہ غیر مقلدوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت فاسق تھی۔ استغفر اللہ

صاحب نے متعدد صحابہ کے واقعات سے استدلال کیا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کا قول وفعل حجت ہے اور ان سے شرعی مسائل کو ثابت کیا جاسکتا ہے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص قریب المرگ سے کہے (یعنی جس کی موت کا وقت قریب آچکا ہے) کہ رسول اللہ ﷺ سے یا فلاں شخص سے میرا اسلام کہہ دینا تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، بعض صحابہ نے ایسا کیا ہے (ص:۱۷)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے عمل سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔

جب غیر مقلدین کا یہی مذہب ہے تو پھر تعجب ہے کہ ان کے اکابر یہ نعرہ کیوں بلند کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کا قول وفعل حجت نہیں ہے، خود مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا بھی یہی عقیدہ و مذہب ہے جو ان کی کتابوں سے ظاہر ہے، بہرحال عرض یہ کرنا ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی اس کتاب سے الجھنیں بڑھتی ہیں۔

(۳) اب آیئے تیسرے مسئلہ کی طرف، یعنی اس کتاب میں مولانا نے بہت سی جگہ مسائل کے بیان میں غیر مقلدین کا مذہب صاف صاف نہیں بتلایا ہے کہ ان کا مذہب ان مسائل میں کیا ہے، اس سے بھی اس کتاب کو پڑھ کر الجھن بڑھتی ہے۔

مثلاً مولانا نے حنفیہ کا مسئلہ یہ تو لکھا ہے کہ میت کو غسل دینے کیلئے بیری کے پانی کو جوش دیا جائے اور اسی پانی سے مردہ کو نہلایا جائے، مگر غیر مقلدین کو کیا کرنا چاہئے مولانا نے کچھ نہیں بتلایا، البتہ یہ کہہ کر الجھن ضرور بڑھادی کہ:

> ”رہی یہ بات کہ بیر کے پتوں کو کس طریق سے استعمال کرنا چاہئے، سو اس کے متعلق حدیث سے کوئی تشریح نہیں ملتی ہے۔“ ص:۲۷

اسی طرح مولانا نے اس مسئلہ میں اگر غسل دینے کے بعد میت کی شرم گاہ سے کوئی شے خارج ہو تو اس کا دھونا کافی ہے یا پھر سے غسل دینا چاہئے؟ فرماتے ہیں کہ اس میں دو قول ہے، حسن بصری اور احناف کہتے ہیں کہ صرف دھونا کافی ہے غسل دینے کی دوبارہ ضرورت نہیں ہے، اور محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ تین بار غسل دیا جائے اگر پھر نجاست خارج ہو تو پانچ بار غسل دیا جائے اور اگر اس کے بعد بھی نجاست خارج ہو تو

سات بار غسل دیا جائے، مولانا نے یہ دو مذہب تو نقل کیا ہے مگر اس بارے میں غیر مقلدین کا کیا مذہب ہے مولانا نے کچھ صاف نہیں بتلایا، مولانا کی اس عدم وضاحت سے الجھن بڑھتی ہے، اور آدمی اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا پاتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:

''علماء حنفیہ وشافعیہ نے لکھا ہے کہ پہلی (مٹی ڈالتے وقت) منها خلقناكم اور دوسری بار وفیها نعيدكم اور تیسری بار میں ومنها نخرجكم تارة اخرىٰ پڑھنا مستحب ہے۔'' (ص: ۷۰)

مولانا نے شافعیہ اور حنفیہ کا مذہب تو بتلا دیا مگر اس بارے میں خود غیر مقلدین کا مذہب کیا ہے، مولانا اس کو چھپا لے گئے اور ظاہر نہیں کیا۔

اسی طرح مولانا نے یہ ذکر کیا ہے کہ قبرستان میں جوتی پہن کر چلنے کے بارے میں بعض احادیث میں ممانعت آئی ہے، اور بعض حدیثوں سے جواز کا پتہ چلتا ہے، اور اسی وجہ سے علماء کی رائے اس بارے میں الگ الگ ہے، بعض جواز کے قائل ہیں اور بعض عدم جواز کے، لیکن خود غیر مقلدین کس کے قائل ہیں جواز کے یا عدم جواز کے، مولانا نے اس کو چھپا لیا ہے، اور واللہ اعلم بالصواب کہہ کر خاموش ہو گئے ہیں۔ (ص: ۷۴)

میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ مسائل جن کا سابقہ عوام کو عام طور پر پڑتا ہے ان کا بیان اسی طرح گول مول؛ کیا جائے گا، اور کیا یہی اہل علم کی شان کے مناسب بات ہے؟ اسی لئے کہتا چلا آرہا ہوں کہ مولانا کی اس کتاب کو پڑھ کر الجھن بڑھتی ہے۔

عورتوں کو قبر کی زیارت کرنی چاہئے یا نہیں، مولانا نے اس بارے میں بھی کوئی واضح بات نہیں کہی ہے، صرف اتنا کہا کہ بعض احادیث سے سے جواز کا پتہ چلتا ہے اور بعض سے عدم جواز کا، اور اپنا مذہب واضح نہیں کیا کہ عورتوں کو قبروں کی زیارت کرنا غیر مقلدین کے مذہب میں جائز ہے یا ناجائز، شریعت کے مسائل کے بیان کا اگر یہی طریقہ ہو تو پھر عوام کو صحیح مسائل سے واقفیت کیسے ہوگی؟ افسوس کہ مولانا کی اس فقہی بصیرت کے بل بوتے پر ان کو فقیہ العصر بھی کہا جاتا ہے۔

اس کتاب میں یہ باتیں تو الجھن کی ہے ہیں، اس کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ایسی ہیں جن سے الجھن پیدا ہوتی ہے۔

مثلاً بعض جگہ مولانا نے بہت سخت قسم کی ضعیف حدیثوں سے استدلال کیا ہے ، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

''تعزیت کے وقت میت کے واسطے دعا کرنا بھی آیا ہے، ابوداؤد اور نسائی کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کسی صحابی کے گھر تعزیت میں گئی تھیں، اور انھوں نے وہاں دعائے رحمت کی تھی۔'' ص:۸۶

حالانکہ یہ حدیث بہت سخت قسم کی ضعیف ہے ، خود مولانا نے اس کو جب ص:۸۱ پر نقل کیا ہے تو فرماتے ہیں کہ:

''یہ حدیث صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کی سند میں ربیعہ بن سیف نامی راوی سخت ضعیف ہے۔''

اور اسی سخت قسم ضعیف روایت سے مولانا نے ص:۸۲ پر استدلال کیا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ:

''اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی اقتداء واتباع کرے اور قبر میں کھجور کی شاخ گاڑے تو اس میں کچھ حرج نہیں معلوم ہوتا۔'' ص:۷۳

یہ انداز شک کا ہے ، مولانا کو صاف صاف لکھنا چاہئے کہ ایسا کرنا عام مسلمانوں کو اور عام مسلمانوں کی قبروں کے ساتھ جائز ہے یا ناجائز۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

''قبر کو پہچاننے اور اس کو معلوم ہونے کیلئے قبر کے سرہانے کوئی بھاری پتھر رکھ دینا یا گاڑ دینا جائز ودرست ہے ، رسول اللہ ﷺ نے اسی غرض سے عثمان بن مظعون کی قبر کے سرہانے ایک بھاری پتھر رکھ دیا تھا۔'' ص:۲۷

اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ کسی قبر کے پاس پتھر رکھ دینے کا جواز معلوم ہوتا ہے گاڑنے کا نہیں، مگر مولانا اس سے پتھر گاڑنا بھی ثابت کر رہے ہیں۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

''فقہائے حنفیہ لکھتے ہیں کہ دفن کے بعد دعا اور قرأت قرآن کیلئے قبر کے پاس اتنی دیر ٹھہرنا مستحب ہے جتنی دیر میں اونٹ ذبح کرکے اس کا گوشت تقسیم کیا جائے۔'' ص:۱۷۱/۲

یہ تو حنفیہ کی بات ہوئی، غیر مقلدین کیا لکھتے ہیں مولانا نے اس کو ظاہر نہیں کیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:

''تکبیر کے بعد سورہ فاتحہ کا پڑھنا سنت ہے۔'' ص:۶۵

غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ نماز جنازہ بھی اور نمازوں کی طرح ایک نماز ہے، تو اس نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنا اور نمازوں کی طرح واجب ہوگا نہ کہ سنت، معلوم نہیں مولانا نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو سنت کیوں قرار دیا جبکہ دوسرے غیر مقلدین علماء نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کو واجب اور فرض بتلاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بلا سورہ فاتحہ کے نماز جنازہ باطل ہوگی، فتاویٰ علمائے اہلحدیث میں لکھا ہے:

''اگر امام یا مقتدی نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو نماز باطل ہوگی۔
(ج:۵،ص:۱۸۵)

اور یہی بات مولانا نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم نے **بدور الاھلة** نامی اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ (دیکھو، ج:۱،ص:۹۲)

مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری فرماتے ہیں کہ:

''نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ آہستہ پڑھنا چاہئے اور یہی مذہب جمہور کا ہے (ص:۵۳)

اس کے برخلاف فتاویٰ ثنائیہ میں ہے کہ:

''جنازہ کی نماز میں سورہ فاتحہ اور اس کے بعد سورۃ بآواز بلند پڑھنا بلکہ سنت ہے۔ (ج:۲،ص:۵۲)

اور یہی بات فتاویٰ علمائے اہلحدیث میں ہے، چنانچہ لکھا ہے:

''دلائل کے لحاظ سے بلند آواز کے ساتھ جنازہ پڑھنا افضل اور قوی ہے۔
(ج:۵،ص:۱۵۲)

ایک ہی مسئلہ میں ان متضاد فتووں سے الجھن یہ پیش آتی ہے کہ جنازہ کا مسنون طریقہ وہ ہے جس کا بیان مولانا نے اپنی کتاب ''کتاب الجنائز'' میں کیا ہے، یا اس کا مسنون طریقہ وہ ہے جو دوسرے علماءِ اہلحدیث کے فتووں میں مذکور ہے۔

قرآن کی سورتوں اور آیات کو پڑھ کر مردہ کو ثواب پہونچانے کے بارے میں مولانا نے کوئی واضح بات نہیں بتلائی ہے، اس کو بالکل گول مول رکھا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ انھیں اس بارے میں کوئی حدیث مرفوع صحیح نہیں ملی، جتنی احادیث ہیں سب ضعیف ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

''حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ یہ روایتیں اگرچہ ضعیف ہیں لیکن ان کا مجموعہ بتلاتا ہے کہ ان کی کچھ اصل ہے۔'' (ص:۹۲)

اب معلوم نہیں کہ ان کے نزدیک مُردوں کو قرآن پڑھ کر بخشنا جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں مولانا نے کچھ صاف اپنا فیصلہ نہیں سنایا، کیا مسائل اسی طرح گول مول بیان کئے جاتے ہیں، اس طرح کی باتوں سے حیرانی بڑھتی ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ: بیہقی نے بہ سند حسن روایت کیا ہے کہ ابووائل نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں لوگ سات اور چھ اور پانچ اور چار تکبیریں کہتے تھے۔

اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں کہ:

''ان پانچ وجہوں کے مجموعہ سے معلوم ہوا کہ اکثر چار ہی تکبیر پر عمل رکھنا چاہئے، اور اگر کبھی پانچ بھی کہہ لے تو درست ہے۔'' (ص:۵۵)

مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ سند حسن سے چھ اور سات تکبیریں بھی ثابت ہیں تو کبھی صرف پانچ ہی کیوں کہنا چاہئے، چھ اور سات بھی کبھار کیوں نہ کہنا چاہئے، کیا کسی صحیح صریح مرفوع متصل حدیث سے اس کی ممانعت آئی، غیر مقلدین کا مسلک بھی خوب ہے، جس کو چاہا قبول کیا اور جس حدیث کو چاہا رد کردیا، اور رہے پھر بھی اہل حدیث کے اہلحدیث۔

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا محمد اسماعیل سلفی کی کتاب رسول اکرم ﷺ کی نماز پر ایک نظر

مولانا محمد اسماعیل السلفی پاکستانی غیر مقلد عالم تھے، اپنی جماعت میں خاصے بھاری بھرکم شمار ہوتے تھے، بعض غیر مقلد عالم نے ان کے بارے میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ امامت کے مقام پر فائز تھے۔(۱) مولانا سلفی کا سب سے بڑا کارنامہ احناف اور علمائے دیوبند کے خلاف مضمون نگاری تھا، زندگی بھر اس کی مشق کرتے رہے، کتاب وسنت کی خدمت انجام دینے سے اللہ نے ان کو محفوظ رکھا تھا، لقب تھا ان کا شیخ الحدیث مگر حدیث کے فن میں ان کا کوئی کارنامہ دیکھنے کو نہیں ملا، ہوسکتا ہے کہ ہو، جہاں تک ہماری رسائی نہ ہوسکی ہو، واللہ اعلم بالصواب

تو اس سلفی غیر مقلد صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے نماز کے بارے میں، نام ہے اس کا ''رسول اکرم ﷺ کی نماز'' ایک دوسرے غیر مقلد عالم نے بھی نماز کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی، نام تھا ان کا صادق سیالکوٹی، کتاب کا نام ہے، صلوٰۃ الرسول

---

(۱) مولانا مقتدیٰ حسن ازہری ان کے بارے میں فرماتے ہیں ''ان کے معاصرین کا اجماع ہے کہ وہ علوم کتاب وسنت کے امام تھے۔'' (الانطلاق الفکری، ص:۳۳)

یعنی رسول ﷺ کی نماز، دونوں غیر مقلد عالم نے رسول اللہ ﷺ کی نماز نامی کتاب لکھی، مگر دونوں کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اسماعیل سلفی صاحب کا رسول اور تھا اور صادق سلفی صاحب کا رسول اور۔! اس لئے کہ دونوں غیر مقلدوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے جو نماز پر کتاب لکھی ہے ان دونوں میں خاصا فرق ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ دونوں کا رسول الگ الگ تھا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اس فرصت میں اسماعیل سلفی صاحب کی کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہے، فرماتے ہیں شیخ الحدیث سلفی صاحب:

''ندی نالوں میں جو پانی بہ رہا ہو وہ پاک ہے، اس میں اگر پلیدی گر جائے تو بھی پلید نہیں ہوگا۔'' ص:۸

اور اس کی دلیل سلفی صاحب نے یہ دی ہے:

''ایک آدمی نے آنحضور سے دریافت کیا کہ کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کرلیں تو آپ نے فرمایا: اس کا پانی پاک ہے۔''

ناظرین! غور فرمائیں مسئلہ ہے بہنے والے ندی نالوں کا، اور دلیل سمندر سے دی جارہی ہے، یعنی ندی نالوں کو سمندر پر قیاس کیا جارہا ہے۔

ابھی کتاب شروع ہی کی ہے کہ قیاس شروع، معلوم ہوا کہ بلا قیاس گاڑی چلنے والی نہیں ہے۔

مولانا سلفی نے یہ حدیث ذکر کی، **الماء طھور لاینجسہ شیٔ**، اور اس کا ترجمہ کیا ہے، ''پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز پلید نہیں کرسکتی، ص:۹ پھر فرماتے ہیں:

''اس حدیث سے ظاہر ہے کہ حوض بہنے والے پانی کنویں کا حکم جس میں زیادہ پانی ہو برابر ہے، یہ معمولی پلیدگی کے گرنے سے پلید نہیں ہوتے۔'' ص:۹

اہلحدیث نام رکھ کر مولانا سلفی کی حدیث رسول میں دھاندلی ملاحظہ فرمائیے! حدیث میں ہے کہ پانی پاک ہے اسے کوئی چیز پلید نہیں کرسکتی، اور اس حدیث رسول کے خلاف آپ فرماتے ہیں: زیادہ پانی والا کنواں ناپاک نہیں ہوگا، اور معمولی پلیدگی سے

حوض اور بہنے والے پانی ناپاک نہیں ہوتے یعنی زیادہ سے ناپاک ہو جاتے ہیں، جو بات حدیث رسول میں دور دور تک نہیں، اس کو اپنی طرف سے گڑھ رہے ہیں، اور نام رکھے ہوئے ہیں شیخ الحدیث اور اہلحدیث۔

فرماتے ہیں: بعض حالات میں پانی پلید ہو جاتا ہے، اگر پانی کے اوصاف میں سے کوئی وصف بدل جائے اور دلیل میں پیش کیا ہے اس حدیث کو،

ان الماء طهور لاینجسه شئ پانی پاک ہے لیکن پلیدگی گرنے کی
إلا ماغلب علیٰ ریحه وطعمه وجہ سے اگر اس کی رنگت، بو مزہ بدل
ولونه بنجاسة تحدث فیه جائے تو وہ پلید ہو جائے گا۔

طبیعت چاہتی ہے کہ پڑھ دوں ''بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن'' قارئین زمزم یہ حدیث ضعیف ہے، خود مولانا سلفی فرماتے ہیں:

''اس کی سند بالاتفاق ضعیف ہے۔'' حاشیہ ص:۶

بالاتفاق ضعیف حدیث کیوں قابل عمل ٹھہری، اس لئے کہ بقول اسماعیل سلفی صاحب اس زیادت کو تمام امت نے بالاتفاق قبول کرلیا ہے۔ (ایضاً)

کیا کسی غیر مقلد میں دم خم ہے کہ مولانا سلفی کے اس دعویٰ کو کہ اس زیادت کو تمام امت نے بالاتفاق قبول کرلیا ہے، صحیح ثابت کردے، امت میں ابن حزم اور داؤد ظاہری ہیں یا نہیں، کیا انھوں نے اس زیادت کو قبول کیا ہے؟

کوئی ہمیں جواب دے جواب چاہتا ہوں میں

اور دوسری وجہ اس ضعیف حدیث کو قبول کرنے کی کیا ہے؟ مولانا سلفی کا ارشاد ہے:

''اس کی قبولیت پر عملی تواتر ثابت ہے۔'' (ایضاً)

یہاں عملی تواتر مستقل حجت بن گیا ہے اور یہی عملی تواتر تراویح والے مسئلہ میں غیر مقلدوں کو قبول نہیں، آٹھ رکعت کے عدم ثبوت پر عملی تواتر ثابت ہے، ائمہ اربعہ کے تمام مقلدین اس پر متفق ہیں کہ تراویح آٹھ رکعت نہیں ہے، صحابۂ کرام کے زمانے سے

لے کر آج تک آٹھ رکعت تراویح کبھی نہیں پڑھی گئی، ائمہ اربعہ میں سے کسی نے آٹھ رکعت تراویح نہیں پڑھی، بیس اور بیس سے زیادہ ہی پر ہر زمانہ میں عمل ہوتا رہا ہے، مگر امت کا یہ عملی تواتر غیر مقلدین کو قبول نہیں، اور جو حدیث بالاتفاق ضعیف ہے وہ قبول ہے اس لئے کہ اس پر امت کا عملی تواتر ثابت ہے۔

غیر مقلدین کے منہ میں زبان ہے، ہاتھ میں قلم ہے، فکر آزاد ہے، جو چاہیں کہہ دیں اور جس چیز کو چاہیں دین بنالیں، انھیں کس کا ڈر، کس کا خوف۔

اسماعیل سلفی صاحب نے بالاتفاق ضعیف حدیث کو قبول کرنے کی جو علت بیان کی ہے یہ ان کا اجتہاد اور ان کی اپنی فکر صائب نہیں ہے بلکہ ان کا یہ فرمان نواب صدیق حسن خان کی تقلید میں ہے (دیکھو الروضۃ الندیۃ، ج:۱ص:۲۲)

اسماعیل سلفی صاحب فرماتے ہیں:

"اگر کوئی پاک چیز پانی میں ملادی جائے تو پانی خالص نہیں رہے گا، یہ کسی چیز کو پاک نہیں کرسکتا۔" (ص:۱۰)

یعنی عرق گلاب، عرق کیوڑہ اگر پانی میں ملادیا جائے تو اس پانی سے نہ وضو کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس سے کپڑے اور بدن کو پاک کیا جاسکتا ہے، واہ رے فقاہت ماشاءاللہ چشم بددور

اس شاہی فیصلہ پر حدیث سے کوئی دلیل ہے؟ بولے نہیں، ہم خود مجتہد ہیں، نہ کتاب اللہ کی ضرورت اور نہ حدیث رسول اللہ کی۔

اوپر کی عبارت ایک دفعہ اور پڑھ لیں، پھر مولانا سلفی صاحب کی اس عبارت شریف میں غور فرمائیں۔

"سیلاب کے پانی کا رنگ مٹی کی وجہ سے بدل جاتا ہے، مٹی چونکہ پاک ہے (اس لئے) یہ پانی پاک ہوگا۔" (ص:۱۱)

سلفی صاحب نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ پانی پاک کرنے والا بھی ہوگا یا نہیں، اس لئے کہ پانی خالص نہیں ہے مٹی والا ہے، گو مٹی پاک ہے مگر عرق گلاب اور عرق کیوڑہ بھی

تو پاک تھا، تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ سیلاب کا مٹی والا پانی صرف پاک ہوگا پاک کرنے والا نہیں ہوگا ورنہ اوپر والی بات اور اس بات میں تضاد ہوگا۔

یہ غیر مقلدین مجتہدین کی فقاہت کا نمونہ ہے، دیکھتے رہیں اور سر دھنتے رہیں۔

پانی کی حد کیا ہو جس پر ناپاکی اثر نہیں کرتی ہے، سلفی صاحب نے اپنا مذہب چھپا لیا ہے اور شوافع حنفیہ کا نام لے کر مسئلہ کو چلتا کر دیا، جس حدیث سے شوافع استدلال کرتے ہیں اس کا ذکر کیا مگر یہ نہیں بتلایا کہ ان کے نزدیک یہ حدیث قابل حجت ہے بھی یا نہیں، اور ان کا مذہب کیا ہے، فرماتے ہیں:

''ایسا پانی جس پر پلیدی کا اثر نہیں ہوتا شوافع کے نزدیک اس کی حد دو بڑے مٹکے ہیں، احناف نے اس کی حد دَہ دردَہ بتلائی ہے۔'' (ص:۱۱)

احناف نے کیا بتلایا، شوافع نے کیا بتلایا، اس سے آپ کو مطلب کیا ہے؟ آپ تو اپنا مذہب بتلایئے۔

فرماتے ہیں اہلحدیث مولانا محمد اسماعیل صاحب جنابت سے غسل کے بیان میں:

''آنحضرت ﷺ نے فرمایا تحت کل شعر جنابة بال بال میں جنابت کا اثر ہوتا ہے۔'' (ص:۱۲)

غیر مقلدین اہلحدیث کہیں گے کہ لوگو! صحیح حدیث پر عمل کرو، ضعیف حدیث سے استدلال حرام ہے، اب ان شیخ الحدیث صاحب سے کوئی پوچھے کہ آپ نے جو حدیث ذکر کی ہے کیا وہ صحیح ہے؟ اس حدیث کی سند میں حارث نامی ایک شخص ہے، مولانا مبارکپوری فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں ھو ضعیف جداً، وہ بہت ضعیف ہے، امام ابوداؤد فرماتے ہیں حدیثه منکر وھو ضعیف، اس کی حدیث منکر ہے اور وہ ضعیف ہے، امام شافعی فرماتے ہیں الحدیث لیس بثابت یعنی یہ حدیث ثابت نہیں ہے، بیہقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا امام بخاری و امام ابوداؤد نے انکار کیا ہے (تحفۃ الاحوذی، ج:۱، ص:۱۰۸)

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ شیخ الحدیث صاحب نے کیسی صحیح حدیث پیش کی ہے، اور کمال ہے کہ بالکل خاموش گذر جاتے ہیں کہ لوگ دھوکہ میں رہیں کہ اتنا بڑا محدث بھلا ضعیف حدیث سے استدلال کرے گا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب فضائل اعمال میں اگر فضائل کے باب میں بھی ضعیف حدیث ہوتو غیر مقلدین آسمان سر پر اٹھالیں گے اور اس کا خوب چرچا کریں گے ور یہاں نماز والی کتاب میں اور پاکی اور ناپاکی کے بیان میں شیخ الحدیث سلفی صاحب بلا دھڑک ضعیف حدیث سے استدلال کررہے ہیں، ہائے ''شرم تم کو مگر نہیں آتی''

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی صاحب اس عنوان کے تحت کہ ''غسل کب ضروری ہے؟'' نمبر۲ میں فرماتے ہیں:

''میاں بیوی جنسی ضرورت پوری کریں۔''

''اور اگر جنسی ضرورت میاں بیوی کہیں اور سے پوری کریں تو غسل واجب نہیں ہوگا؟

نمبر۶ میں فرماتے ہیں:

''استحاضہ کی صورت میں کم از کم ایک دفعہ غسل ضروری ہے۔'' ص:۱۳

براہ کرم کتاب وسنت سے اس کی دلیل پیش کریں، ہوا میں باتیں نہ کریں۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

''جمعہ کا غسل بھی مسنون ہے جیسا کہ آئندہ آئے گا۔'' ص:۱۳

اور جو آئندہ آیا ہے وہ یہ ہے:

''جمعہ کے دن غسل کرنا ضروری ہے۔'' ص:۱۱۹

جمعہ کا غسل مسنون ہے، جمعہ کا غسل ضروری ہے۔ معمہ بن گیا جمعہ کا غسل، نہ سمجھنے کا یہ سمجھانے کا۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

''عورت جب ماہواری کے ایام سے فارغ ہو یا پیدائش کے بعد جو خون آتا

ہے (نفاس) وہ بند ہو جائے تو اس کا جسم پلید ہوگا۔ ص: ۱۳(۱)

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حیض ونفاس کے ایام میں عورت کا جسم پلید نہیں ہوگا جب یہ خون بند ہو جائیں تو اس کا جسم پلید ہوگا۔ ماشاء اللہ! کیا فقاہت ہے، چشم بددور۔

اور یہ بھی ارشاد ملاحظہ ہو:

''مستحاضہ کو ہر نماز کے وقت وضو کر لینا چاہئے۔'' ص: ۱۴

اور اس کی دلیل؟ تو وہ یہ فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ فاطمہ بنت حبیش نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا میں خون سے کبھی پاک نہیں ہوتی تو کیا میں نماز چھوڑ دوں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ رگ کا خون ہے حیض نہیں ہے، جب حیض کے ایام آئیں تو نماز چھوڑ دو جب گزر جائیں تو غسل کر کے نماز پڑھ لو۔

مسئلہ کیا ہے اور شیخ الحدیث صاحب کی دلیل کیا ہے؟ مارو گھٹنا پھوٹے سر کا نمونہ، اور سکھلانے جا رہے ہیں رسول اکرم کی نماز، حائضہ اور مستحاضہ کا فرق جن کو معلوم نہیں وہ مجتہد بننے کا شوق رکھتے ہیں۔

شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں:

''استحاضہ، سلسل بول، جریان کے مریض ہر نماز کے لئے وضو کریں، اگر ہر نماز یا دو نمازوں کے لئے غسل کریں تو یہ افضل ہے۔'' ص: ۱۴

خط کشیدہ مسئلے کو حدیث رسول سے غیر مقلد اہلحدیث سلفی صاحب ثابت کریں، بلا حدیث رسول اپنی طرف سے بات پیدا کرنا تمہارے نزدیک حرام ہے۔ اور صحابہ کا عمل تمہارے مذہب میں حجت نہیں۔ تمہارے نواب صاحب فرماتے ہیں:

'' وأما مافی صحیح مسلم أن أم حبیبة کانت تغتسل لکل صلوٰة

---

(۱) جسم پلید ہوگا، یہ بھی خوب کہی، کیا حیض یا استحاضہ کی وجہ سے عورت کا جسم پلید ہوتا ہے؟ مجتہد صاحبوں کے کیا کہنے۔

فلاحجة فی ذلک لأنها فعلته من جهة نفسها ولم یامرها النبی ﷺ بذلک۔ (الروضة الندیة، ص:۱۰۶)

یعنی صحیح مسلم میں جو یہ آیا ہے کہ ام حبیبہؓ ہر نماز کیلئے غسل کرتی تھیں تو اس میں کوئی دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ وہ یہ عمل اپنی طرف سے کیا کرتی تھیں، آنحضور نے ان کو اس کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔"

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

"جنابت اور حیض ونفاس سے غسل ضروری ہے، لیکن ان سے جسم پلید نہیں ہوتے۔" ص:۱۴

اور صفحہ ۱۰ پر فرماتے ہیں:

"انسان کا جسم پلید ہو تو نماز نہیں ہوتی بلکہ نماز سے پہلے غسل ضروری ہوگا۔"

اور صفحہ ۱۳ پر فرما چکے ہیں کہ "حیض ونفاس سے جسم پلید ہوگا۔"

قارئین غور فرمائیں کہ غیر مقلدین کے مذہب میں حیض ونفاس اور جنابت کی حالت میں جسم پلید بھی ہوتا ہے اور جسم پلید نہیں بھی ہوتا ہے، یہ کیا بات ہوئی، کیا غیر مقلد اہلحدیث شیخ الحدیث صاحب "رسول اکرم کی نماز" اسی طرح کی ہذیانی باتیں بول کر سکھلائیں گے۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث مجتہد سلفی صاحب:

"حضرت عائشہ فرماتی ہیں: کان یباشرنی وأنا حائض، حیض کے ایام میں میرے پاس لیٹ جاتے۔"

یباشرنی کا ترجمہ میرے پاس لیٹ جاتے، ماشاء اللہ، قابلیت کا اچھوتا نمونہ، عربی دانی کا اعلیٰ کمال، اجتہاد کی نئی قسم، جی ہاں یہ ہیں غیر مقلد مجتہد شیخ الحدیث سلفی صاحب، اور اسی کے بل بوتے پر "رسول اکرم کی نماز" سکھلانے کا حوصلہ پیدا ہوگیا ہے۔

ناظرین کرام! ہمارے سلفی مجتہد صاحب بڑے ذی صلاحیت مجتہد ہیں،

بڑے باکمال آدمی ہیں، ان کی صلاحیت علمیہ واجتہاد کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں: حائضہ اور جنبی مسجد میں ٹھہر نہیں سکتے، اور اس کی دلیل میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

إني لاأحل المسجد لحائض ولاجنب، اور اس کا ترجمہ بڑا دلچسپ فرماتے ہیں، آپ بھی سنئے اور سر دھنئے:

"حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد میں ٹھہرنا درست نہیں ہے۔" ص:۱۵

اہل علم داد دیں اس شاندار ترجمہ کی، اس کا نام ہے قابلیت، کیوں نہ ہو ان جیسے بزرگوں کو اجتہاد کا حق حاصل، ایسے قابل لوگ بھلا تقلید کریں گے، ناظرین کرام اس حدیث کا مقلدانہ ترجمہ یہ ہے۔ آنحضور ﷺ فرماتے ہیں:

"میں حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد کو حلال نہیں کرتا۔"

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حائضہ اور جنبی کو مسجد سے گزرنا بھی درست نہیں ہے، مگر شیخ الحدیث صاحب نے حدیث رسول کا فریب کارانہ ترجمہ کر کے اس کے صحیح مفہوم سے عوام کو آگاہ نہیں کرنا چاہتے۔ **وإلى الله المشتكىٰ**

سلفی شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں:

"کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہئے۔" ص:۱۶

اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری غیر مقلدوں کے محدث اعظم فرماتے ہیں:

هو دال على الجواز من غير كراهة، یعنی کھڑے ہو کر پیشاب کرنا بلا کراہت جائز ہے۔" (تحفۃ الاحوذی، ج:۱، ص:۲۴)

اور فرماتے ہیں کہ جب تسلیم ہے کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا رخصت ہے تو اس سے منع نہیں کیا جائے گا۔

بعد التسليم أن البول قائماً رخصة لاوجه للمنع عنه في هٰذا الزمان (ایضاً)

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی رخصت ہے، اس سے منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اب یا تو غیر مقلدین شیخ الحدیث سلفی صاحب کے کہنے پر عمل کریں، یا محدث اعظم مبارکپوری کی تحقیق کو قبول کریں اور کھڑے ہو کر پیشاب کی عادت بنائیں۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث سلفی صاحب:

''وضو سے پہلے بسم اللہ ضرور پڑھے۔'' ص:۱۶

شیخ الحدیث صاحب نے نہ ذکر کی بسم اللہ کے ضرور پڑھی جانے والی حدیث اور گذر گئے چپکے سے، اگر کرتے ذکر اس حدیث کو تو ظاہر ہوتا کہ وہ ہے حدیث ضعیف، فرماتے ہیں امام ترمذیؒ:

لاأعلم في هذا الباب حديثاً له اسناد جيد (ترمذی) یعنی اس بارے میں کوئی عمدہ سند والی حدیث میرے علم میں نہیں ہے۔

ناظرین! دیکھیں کہ ضعیف حدیث سے بسم اللہ کو وضو میں ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

''وضو کے اعضاء کو تین دفعہ سے زائد نہیں دھونا چاہئے، ایک یا دو دفعہ دھونا بھی درست ہے، بشرطیکہ صفائی ہو جائے۔'' ص:۱۷

وضو، اعضاء کی صفائی کے لئے ہوتا ہے، چہ خوب، اعضاء وضو کی صفائی تو کبھی تین دفعہ سے بھی نہیں ہوگی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے وضو ایک مرتبہ بھی کیا، دو مرتبہ بھی اور تین مرتبہ بھی۔ (ترمذی)

آپ ﷺ نے ایک مرتبہ اور دو مرتبہ وضو کے صحیح ہونے کے لئے اعضاء وضو کی صفائی کی کوئی قید نہیں لگائی۔

اور سلفی صاحب کی شریعت یہ ہے کہ ایک مرتبہ اور دو مرتبہ وضو اسی وقت درست ہوگا جب اعضاء کی صفائی ہو جائے، اس کا نام اجتہاد، ماشاء اللہ چشم بد دور۔

گر مجتہد چنیں بود کارِ دیں تمام خواہد شد

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

''شرم گاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا'' ص:۱۸

اور کیوں نہیں ٹوٹتا، تو ان کا خیال ہے کہ اس بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ اب آیئے دیکھئے کہ شیخ الحدیث صاحب کا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے۔

بسرہ بنت صفوان فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **من مس ذکرہ فلایصل حتیٰ یتوضأ** یعنی جس نے اپنی شرم گاہ کو چھوا تو نماز نہ پڑھے جب تک وضو نہ کرلے۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: **ھٰذا حدیث حسن صحیح**، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس روایت کی شرح میں مولانا مبارکپوریؒ فرماتے ہیں: **فیہ دلیلٌ علیٰ أن مس الذکر ینقض الوضوء** (تحفہ، ج:۱، ص:۸۵) یعنی اس میں دلیل ہے کہ شرم گاہ کا چھونا وضو کو توڑ دیتا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی صحیح حدیث کو غیر صحیح کہنا بڑی جرأت کی بات ہے، کیا اس قسم کی باتوں سے رسول اکرم ﷺ کی نماز سکھلائی جائے گی۔ نواب وحیدالزماں فرماتے ہیں: **وینقض بمس الذکر** (نزل الابرار، ج:۱، ص:۱۹) یعنی شرم گاہ چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

غیر مقلدین کے ہاتھ میں فیصلہ ہے کہ وہ اپنے ان مجتہدوں میں سے کس کی بات مان کر رسول اکرم کی نماز سیکھیں گے۔ (معلوم ہوتا ہے کہ سلفی شیخ الحدیث صاحب امام ابوحنیفہؒ کی تقلید میں یہ کہہ گئے ہیں) فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب نماز کے بیان میں:

''احادیث میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے، فرائض، سنن، مستحبات تک کا بیان فرمادیا گیا ہے۔'' (ص:۱۹)

جی ہاں! ہم بھی منتظر ہیں کہ احادیث رسول سے نماز کے فرائض، سنن، مستحبات وغیرہ کا بیان شیخ الحدیث صاحب ثابت کریں گے، اور حدیث رسول میں فرائض، سنن،

مستحبات کی تصریح دکھلائیں گے ، اگر شیخ الحدیث صاحب نے ایسا کر دیا تو امت پر احسان عظیم ہوگا اور لوگ فقہ سے مستغنی ہو جائیں گے۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث سلفی صاحب بعد نقل کرنے چند احادیث کے:

''ان آثار و احادیث سے ظاہر ہے کہ نماز اسلام کا ایک رُکن ہے، اس کا ترک کرنا کفر ہے، نماز کے تارک کو کافر و مشرک فرمایا گیا ہے۔'' ص:۲۱

ذرا وہ حدیث پیش فرمادیں جس میں نماز کے تارک کو مشرک کہا گیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ سلفی شیخ الحدیث کو کفر اور شرک کا فرق بھی معلوم نہیں، اور شوق ہوا ہے کہ اجتہاد کریں گے اور دوسروں کو رسول اکرم کی نماز سکھلائیں گے۔

اس کے بعد شیخ الحدیث سلفی صاحبؒ نے کفر کی دو قسم قرار دی ہے، کفر عملی و کفر اعتقادی۔ اور تارک صلوٰۃ کو کفر عملی والا قرار دیا ہے، شیخ الحدیث صاحب سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ ایک صرف ایک حدیث پیش کر دیں جس میں آنحضور اکرم ﷺ نے کفر کی ان قسموں کا ذکر فرمایا ہو، انشاء اللہ شیخ الحدیث صاحب سر پٹک کر رہ جائیں گے مگر اس کا ثبوت وہ حدیث سے نہیں پیش کر سکتے۔ کفر کی یہ تقسیم شیخ الحدیث سلفی صاحب کی اپنی رائے ہے، اور دین میں رائے سے جو بات کہی جائے وہ حرام ہے مذہب شیخ الحدیث میں۔

شیخ الحدیث سلفی صاحب نے اذان و اقامت کے بیان میں کہیں اس کا ذکر نہیں کیا کہ حدیث میں ان کا حکم کیا ہے؟ یہ فرض ہیں، واجب ہیں، سنت ہیں، مستحب ہیں ، ان کے تارک کا کیا حکم ہے ، بلا اذان و اقامت نماز درست ہو گی یا نہیں ؟ ان تمام تفصیلات سے شیخ الحدیث صاحب نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

اب کوئی بتلائے کہ رسول اکرم ﷺ کی نماز کے صحیح طریقہ کی طرف کتاب وسنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی کیسے ہوگی؟ شیخ الحدیث صاحب نے یہ بھی نہیں بتلایا کہ اذان اور اقامت کے وقت کانوں میں انگلی ڈالی جائے گی یا بلا انگلی ڈالے اذان و اقامت کہی جائے گی، یا صرف اذان میں انگلی ڈالی جائے گی اور اقامت میں نہیں، یعنی نماز و اقامت کا پورا مسئلہ بھی نہیں بیان کیا، تو رسول اکرم ﷺ والی پوری نماز ہم جاہل کیسے

سیکھیں گے۔

شیخ الحدیث سلفی صاحب نے اذان کے بعد کی دعا نقل کی ہے مگر کہیں اس کا حکم نہیں بیان کیا ہے کہ آیا ازان کے بعد کی یہ دعا بطور فرض پڑھی جائے گی یا بطور سنت یا بطور مستحب یا بطور مباح، حالانکہ جب تک کہ اس کا حکم نہ بتلا دیں یہ کتاب نماز کے بیان میں ناقص رہے گی۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

''حی علی الفلاح کے بعد موذن الصلوٰۃ خیر من النوم کہے۔'' ص:۳۰

الصلوٰۃ خیر النوم کہےتو کیسے کہے؟ بطور فرض کہے یا بطور سنت یا بطور مستحب، ہمیں حدیث سے اس کا حکم نکال کر بتلائیے، یہ کیسے شیخ الحدیث صاحب ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی نماز سکھلا رہے ہیں اور عمل کا حکم بتلاتے ہی نہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے حضرت بلال سے فرمایا:

''فجر کے سوا کسی وقت تثویب مت کہو۔'' ص:۳۱

آنحضور ﷺ کا ارشاد واضح کر رہا ہے کہ فجر کی نماز میں تثویب ضروری ہے، تو کیا آپ کے یہاں تثویب کا حکم اور فاتحہ کا حکم ایک ہی ہے، براہ کرم اس کو حدیث کی روشنی میں واضح تو فرمائیں۔

شیخ الحدیث صاحب نے نماز باجماعت کے بارے میں بہت سی حدیثیں ذکر فرمائی ہیں، اللہ ان کو جزائے خیر دے، مگر صاف صاف کھل کر نماز باجماعت کا حکم نہیں بیان فرمایا کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض ہے، واجب ہے، سنت ہے۔ آخر اہلحدیث مسلک میں یہ ہے کیا، فلاں امام واجب سمجھتا ہے اور فلاں امام واجب نہیں سمجھتا ہے، اس سے آپ کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ مذہب اہلحدیث سے لوگ کیسے واقف ہوں گے ،نماز کے بارے میں کتاب تالیف فرمارہے ہیں اور نماز باجماعت کا حکم بیان کرنے سے آپ گریزاں ہیں، آپ صریح اور صحیح حدیث سے نماز باجماعت کا حکم بیان فرمائیے، اپنی رائے کا اظہار مت فرمائیے، اگر آپ کی رائے ہی دین ہوگی تو ہم ائمہ مجتہدین کو آپ پر

مقدم رکھیں گے۔

شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں:

''بہر حال جماعت واجب ہو یا سنت اس کا بلا عذر تارک باتفاق ائمہ مجرم ہے۔'' ص:۲۴

یعنی آپ کا اپنا کوئی فیصلہ نہیں ہے، ابھی آپ کو یہی نہیں پتہ کہ جماعت واجب ہے یا سنت، اور اس پر شوق ہوا ہے کہ نماز کے بارے میں کتاب تالیف کرنے کا، غیر مقلدیت اختیار کر کے کوئی صحیح نماز بھی نہیں پڑھ سکتا، اور نہ کوئی غیر مقلد نماز کے مسائل کو صحیح حدیث سے ثابت کر سکتا ہے، رفع یدین، آمین بالجہر میں ساری صلاحیتیں ان کی صرف ہوگئیں اور ان کے شیخ الحدیث صاحب تک کو احادیث کی روشنی میں جماعت کا حکم نہیں معلوم ہوسکا۔

یہ شیخ الحدیث صاحب اس کتاب میں ''درست ہے'' ''درست نہیں ہے'' کی رٹ بہت لگائے ہوئے ہیں، مگر اہل علم جانتے ہیں کہ شرعی مسائل میں اس قسم کے الفاظ سے کام نہیں چلتا، درست ہے، نادرست ہے، اس سے مسئلہ کا حکم نہیں معلوم ہوتا ہے، درست ہے اور نادرست ہے تو اولیٰ اور غیر اولیٰ کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔

شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں کہ:

''بلا عذر جماعت چھوڑنا درست نہیں۔'' ص:۲۴

اس درست نہ ہونے کا کیا مطلب ہے، حرام ہے یا اولیٰ نہیں ہے، صاف صاف جماعت کا حکم صحیح حدیث سے واضح کیجئے، ورنہ چھوڑ دیجئے نماز کے بارے میں کتاب لکھنے کا شوق۔

امامت کے بیان میں امام سلفی صاحب ایک ضعیف حدیث نقل کر کے جس کا مضمون یہ ہے کہ امام بہتر آدمی کو بنانا چاہئے، فرماتے ہیں:

''اس سے ظاہر ہے کہ امام مقرر کرتے وقت بہتر آدمی کا انتخاب کرنا چاہئے۔''

پھر فرماتے ہیں:

''حدیث گو ضعیف ہے لیکن صحیح احادیث سے اس کے مضمون کی تائید ہوتی

ہے۔''ص:۲۶

ناظرین! دیکھ رہے ہیں کہ سلفی شیخ الحدیث صاحب بلا تکلف ضعیف حدیث سے استدلال کررہے ہیں اور لوگوں کو تسلی دیتے ہیں کہ صحیح احادیث سے اس کے مضمون کی تائید ہوتی ہے، اگر صحیح حدیث تھی تو اس کو پیش کرنے میں شرم کیوں آرہی تھی، صحیح حدیث کے ہوتے ہوئے ضعیف حدیث سے استدلال کرنا آپ کے مذہب میں جائز کب سے ہوگیا۔ اچھا آپ فرمائیے:

(۱) ایک آدمی خوبصورت ہے اور ایک بدصورت، اور دونوں ہی امام ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، تو امام آپ کس کو بنائیں گے؟

(۲) ایک آدمی معلوم النسب اور شریف النسب ہے، اور دوسرا مجھول النسب اور عرف عام میں شریف النسب نہیں کہلاتا، بقیہ اوصاف میں دونوں برابر ہیں، آپ امام کس کو بنائیں گے؟

(۳) ایک خوش آواز ہے اور ایک کریہہ الصوت (بدآواز) ہے، بقیہ اوصاف میں دونوں برابر ہیں، آپ امام کس کو بنائیں گے؟

سردست ان تین آدمیوں کے بارے میں آپ فیصلہ فرمادیں کہ امامت کا مستحق ان تینوں میں (دونوں کے اقرأ، أعلم، أورع اور ہم عمر ہونے کی صورت میں) زیادہ کون ہے؟ إجعلوا أئمتكم خياركم (اچھے لوگوں کو امام بناؤ) والی حدیث کو سامنے رکھ کر جواب دیں۔

شیخ الحدیث سلفی صاحب فرماتے ہیں:

باجماعت نماز میں امام کی اقتدا ضروری ہے۔''ص:۳۸

ضروری ہونے کیا مطلب ہے، فرض ہے، واجب ہے، سنت ہے، ہمارے شیخ الحدیث صاحب اس کی وضاحت نہیں فرماتے ہیں، معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے، حالانکہ رسول اکرم ﷺ کی نماز سکھلانے کا دعویٰ ہے، اور حال یہ ہے کہ نہ حدیث سے کسی عمل کی فرضیت ثابت کرتے ہیں، نہ اس کا وجوب اور نہ اس کا سنت ہونا۔ بس ضروری ہے،

درست ہے، درست نہیں ہے، اس قسم کے الفاظ بول کر چلتے بن رہے ہیں۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

''حضرات اہلحدیث اور دوسرے موحد گروہ بھی اس غلطی میں از اوّل تا آخر مبتلا ہیں۔'' ص:۴۱

غیر مقلدین حضرات، ہندو پاک میں اہلحدیث کے سوا دوسرے موحد گروہ کی تفصیل فرمائیں، کرم ہوگا، نوازش ہوگی۔ معلوم ہوا کہ صرف غیر مقلدین ہی موحد نہیں ہیں بلکہ ہندو پاک میں دوسرے موحد بھی الحمدللہ موجود ہیں۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

''نماز میں اطمینان بے حد ضروری ہے۔'' ص:۴۲

بے حد ضروری ہے کا کیا مطلب ہے؟ فرض ہے، واجب ہے، سنت موکدہ ہے، مستحب ہے، آخر آپ اس کی وضاحت کیوں نہیں فرماتے، گول مول مسئلہ بتلانا، عوام کو گمراہ کرنا ہے، کسی نے اطمینان سے نماز نہیں پڑھی تو نماز فاسد ہوگی، باطل ہوگی، یا ناقص ہوگی، سجدہ سہو سے اس کا نقصان پورا ہوگا یا نہیں، ان ساری تفصیلات کا علم ضروری ہے۔

شیخ الحدیث صاحب سلفی فرماتے ہیں:

''پہلی اور تیسری رکعت سے اٹھے تو تھوڑی دیر ٹھہر کر اٹھے، اسے جلسۂ استراحت کہا جاتا ہے۔'' ص:۴۳

یہاں بھی وہی تجاہل عارفانہ، حدیث کی روشنی میں جلسۂ استراحت کیا حکم ہے؟ واجب ہے، فرض ہے، سنت ہے، حدیث میں جو اس کا حکم ہو اس کو آپ بیان کریں۔ کیسے ہیں شیخ الحدیث سلفی صاحب جن کو شوق ہوا ہے نماز کے بارے میں کتاب لکھنے کا۔

ایک بات شیخ الحدیث سلفی صاحب نے صحیح فرمائی، ان کا کہنا یہ ہے کہ نماز کے بعض ضمنی مسائل میں قدیم زمانہ سے اختلاف چلا آیا ہے اور ''یہ اختلاف عموماً اس قدر دیرینہ ہیں کہ کسی تحقیق اور ترجیح کو بھی حرف آخر نہیں کہا جا سکتا۔'' ص:۴۴

سن لیں کان کھول کر غیر مقلدین زمانۂ حاضر، کیا ارشاد ہے ان کے سلفی صاحب، ور پھر بند کریں اپنی بکواس کہ جو طریقۂ نماز انھوں نے اختیار کر رکھا ہے وہی صحیح ہے۔

چٹکیاں لیتی ہے فطرت چیخ اٹھتا ہے ضمیر
کوئی کتنا ہی حقیقت سے گریزاں کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں شیخ الحدیث سلفی صاحب:

''زبان سے نیت باتفاق ائمہ منع ہے۔'' ص: ۴۵

سوال یہ ہے شیخ الحدیث صاحب مدظلہ کہ ائمہ کے اقوال دینی وشرعی مسائل میں آپ کے یہاں معتبر ہیں؟ حرام وحلال، جائز اور ناجائز بتلانے کا حق غیر مقلدین کے مذہب میں ائمہ کو کب سے دے دیا گیا ہے؟ کفر وشرک والا یہ کام آپ کے مذہب میں بھی جائز قرار پا گیا اور اور ائمہ کو اربابا من دون اللہ بنالیا گیا۔(۱)

آپ اہلحدیث ہیں، ائمہ کو مت دیکھئے وہ حدیث پیش کیجئے جس سے صاف صاف معلوم ہو کہ زبان سے نیت کرنا حرام ہے، ائمہ کیا کہتے ہیں اسکو مقلدین کے لئے رہنے دیجئے۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

''نماز شروع کرتے وقت تکبیر تحریمہ کے علاوہ کوئی لفظ زبان سے نہیں کہنا چاہئے۔'' ص: ۴۵

یہ آپ کا فیصلہ ہے یا رسول اللہ کا حکم، اگر آپ کا فیصلہ ہے تو ہمیں قبول نہیں، آپ کون ہیں دین کے بارے میں اپنی رائے سے فیصلہ سنانے والے، اور اگر یہ حدیث کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر، پیش کیجئے وہ حدیث، ہم بھی دیکھیں آپ کی شیخ الحدیثیت

(۱) غنیۃ الطالبین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ہے، اس میں زبان سے نیت کرنے کو جائز کہا گیا ہے، اس کتاب کو بڑی خیانت کے ساتھ غیر مقلدین نے خود شائع کیا ہے، بڑی خیانت کا مطلب یہ ہے کہ تراویح کے بیان میں اس کتاب کا پورا مسئلہ غلو بنا دیا ہے۔

واہلحدیثیت ، ورنہ چپ رہئے بیچ شریعت بات کہنے سے اور اپنی رائے دینے سے کہ نکل جاتا ہے آدمی کرنے والا یہ کام اہلحدیث مذہب سے۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب:

''نماز میں مل کر کھڑے ہونا چاہئے۔'' ص:۴۵

یہ چاہئے اور نہ چاہئے کا راگ آپ بہت الاپتے ہیں، اس بکواس کو ختم کر کے بتلایئے کہ نماز میں مل کر کھڑے ہونے کا حکم از روئے حدیث کیا ہے، واجب ہے، فرض ہے، رکن ہے، سنت ہے، مستحب ہے، اس کا جو حکم صاف صاف حدیث میں بیان کیا گیا ہو اس کو بتلایئے تاکہ عوام کو صحیح صورت حال سے آگاہی ہو اور مسئلہ کا واضح حکم معلوم ہو۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث سلفی صاحب:

''تمام ائمہ کے نزدیک مل کر کھڑے ہونا سنت ہے۔'' ص:۴۷

مہربان من سلفی شیخ الحدیث صاحب تمام ائمہ کے نزدیک کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس کو جانے دیجئے، ان ائمہ کے منہ پر اس کو مار دیجئے۔ آپ فرمایئے کہ حدیث میں مل کر کھڑے ہونے کو فرض کہا گیا ہے، یا سنت، واجب یا مستحب، حدیث میں جو اس مسئلہ کا صریح حکم ہو اس کو آپ بتلائیں، یہ کتاب آپ کے دعویٰ کے مطابق حدیث وقرآن کی روشنی میں لکھی گئی ہے، اور رسول اکرم کی نماز سکھلانے کا آپ کو دعویٰ ہے بس بات صرف حدیث وقرآن کی کیجئے، ائمہ کے دامن میں پناہ نہ لیں، یہ کام ان کے مقلدین کریں گے، ہاں تو شیخ الحدیث صاحب کیا کہتے ہیں آپ بیچ اس مسئلہ کے کہ نماز میں مل کر کھڑا ہونا واجب ہے، فرض ہے، سنت موکدہ، سنتِ غیر موکدہ، مستحب ہے، مباح ہے؟

مولانا شیخ الحدیث سلفی نے اپنی کتاب میں حضرت شیخ الہند اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ پر بھی بلاوجہ زبانِ طعن دراز کی ہے۔

حضرت شیخ الہند نے غیر مقلدوں سے مطالبہ کیا کہ رفع یدین کا ثبوت سب کو تسلیم ہے، تم صحیح حدیث پیش کرو جس سے رفع یدین کا دوام ثابت ہو، چونکہ حضرت شیخ الہند کا مطالبہ پورا کرنا غیر مقلدوں کے بس میں نہیں تھا اور نہ اب ہے، تو اس پر ہمارے

سلفی شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ یہ مطالبہ بس ایک چٹکلہ ہے اور اس قسم کے چٹکلے سے دیوبند کے طلبہ مطمئن ہو سکتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

اس قلت علم اور شیوعِ تقلید کے دور میں دیوبند کے طالب علم اس چٹکلے پر مطمئن ہوں گے۔"

اور فرماتے ہیں:

"حضرت الشیخ کا مقام ان چٹکلوں سے بہت ارفع ہے۔" ص:۶۰

اگر شیخ الہند کا یہ مطالبہ محض چٹکلہ تھا تو غیر مقلدوں کو کیا ضرورت پیش آئی تھی کہ رفع یدین کا دوام ثابت کرنے کیلئے موضوع روایت کا سہارا لیں، ان سلفی شیخ الحدیث صاحب نے بھی فمازالت تلک صلوته حتیٰ لقی الله کی جھوٹی روایت سے رفع یدین کا دوام ثابت کرنا چاہا ہے، اور بے شرمی یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں بحث کی ضرورت نہیں ہے، جو بات آپ کے نزدیک چٹکلہ تھی اس کو آپ ثابت کرنے کے لئے موضوع اور جعلی حدیث کا سہارا لیں، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند کی بات اور ان کا مطالبہ کہ رفع یدین کا دوام ثابت کرو، غیر مقلدین پر پہاڑ سے بھی زیادہ بھاری ثابت ہو رہا ہے۔

حضرت شاہ انور صاحب کے متعلق شیخ الحدیث سلفی کی گوہر افشانی ملاحظہ فرمایئے، فرماتے ہیں:

"مرحوم کو مخالف کے دلائل کی قوت سے بے حد ضیق اور دکھ محسوس ہوتا ہے" ص:۶۲

اور فرماتے ہیں:

"شاہ صاحب بے حد متعصب ہیں" ص:۶۲

ناظرین کرام! آپ خود انصاف فرمائیں کہ مخالف کے دلائل سے کون ضیق میں ہے اور کون بے حد متعصب ہے، وہ لوگ جو احادیث میں خیانت کریں، ضعیف اور موضوع حدیث سے استدلال کریں یا وہ لوگ جو ان تہمتوں سے پاک ہیں، رفع یدین ابتداء صلوٰۃ میں تمام امت کے نزدیک بالاتفاق مشروع اور سنت ہے، اور یہ متواتر

احادیث سے بھی ثابت ہے اور امت کے عملی تواتر سے بھی احناف نے اسی اجماعی رفع یدین کو اختیار کرلیا ہے، تو ان کا مذہب تو کمزور ہوگیا اور ان غیر مقلدین نے جو رفع یدین اختیار کیا ہے، اس کی کوئی کَل سیدھی نہیں، وہ قرار پا رہا ہے مسنون اور واجب، واہ رے انصاف! آپ نے دیکھا کہ غیر مقلدین کے اس بڑے عالم شیخ الحدیث سلفی نے اس کتاب میں رفع یدین کی پہلی حدیث میں زبردست گھپلا کیا اور ترجمہ میں بددیانتی کا ریکارڈ توڑ دیا، اور یہ شخص تعصب کا الزام دیتا ہے علامہ انور شاہ کشمیری جیسے غیر متعصب عالم کو۔ شیخ الحدیث محقق صاحب فرماتے ہیں:

"رفع الیدین کی حدیث کے رواۃ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ، ابن مسعودؓ سے بھی برسوں پہلے مسلمان ہوئے۔ (ص:۵۸ حاشیہ)

کیا خوب تحقیق سلفی شیخ الحدیث محقق صاحب کی، اور تاریخ دانی ایسی کہ اہل علم اس پر عش عش کرتے رہ جائیں، محقق سلفی کی تحقیق اور تاریخ دانی یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پہلے مسلمان ہوئے، اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **واسلم قبل عمر وحفظ من فيه رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سبعين سورة** (تذکرہ، ج:۱، ص:۱۶) یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے اسلام لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہان مبارک سے ستر سورتیں یاد کیں، رفع یدین کے مسئلہ نے سلفی محقق شیخ الحدیث صاحب کو چکرا دیا ہے، نہ حافظہ کام کر رہا ہے اور نہ دماغ۔

آیئے رفع یدین کا مسئلہ ہم امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق بھی حل کریں، اہل علم کو معلوم ہے کہ امام بخاری نے رفع یدین پر مستقل ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "جزء رفع یدین" اور یہ رسالہ غیر مقلدین کیلئے اس مسئلہ میں بہت بڑا سہارا ہے۔ ہم اسی رسالہ سے چند حدیثیں نقل کرتے ہیں، ان سے ظاہر ہوگا کہ غیر مقلدین اس مسئلہ میں عوام کو کتنا فریب دیتے ہیں، ذرا ان احادیث میں آپ غور فرمائیں۔

(۱) امام بخاری حضرت عبد اللہ بن عمر کی روایت ذکر کرتے ہیں، اس میں صرف دو جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔ **إذا كبر واذا رفع راسه من ركوع**، یعنی حضرت عبد اللہ

بن عمرؓ نے آنحضور کو صرف دو جگہ رفع یدین کرتے ہوئے دیکھا۔ ابتداء صلوٰۃ کے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت، رکوع میں جاتے وقت کا ذکر نہیں ہے۔ اس لئے غیر مقلدین اس روایت کو چھپاتے ہیں۔

(۲) حضرت ابوحمید ساعدی کی ایک روایت میں بھی صرف دو جگہ کا ذکر ہے ابتداء صلوٰۃ کے وقت، اور رکوع کرتے وقت (یہ پہلی والی روایت کے خلاف ہے، اس کو بھی غیر مقلدین چھپاتے ہیں)

(۳) حضرت علی کی روایت میں دونوں سجدوں سے کھڑے ہونے پر بھی رفع یدین کا ذکر ہے، إذا قام من السجدتین اس کا ایک غیر مقلد ترجمہ کرتا ہے، اور جب دو سجدے کر کے کھڑے ہوتے تو رفع یدین کرتے۔

(۴) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے غیر مقلدین رفع یدین پر استدلال کرتے ہیں، مگر امام بخاری اپنے اس رسالہ میں ان کے لڑکے کی زبانی حضرت عبداللہ بن عمر کا یہ عمل نقل کرتے ہیں: کان إذا رفع راسه من السجود وإذا أراد أن یقوم رفع یدیه، یعنی حضرت عبداللہ بن عمر جب سجدے سے سر اٹھاتے اور جب رکعت پوری کر کے کھڑے ہوتے تو رفع یدین کرتے۔

تین جگہوں پر رفع یدین کی روایت کرنے والے حضرت عبداللہ بن عمر ہیں اور وہ روایت تمام غیر مقلدین کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے، مگر امام بخاری کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عمل صرف تین جگہوں پر رفع یدین کا نہیں تھا بلکہ وہ سجدہ سے سر اٹھا کر بھی رفع یدین کرتے تھے اور رکعت کیلئے کھڑے ہوتے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے، مگر غیر مقلدین امام بخاری رحمہ اللہ کی اس روایت کو بھی چھپاتے ہیں۔

(۵) علقمہ بن وائل اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رکوع سے پہلے (یعنی صرف ایک مرتبہ) رفع یدین کرتے دیکھا۔ (اس روایت کو بھی غیر مقلدین چھپاتے ہیں)

میں نے جزء بخاری سے صرف پانچ روایتیں نقل کی ہیں، ان میں سے کسی

ایک پر بھی غیر مقلدین کا پورا عمل نہیں ہے، حالانکہ ان روایتوں کو اپنے رسالہ میں جمع کرنے والے امام بخاری ہیں جن کے بارے میں کم از کم غیر مقلدوں کو شبہ نہ ہونا چاہئے کہ انھوں نے ضعیف روایتوں سے اپنا یہ رسالہ بھر رکھا ہے۔

غیر مقلدوں کا آخر یہ تعصب نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ خود تو امام بخاری کی بھی روایت کردہ حدیثوں پر ان کا عمل نہ ہو اور دوسرے کو متعصب قرار دیں، ان احادیث پر عمل نہ کرکے وہ گویا اعلان کررہے ہیں کہ لوگو امام بخاری بھی قابل اعتماد نہیں ہیں اور ان کی روایت کردہ روایتوں پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ **معاذ اللہ ثم معاذ اللہ**

میں نے امام بخاری کے رسالہ جزء رفع یدین سے تقریباً چالیس حدیثوں کو نقل کرکے ''زمزم'' میں شائع کردیا تھا، اور اب اُسے اس کتاب کا حصہ بنادیا ہے، ملاحظہ ہو اس کتاب کا صفحہ: ۱۳۶۔ ناظرین اس مضمون کو ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

آمین کی بحث میں پہلے تو شیخ الحدیث صاحب نے سرّاً والی آمین کی روایتوں کو ضعیف قرار دیا، پھر فرماتے ہیں:

''بظاہر جہر اور آہستہ آمین کہے ..... تمام نمازی ہلکی آواز سے آمین کہیں اس سے مسجد گونج سکتی ہے۔'' ص: ۶۵

خدا شیخ الحدیث صاحب کو جزائے خیر دے، ایک بات تو صحیح کہی، آپ غیر مقلدین اس پر عمل کریں، ہم احناف سے بھی گذارش کریں گے کہ بظاہر جہراً اور آہستہ آمین کہا کرو، ہم اطلاعاً عرض کردیتے ہیں کہ شیخ ناصر الدین البانی جن کو آج کل کے غیر مقلدین دنیا کا سب سے بڑا غیر مقلد محدث سمجھتے ہیں، ان کا مذہب آمین کے سلسلہ میں امام شافعی والا مذہب ہے، البانی لکھتے ہیں: **فالاقرب الی الصواب فی هٰذه المسئلة ما ذهب اليه الشافعی أن يجهر الامام دوم الموتمين ، والله اعلم بالصواب۔** (سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ، ج:۲، ص:۳۶۸) ترجمہ: یعنی درست بات وہ ہے جو امام شافعی کا مذہب ہے، کہ امام صرف زور سے آمین کہے گا، مقتدی نہیں۔

نماز میں ہاتھ کہاں باندھا جائے؟ اس کے بارے میں شیخ الحدیث صاحب کا

ارشاد ہے:

''ناف کے نیچے باندھنا یہ احناف کا مذہب ہے، ناف کے اوپر باندھنا امام شافعی اور ان کے فقہاء کا مسلک ہے، سینہ پر ہاتھ باندھنا جماعت اہلحدیث کا معمول ہے۔ص:۶۶

اس سے واضح ہوا کہ احناف کے ساتھ شیخ الحدیث صاحب نے امام شافعی کو بھی جماعتِ اہلحدیث سے خارج کر دیا۔

معلوم نہیں امام ترمذی اہلحدیث تھے یا نہیں، انھوں نے تو صرف دو مذہب کا ذکر کیا ہے، ناف کے نیچے اور ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کا، سینہ کے اوپر ہاتھ باندھنے کا انھوں نے تذکرہ ہی نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی کے وقت میں اس کا بالکل رواج نہیں تھا، یہ جماعت اہلحدیث نے اب ایجاد کیا ہے، اور آج کل تو بعض سلفی سینہ کے اوپر جہاں جانور ذبح کرنے کے لئے چھری رکھی جاتی ہے وہاں ہاتھ باندھتے ہیں، ان کی دلیل سب سے قوی ہے، اس لئے کہ ان کا استدلال قرآن سے ہے۔ قرآن میں ہے: **فصل لربک وانحر**، وانحر کا مطلب بعض غیر مقلدین کے نزدیک سینہ کے اوپر اور گردن کے نیچے نماز میں ہاتھ باندھنا ہے، یہی مذہب ابن باز کا ہے۔

سورہ فاتحہ کے بیان میں ہمارے شیخ الحدیث صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں اہل علم کے لئے بصیرت ہے، غیر مقلدین جاہلین کی بھی اس سے آنکھ کھل سکتی ہے۔

فرماتے ہیں: ہر نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔ص:۶۸

اس بارے میں انھوں نے پہلی حدیث یہ ذکر کی ہے:

عن ابی سعید أمرنا أن نقرأ بفاتحة الکتاب وماتیسر۔

ابوسعید فرماتے ہیں کہ فاتحہ اور کچھ زیادہ پڑھنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

اس حدیث میں جس کو سلفی شیخ الحدیث صاحب نے خود نقل کیا ہے صرف سورہ فاتحہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور پڑھنے کا بھی مصلیوں کو مامور کیا گیا ہے، اب یہ حدیث چونکہ موصوف سلفی شیخ الحدیث صاحب کے مسلک کے خلاف تھی اس وجہ

ایک پر بھی غیر مقلدین کا پورا عمل نہیں ہے، حالانکہ ان روایتوں کو اپنے رسالہ میں جمع کرنے والے امام بخاری ہیں جن کے بارے میں کم از کم غیر مقلدوں کو شبہ نہ ہونا چاہئے کہ انھوں نے ضعیف روایتوں سے اپنا یہ رسالہ بھر رکھا ہے۔

غیر مقلدوں کا آخر یہ تعصب نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ خود تو امام بخاری کی بھی روایت کردہ حدیثوں پر ان کا عمل نہ ہو اور دوسرے کو متعصب قرار دیں، ان احادیث پر عمل نہ کر کے وہ گویا اعلان کر رہے ہیں کہ لوگو امام بخاری بھی قابل اعتماد نہیں ہیں اور ان کی روایت کردہ روایتوں پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ **معاذ اللہ ثم معاذ اللہ**

میں نے امام بخاری کے رسالہ جزء رفع یدین سے تقریباً چالیس حدیثوں کو نقل کر کے ''زمزم'' میں شائع کر دیا تھا، اور اب اُسے اس کتاب کا حصہ بنا دیا ہے، ملاحظہ ہو اس کتاب کا صفحہ: ۱۳۶۔ ناظرین اس مضمون کو ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

آمین کی بحث میں پہلے تو شیخ الحدیث صاحب نے سراً والی آمین کی روایتوں کو ضعیف قرار دیا، پھر فرماتے ہیں:

''بظاہر جہر اور آہستہ آمین کہے.....تمام نمازی ہلکی آواز سے آمین کہیں اس سے مسجد گونج سکتی ہے۔'' ص: ۶۵

خدا شیخ الحدیث صاحب کو جزائے خیر دے، ایک بات تو صحیح کہی، آپ غیر مقلدین اس پر عمل کریں، ہم احناف سے بھی گذارش کریں گے کہ بظاہر جہراً اور آہستہ آمین کہا کرو، ہم اطلاعاً عرض کر دیتے ہیں کہ شیخ ناصر الدین البانی جن کو آج کل کے غیر مقلدین دنیا کا سب سے بڑا غیر مقلد محدث سمجھتے ہیں، ان کا مذہب آمین کے سلسلہ میں امام شافعی والا مذہب ہے، البانی لکھتے ہیں: **فالاقرب الی الصواب فی هذه المسئلة ما ذهب اليه الشافعي أن يجهر الامام دوم الموتمين ، والله اعلم بالصواب۔** (سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ، ج:۲، ص:۳۶۸) ترجمہ: یعنی درست بات وہ ہے جو امام شافعی کا مذہب ہے، کہ امام صرف زور سے آمین کہے گا، مقتدی نہیں۔

نماز میں ہاتھ کہاں باندھا جائے؟ اس کے بارے میں شیخ الحدیث صاحب کا

ارشاد ہے:

''ناف کے نیچے باندھنا یہ احناف کا مذہب ہے، ناف کے اوپر باندھنا امام شافعی اور ان کے فقہاء کا مسلک ہے، سینہ پر ہاتھ باندھنا جماعت اہلحدیث کا معمول ہے۔ص:۶۶

اس سے واضح ہوا کہ احناف کے ساتھ شیخ الحدیث صاحب نے امام شافعی کو بھی جماعتِ اہلحدیث سے خارج کر دیا۔

معلوم نہیں امام ترمذی اہلحدیث تھے یا نہیں، انھوں نے تو صرف دو مذہب کا ذکر کیا ہے، ناف کے نیچے اور ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کا، سینہ کے اوپر ہاتھ باندھنے کا انھوں نے تذکرہ ہی نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی کے وقت میں اس کا بالکل رواج نہیں تھا، یہ جماعت اہلحدیث نے اب ایجاد کیا ہے، اور آج کل تو بعض سلفی سینہ کے اوپر جہاں جانور ذبح کرنے کے لئے چھری رکھی جاتی ہے وہاں ہاتھ باندھتے ہیں، ان کی دلیل سب سے قوی ہے، اس لئے کہ ان کا استدلال قرآن سے ہے۔قرآن میں ہے: **فصل لربک وانحر**، وانحر کا مطلب بعض غیر مقلدین کے نزدیک سینہ کے اوپر اور گردن کے نیچے نماز میں ہاتھ باندھنا ہے، یہی مذہب ابن باز کا ہے۔

سورہ فاتحہ کے بیان میں ہمارے شیخ الحدیث صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں اہل علم کے لئے بصیرت ہے، غیر مقلدین جاہلین کی بھی اس سے آنکھ کھل سکتی ہے۔

فرماتے ہیں: ہر نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔ص:۶۸

اس بارے میں انھوں نے پہلی حدیث یہ ذکر کی ہے:

عن ابی سعید أمرنا أن نقرأ بفاتحة الكتاب وماتيسر۔

ابو سعید فرماتے ہیں کہ فاتحہ اور کچھ زیادہ پڑھنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

اس حدیث میں جس کو سلفی شیخ الحدیث صاحب نے خود نقل کیا ہے صرف سورہ فاتحہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور پڑھنے کا بھی مصلیوں کو مامور کیا گیا ہے، اب یہ حدیث چونکہ موصوف سلفی شیخ الحدیث ساحب کے مسلک کے خلاف تھی اس وجہ

سے آپ فرماتے ہیں:

یعنی اگر فاتحۃ الکتاب سے کچھ زیادہ بھی پڑھے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ص:۶۸

دیکھا آپ نے حدیث کے ساتھ سلفیوں کا کھیل اور مذاق، حدیث میں تو صاف صاف یہ ہے کہ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور پڑھنے کا مصلیوں کو حکم ہے، اور آپ حدیث کے حکم کے خلاف سورہ فاتحہ کو تو ضروری قرار دے رہے ہیں اور ما زاد کو مصلیوں کے ارادہ پر موقوف رکھتے ہیں۔

شیخ الحدیث سلفی صاحب نے اس دو صفحہ ص:۶۸ و ص:۶۹ میں چار حدیثیں ذکر کی ہیں جن میں تین میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنے کا حکم ہے، مگر آپ ایسے اہلحدیث ہیں کہ صرف سورہ فاتحہ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

ہے اس دھاندلی کا کوئی جواب، کسی شافعی نے حدیث رسول کے ساتھ اس قسم کا بھونڈا مذاق نہیں کیا ہوگا۔

سورہ فاتحہ کے سلسلہ میں میرا ایک مفصل مضمون ہے جسے میری کتاب ''مسائل غیر مقلدین'' کے آخر میں شائع کر دیا گیا ہے، ناظرین اس کو ضرور دیکھ لیں۔ (ارمغان حق جلد اول میں بھی اس موضوع پر ایک مضمون ہے) اس مضمون سے غیر مقلدین کے عمل بالحدیث کی قلعی کھل چکی ہے، ناظرین اس مضمون کو پڑھ کر بیحد محظوظ ہوں گے۔

شیخ الحدیث صاحب نے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے، اس میں خلف الامام کے ساتھ روایت موجود ہے، اور یہ روایت ائمہ حدیث کے نزدیک نامقبول ہے، مگر جب احناف نے کہا کہ اہلحدیث لوگو قرأت خلف الامام کو واجب بتلانے کیلئے صحیح حدیث پیش کرو، ضعیف حدیث سے وجوب مت ثابت کرو، تو شیخ الحدیث صاحب اس پر خفا ہو گئے اور فرماتے ہیں کہ: چونکہ یہ حنفیوں کے خلاف روایت ہے اس لئے اس کو قبول کرنے کے لئے دل تیار نہیں۔'' ص:۷۲

یعنی شیخ الحدیث صاحب کا کہنا یہ ہے کہ دیکھو حدیث رسول کا نام لے کر ہم جو کچھ پیش کریں بلا چوں چرا اسے قبول کر لو، اس بارے میں کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت

نہیں ہے، کاش بیچارے کو معلوم ہوتا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا ہے:

وھٰذا الحدیث معلل عن ائمة الحدیث کاحمد وغیرہ من الائمة وقد بسط الکلام علیٰ ضعفه ۔(فتاویٰ)

یعنی اس حدیث کو امام احمد بن حنبل وغیرہ ائمہ نے ضعیف قرار دیا ہے، اور اس کے ضعیف ہونے پر دوسری جگہ تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔

اب دیکھئے کہ اس ضعیف حدیث سے شیخ الحدیث صاحب استدلال بھی کر رہے ہیں اور احناف پر غصہ بھی اتار رہے ہیں، اللہ ان شیخ الحدیث صاحب کو معاف کرے۔

شیخ الحدیث صاحب قرأت فاتحہ کے بارے میں ائمہ کا مذہب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''امام مالک، امام احمد اور بعض دوسرے ائمہ کا خیال ہے کہ سرّی نمازوں میں امام کے ساتھ سورہ فاتحہ پڑھی جائے اور امام جہر کرے تو مقتدی چپ رہے۔'' ص:۲۷

آپ فرمائیں شیخ الحدیث صاحب کہ ان ائمہ کا مذہب آپ سلفی اہلحدیث لوگوں کے مذہب کے خلاف ہے یا موافق؟ اگر خلاف ہے تو آپ نے ان کے خلاف کتنی کتابیں لکھی ہیں؟ اور یہ بھی بتلایئے کہ ان ائمہ کا مذہب حدیث کے خلاف ہے یا موافق، اگر موافق ہے تو آپ نے اس کے خلاف کیوں مذہب بنایا، اور اگر خلاف ہے تو آپ نے ان ائمہ کے خلاف کتنی کتابیں اور رسائل لکھے ہیں؟ ور یہ بھی بتلایئے کہ امام مالک اور امام احمد وغیرہما ائمہ اہلحدیث تھے یا نہیں، اگر تھے تو آپ کی اہلحدیثیت اور ان کی اہلحدیثیت میں کیا فرق ہے؟ براہ کرم کوئی غیر مقلد اہلحدیث اس کا جواب دے۔

ہمارے سلفی شیخ الحدیث صاحب نے نہ امام احمد کا مذہب صحیح بیان کیا ہے اور نہ امام مالک کا، یا تو انھوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے یا بیچارے شیخ الحدیث صاحب کو ان دونوں ائمہ کرام کا مذہب ہی نہیں معلوم تھا۔

ان دونوں اماموں کا مذہب غیر مقلدین کے مذہب کی طرح سری نمازوں

میں قرأت کے وجوب کا نہیں ہے، ان کے نزدیک اگر مقتدی نے فاتحہ پڑھی تو اچھا ہے، نہ پڑھی تو اس کی نماز باطل نہیں ہوگی، اور غیر مقلدین کے یہاں نماز ہی باطل ہو جاتی ہے دونوں مذہبوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

جلسۂ استراحت کے بارے میں شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں:

''یہ جلسہ واجب نہیں سنت ہے۔'' ص:۸۳

کیا اللہ کے رسول ﷺ نے جلسۂ استراحت کو واجب نہیں سنت کہا ہے؟ اگر یہ فرمان رسول ہے تو براہ کرم وہ حدیث پیش کر دیں جس میں اللہ کے رسول ﷺ کا یہ حکم موجود ہو، ورنہ اپنی طرف سے دین میں کچھ کہنا مذہب اہلحدیث میں حرام ہے، خدارا اس حرام کا ارتکاب نہ کریں، شریعت میں کسی چیز کو واجب یا سنت قرار دینا آپ کا منصب نہیں ہے، ذرا آپ اپنی حیثیت پہچانیں۔

فرماتے ہیں شیخ الحدیث صاحب!

''اہلحدیث کے نزدیک (تشہد میں) درود شریف ضروری ہے۔'' ص:۸۵

مگر پیش نہیں کیا شیخ الحدیث صاحب نے حدیث کوئی، ہو جس میں تشہد کا پڑھنا واجب اور ضروری، اور کہنا بات اپنی رائے سے بیچ دین میں نہیں ہے مگر حرام مذہب اہلحدیث میں۔

تراویح کے بارے میں شیخ الحدیث کا نظر کشا یہ فرمان ہے:

''رمضان المبارک میں تراویح یا رمضان کا قیام وہی نماز ہے جس کا ذکر پہلے تہجد کے نام سے ہوا......فضیلت اسی میں ہے کہ رات کے آخری حصہ میں پڑھے۔ ص:۹۸

اور اس فضیلت والی تراویح کو غیر مقلدین مستقل چھوڑے ہوئے ہیں، اور غیر فضیلت والی تراویح عشاء کے ساتھ پڑھتے ہیں، رمضان میں لوگ کوشش کرتے ہیں کہ فضیلت والا کام کریں اور غیر مقلدین اجتماعی طور پر غیر فضیلت والا کام کر کے سنت کو زندہ کرتے ہیں۔

اور شیخ الحدیث صاحب کا یہ فرمان تو بہت زیادہ نظر کشا ہے، حقائق دینیہ کے بیان کا شاندار شاہکار علم و معرفت فقہ و بصیرت سے مالا مال بیان ملاحظہ ہو:

آنحضرت ﷺ سے رمضان میں فرائض کے علاوہ تراویح کے سوا کوئی نماز ثابت نہیں۔''

یعنی نہ سنت، نہ نوافل، نہ وتر، بس صرف فرائض، ۲/ رکعت فرض فجر کی، ۴/ رکعت فرض ظہر کی، ۴/ رکعت فرض عصر کی، ۳/ رکعت فرض مغرب کی، ۴/ رکعت فرض عشاء کی اور ۸/ رکعت تراویح کی، یہ تھی آنحضور ﷺ کی رمضان شریف میں نمازوں کی مکمل جمع پونجی مطابق فرمان شیخ الحدیث سلفی صاحب کے۔

شیخ الحدیث نے آٹھ رکعت تراویح ثابت کرنے کے لئے بخاری کی روایت ذکر کی ہے، اس میں ہے کہ آنحضور ﷺ تہجد چار چار رکعت کر کے پڑھا کرتے تھے تو چار چار رکعت کر کے تراویح میں مطابق اہلحدیث مذہب کے ہونا چاہئے مگر شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں:

''لیکن افضل یہی ہے کہ دو دو رکعت پڑھنا چاہئے۔''

حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف چار کے بجائے دو دو رکعت تہجد پڑھنا یعنی رمضان میں دو دو رکعت تراویح پڑھنا افضل کیوں ہے؟ شیخ الحدیث صاحب نے اس کی وجہ نہیں بیان فرمائی۔ جبکہ ہمارے کان اس کے سننے کیلئے بہت مشتاق تھے۔

اور اے ناظرینِ کرام! شیخ الحدیث صاحب سے ہم نے نماز سیکھ لی جو کہ رسول اکرم ﷺ والی ہے اور ہونے جاتی ہے صحبت ختم ساتھ شیخ الحدیث سلفی کے پس یہ آخری بات بھی سن لیں جو کہ ہے انھیں کی زبان فیض ترجمان سے۔ فرماتے ہیں کہ تہجد کی نماز ساتھ وتر کے چھ رکعت بھی تھی۔ (ص:۹۶) اب ساتھ وتر کے تہجد چھ رکعت کیسے ہوگی، نہیں آتی بات عقل ہماری میں، پس سمجھائے کوئی اہلحدیث علامہ اس بات کو آجائے سمجھ میں ہم کم فہموں و بدعقلوں کے بھی، چھ تہجد مع وتر کے نقشہ یہ بنتا ہے، ایک رکعت وتر تو تہجد پانچ رکعت ہوئی، تین رکعت وتر تو تہجد تین رکعت ہوئی۔ والسلام

☆☆☆☆☆

شیخ البانی کی خدمتِ حدیث وسنت ان کی تحقیقات کی روشنی میں

شیخ محمد ناصر الدین البانی تین دہائی قبل تک عالم عرب کی ایک ایسی شخصیت شمار ہوتے تھے کہ دنیائے عرب میں ان سے بڑا علم حدیث کا ماہر کوئی دوسرا نہیں سمجھا جاتا تھا، ان کی کتابوں میں **سلسلة الاحاديث الضعيفه وسلسلة الاحاديث الصحيحه** کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ ان کے معتقدین کے لئے کسی حدیث کی صحت وضعف کی تحقیق کیلئے یہی دونوں سلسلے اصل مرجع تھے۔ عرب محققین خصوصاً سلفی مزاج احادیث سے شغل رکھنے والوں کیلئے کسی حدیث کے بارے میں **صححه الالبانی وضعفه الالبانی** کہہ دینا کافی تھا، اور اسی سے اس حدیث کا درجہ ان کے نزدیک متعین ہو جاتا تھا، اس **صححه الالبانی وضعفه الالبانی** کی اہمیت ان کے نزدیک **صححه البخاری ومسلم وضعفه البخاری ومسلم** سے بھی زیادہ تھی۔

شیخ البانی کی قیمت اور اہمیت خود ان کی اپنی نگاہ میں اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ کسی دوسرے فن حدیث کے ماہر و محقق کو خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں تھے، اور آخر میں تو ان پر انانیت اور علمی عُجب و پندار کا ایسا غلبہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے سامنے امام بخاری، امام مسلم اور صحاح ستہ کے دوسرے مصنفین ائمہ وحدیث کو بھی کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، احادیث کے بارے میں ائمہ حدیث کے خلاف اپنی تحقیق بلا تکلف پیش کرتے تھے اور اسی اپنی تحقیق پر ان کو اعتماد ہوتا تھا، البانی کے معتقدین سلفی حضرات کو بھی ائمہ کرام

کے مقابلہ میں البانی ہی کی تحقیق وتصویب قابل قبول ہوتی اور البانی کی حدیث کے بارے میں کسی تحقیق کے خلاف کوئی بات سننے کیلئے وہ تیار نہیں تھے۔

شیخ البانی کا جادو لوگوں کے سروں پر اتنا چڑھا ہوا تھا اور ان کی شخصیت سے لوگ اتنا مرعوب تھے کہ احادیث رسول کے بارے میں البانی کی بڑی سے بڑی جرأت بے جا پر بھی لوگ خاموش رہتے اور کسی کو اس کے خلاف لب کشائی کی ہمت نہ ہوتی۔

خدا جزائے خیر دے محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو کہ انھوں نے پہلی مرتبہ شیخ البانی کی احادیث کے بارے میں تحقیقات کا خالص محدثانہ انداز میں جائزہ لے کر ان کی اوقات بتلادی۔ حضرت محدث اعظمی نے علم وتحقیق کی روشنی میں البانی کی قابلیت وعلمیت کا ایسا پوسٹ مارٹم کیا کہ دنیائے اہل علم عش عش کرتی رہ گئی، اور پھر البانی کا سروں پر چڑھا ہوا جادو ایسا ٹوٹا کہ ان کے خلاف خود عرب علماء کے قلم چلنے لگے اور انھوں نے البانی اور ان کی کتابوں کا بھرپور تعاقب کیا اور ان کی حدیث کے سلسلہ کی خدمات وتحقیقات کی حقیقت سے عالم عرب کا باخبر کیا۔

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا البانی کے خلاف جو قلمی کارنامہ ہے اس کا نام ہے ''الالبانی شذوذه وأخطاء ه۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ البانی صاحب میں عجب وپندار اور انانیت کا زبردست جرثومہ پیدا ہوگیا تھا، یہ خطرناک جرثومہ ان کی زندگی کو ان کی آخری سانس تک لگا رہا، اگرچہ مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے بعد البانی صاحب کا علمی بھرم جاتا رہا اور اہل علم ان کے علمی مقام وتحقیق کی شان سے واقف ہوگئے، لیکن چونکہ البانی فطری طور پر بہت ہی عجب پسند اور انانیت پسند تھے اس وجہ سے علامہ اعظمی کے رسالہ میں اپنی حقیقت کا حدود اربعہ ملاحظہ فرمانے کے بعد بھی البانی صاحب کا قلم اسی عجب وپندار کے ساتھ چلتا رہا۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کہ احادیثِ رسول اور ائمہ فقہ وحدیث کے بارے میں قلم کو اس بداحتیاطی سے چلانے کا کارنامہ انجام دینا یہ خود ان کا اپنا داعیہ تھا یا کسی باہر کی خطرناک سازش تھی اور البانی صاحب کو بطور خاص اس سازش کا آلہ بنایا گیا تھا، تاکہ

ایک بڑی اسلامی اور معروف شخصیت کے ہاتھ سے دین اسلام کی ایک اساس کو کمزور کر کے مسلمانوں کو حدیثِ رسول اور سنتِ رسول کے بارے میں مشکوک و بدگمان کر دیا جائے۔

یہ بات بڑی حیرتناک ہے کہ البانی نے عام کتب حدیث کے سوا احادیث کا جو سب سے معتبر مجموعہ مسلمانوں کے نزدیک شمار ہوتا ہے اور جس کو صحاحِ ستہ کہا جاتا ہے بطور خاص اس کو اپنے قلم اور اپنی تحقیق کا نشانہ بنایا، اور اسے مجروح کرنے کی ناپاک کوشش کی۔

بخاری و مسلم کی احادیث کے خلاف البانی کا قلم چلا۔ سنن اربعہ یعنی ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ کی وہ کتابیں جو زمانۂ سلف سے لے کر آج تک مسلمانوں میں متداول رہی ہیں اور جنھیں بخاری و مسلم کے بعد سب سے اہم مقام حاصل تھا، احادیث کے اس مجموعہ کو پایۂ اعتبار سے گرانے کے لئے البانی نے عجیب وغریب حرکت کی، ایسی حرکت جس کا واہمہ کسی دشمنِ اسلام کے ذہن میں بھی اس سے پہلے نہیں گزرا ہوگا۔

البانی نے خدمت حدیث کے نام پر ان چاروں کتابوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک حصہ کو ضعیف حدیث والا حصہ قرار دیا، اور دوسرے حصہ کو صحیح حدیث والا حصہ قرار دیا، یعنی اب یہ چاروں کتابیں آٹھ بن گئیں۔ ضعیف ترمذی، صحیح ترمذی، ضعیف ابی داؤد، صحیح ابی داؤد، ضعیف نسائی، صحیح نسائی، ضعیف ابن ماجہ، صحیح ابن ماجہ۔

البانی صاحب نے اپنے اس خطرناک عمل کے ذریعہ دنیا کو تاثر دیا کہ احادیثِ رسول کا یہ مجموعہ جس پر اب تک اہل اسلام کا عمل تھا نا قابل اعتماد تھا اور مسلمانوں کے اس مجموعہ کا نام جو صحاح رکھا گیا تھا وہ بھی غلط تھا، احادیث کی یہ کتابیں ایسی نہیں تھیں کہ ان پر مطلقاً اعتماد کیا جاتا۔

اب البانی صاحب نے احادیث کی ان کتابوں کو ضعیف احادیث سے پاک کر کے اور ان کتابوں کا خالص صحیح احادیث والا مجموعہ تیار کر کے مسلمانوں کے لئے قابل عمل بنا دیا ہے، اب کسی کو امام ترمذی والی ترمذی دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اب جسے

دیکھنا ہو البانی والی ترمذی دیکھے، البانی کی نسائی دیکھے، البانی کی ابوداؤد دیکھے، البانی کی ابن ماجہ دیکھے۔ البانی صاحب کے کارنامہ نے اصل کتابوں سے مسلمانوں کو مستغنی کردیا ہے، اعتماد اب امام ترمذی پر نہیں کیا جائے گا، امام ابوداؤد پر نہیں کیا جائے گا، امام نسائی پر نہیں کیا جائے گا، امام ابن ماجہ پر نہیں کیا جائے گا، ان ائمہ کرام کا علم حدیث ناقص تھا، ان کی امامت فی الحدیث مشکوک تھی، ان ائمہ کرام کو صحیح وضعیف حدیث میں تمیز کی لیاقت وصلاحیت نہیں تھی، ان ائمہ کرام کی کتابوں پر اب تک جو اعتماد کیا جاتا رہا ہے وہ ہدایت کی راہ نہیں وہ گمرہی کا راستہ تھا۔

اب البانی کی کتابوں کو مسلمان پڑھیں، البانی کی تحقیقات پر اعتماد کریں، اور البانی نے ان چاروں کتابوں کا جو خالص مجموعہ تیار کیا ہے اسی کو ذریعۂ نجات وہدایت سمجھیں۔

البانی صاحب نے اپنے اس کارنامہ سے مسلمانوں کو اور ان کی نئی نسل کو یہی خاموش پیغام دیا، اور حدیث اور ائمہ حدیث کے بارے میں تشکیک کا ذہن پیدا کردیا۔ اب ایک ذرا سا پڑھا لکھا البانی الذہن اٹھتا ہے اور وہ بلاتکلف امام بخاری وامام مسلم جیسے اجلہ محدثین کے خلاف قلم اٹھاتا ہے اور ان کی کتابوں میں ضعیف احادیث کا سراغ لگاتا ہے۔

البانی زدہ سلفیوں کے اس تماشائے عبرت کو دیکھ کر عرب کا ایک دردمند عالم چیخ اٹھتا ہے، وہ سوال کرتا ہے اور اہل علم سے پوچھتا ہے:

تریٰ هل كان البخاری رحمه الله عاجزاً من انتقاء احاديث الادب المفرد كما انتقىٰ احاديث الصحيح وهل كان ابن القيم رحمه الله غير قادر علىٰ اختيار ماصح فقط فی موضوع كتابه الوابل الصيب؟ ام كان احدهما يفتقد الغيرة على السنة علىٰ صحيحها والعمل به (التعريف باوهام من قسم السنن ج: ۱، ص: ۱/۳)۔

یعنی یہ جو امام بخاری کی کتاب الادب المفرد اور ابن قیم کی کتاب الوابل

الصیب کو البانیوں کی طرف سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے ذرا بتلاؤ تمہارا کیا خیال ہے، کیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح اپنی کتاب الجامع کا صحیح احادیث والا مجموعہ تیار کیا تھا وہ امام بخاری الادب المفرد میں صرف صحیح احادیث لانے پر قادر نہیں تھے، امام بخاری اس سے عاجز تھے، یا حافظ ابن قیم عاجز تھے کہ وہ الوابل الصیب اپنی کتاب میں صرف صحیح احادیث لاتے، یا ان دونوں کو سنت اور صحیح سنت کے بارے میں وہ غیرت حاصل نہیں تھی جو آج البانیوں کا حصہ بنی ہوئی ہے۔

البانی اور البانیوں کا یہ کیسا خطرناک عمل ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے یہی عرب عالم کہتا ہے۔

وھٰذا العمل العظیم کما وصفه اصحابه سیؤدی الی قطع صلة الامة والاجیال القادمة باصول السنة (ایضاً، ج:۱،ص:۲۹)

اور یہ شاندار کارنامہ جیسا کہ البانیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ انجام دے رہے ہیں، ان کا وہ عمل ہے جو امت اور آنے والی نسلوں کا رشتہ احادیث وسنت کی اصل کتابوں سے کاٹ دے گا۔

یعنی امت مسلمہ اور ہماری آنے والی نسلیں اب انھیں چھنی چھنائی احادیث اور چھنی چھنائی کتابیں جو بقول البانیوں کے منقح اور مصفّیٰ شکل میں پیش کی جا رہی ہیں انھیں سے واقف رہیں گی۔ امام ترمذی کی اصل کتاب کا نام کیا تھا، اس کی خصوصیات کیا تھیں، امام ترمذی نے اس کتاب میں امامت فی الحدیث، اپنے تبحر علمی اور اپنی بے نظیر فقاہت کے جو نقش و نگار قائم کئے ہیں ان کو بھلا دیا جائے گا، اور یہی حال احادیث کی بقیہ ان کتابوں کا بھی ہوگا جو البانیوں کی کانٹ چھانٹ کا نشانہ بنیں گی۔

خدمت حدیث کے نام پر حدیث کے خلاف کیسا محاذ قائم کیا جا رہا ہے، اور سنت رسول کے بارے میں کیسا فتنہ پیدا کیا جا رہا ہے، اور منکرین حدیث کے ہاتھوں کو کس طرح مضبوط کیا جا رہا ہے، اس کا اندازہ ہر باغیرت مسلمان کو ہوگا۔ اس کا اندازہ ان کو ہوگا جو اسلاف کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں اور اس کو اپنے سینوں سے لگائے رکھنا

چاہتے ہیں۔ ایک طرف ہمارے اسلاف کی خدمتِ حدیث کے سلسلہ میں جو جانکاہی رہی ہے اس کا علم حاصل کیجئے، انھوں نے کس طرح سے احادیث وسنت کے سرمایہ کو جمع کیا، احادیث کی تحقیق وطلب میں کتنی جان کھپائی، ایک ایک حدیث کی چھان بین کیلئے کتنے اسفار کئے، کتنے دروں کی خاک چھانی، اپنی عمر کا کتنا وقت لگایا اور جب ان کی محنتوں کا ثمرہ ہمیں پکا پکایا مل گیا تو البانی جیسے محقق لوگ پیدا ہوئے جو ہاتھ میں پنسل لے کر اٹھتے ہیں اور کسی حدیث پر ضعیف اور کسی پر صحیح کا نشان لگا کر خدمتِ حدیث کا شاندار کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ الاستاذ محمّد عبد اللہ شاکر فرماتے ہیں:

وشتان بین ھٰذا العمل العظیم والجھد النافع الکبیر وبین ان تمسک بقلم الرصاص ثم تعلم علیٰ بعض الاحادیث فی کتاب تجعلھا فی قسم الصحیح وعلیٰ آخر تجعلھا فی الضعیف۔

علمائے سلف اور ائمہ حدیث کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامہ اور ان کی جو مفید اور عظیم کوشش رہی ہے اس میں اور تمہارے اس عمل میں کہ تم پنسل پکڑ کر کسی حدیث پر صحیح کا نشان لگا کر کے اس کو ایک کتاب میں جمع کردو، اور کسی پر ضعیف کا نشان لگا کر دوسری کتاب تیار کرو، کتنا فرق ہے۔

احادیث کے بارے میں البانی صاحب کی تحقیق کا یہی انداز تھا، البانی صاحب احادیث کی تحقیق اور اس کی بحث میں کتنی محنت برداشت کرتے تھے اس کا اندازہ کرنے کیلئے ان کے ایک شاگرد کا وہ بیان کافی ہے جو آئندہ سطروں میں آرہا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک حدیث کے بارے میں البانی صاحب نے اپنی تحقیق کی روشنی میں ضعیف ہونے فیصلہ کردیا اور اس کی سند کے ایک راوی کو مجہول بتلایا، اس پر اعتراض ہوا کہ جناب والا یہ حدیث نہ ضعیف ہے اور نہ راوی مجہول ہے، آپ نے حافظ ابن حجر کی صرف تقریب دیکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے، اگر تراجم کی مزید کتابیں دیکھتے بلکہ حافظ ہی کی تہذیب بھی دیکھ لیتے تو بھی آپ نے حدیث پر اور راوی پر جو حکم لگایا ہے، یہ غلط تحقیق آپ سے صادر نہ ہوتی، تو ان کے ایک شاگرد نے شیخ البانی کے قصور اور ناقص کارکردگی

کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے شیخ کا دفاع اس انداز سے کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

لم ینشط شیخنا حفظه الله لمراجعة التهذیب۔ ص:۳۳۱

یعنی ہمارے شیخ حفظہ اللہ کو تہذیب کی مراجعت کیلئے نشاط نہیں رہا۔

اندازہ لگائیے کہ احادیث رسول کے بارے میں یہ حضرات کتنے جری ہیں، البانی صاحب رسول اللہ کی ایک صحیح حدیث کو ضعیف قرار دینے کی ہمت کر رہے ہیں، اور انھیں یہ توفیق نصیب نہیں ہو رہی ہے کہ اس کے بارے میں رجال کی متداول کتابوں اور تہذیب جیسی معروف ومشہور اور عام طور پر ہر کتب خانہ میں پائی جانے والی کتاب کی طرف بھی رجوع کریں، شاگرد کا اپنے استاذ کی طرف سے یہ کتنا شاندار دفاع اور جواب ہے۔ شیخ محمود سعید شاگرد کے اس جواب کے بارے میں فرماتے ہیں:

قلت الامر متعلق براوٍ حدث حوله اخذ وردو انکار سنة واثبات بدعة توهماً فإذا عدم التحقیق والبحث والنشاط فی التهذیب الذی هو فی متناول الجمیع فی مثل هٰذا الموضع فعدمه فی غیره اولیٰ۔ (ج:۱،ص:۳۳۲)

یعنی معاملہ یہاں ایک ایسے راوی کا ہے جس کے بارے میں فیصلہ یہ کرنا ہے کہ اس کی حدیث قابل اخذ ہے یا قابل رد، اور معاملہ محض وہم کی بنیاد پر ایک سنت کو رد کرنے اور ایک بدعت کو ثابت کرنے کا ہے۔ پس جب ایسے اہم موقع پر تہذیب جیسی عام طور پر پائی جانے والی کتاب کے بارے میں بحث وتحقیق اور نشاط معدوم ہے تو دوسری جگہوں اور دوسری کتابوں میں تو بدرجۂ اولیٰ یہ بحث وتحقیق اور یہ نشاط معدوم ہوگا۔

حدیثِ رسول ﷺ کے بارے میں البانی صاحب کی جرأت اور سہولت پسندی کا یہ حال ہے جو ناظرین نے ملاحظہ فرمایا اور بحث وتحقیق کی اسی نادر مثال کے بل بوتے پر ان کو جرأت ہوتی ہے کہ وہ امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ اور دوسرے ائمہ حدیث کی کتابوں کے بارے میں فیصلہ فرمائیں اور ان کتابوں کو صحیح وضعیف میں تقسیم کریں، اس جرأت وجسارت پر افسوس ہی کہا جاسکتا ہے۔

کسی حدیث پر صحت وضعف کا حکم لگانا بچوں کا کھیل نہیں ہے، معاملہ احادیث رسول کا ہے، اس وجہ سے ایک محتاط محدث کسی حدیث کے بارے میں پہلے تمام متعلقہ امور پر غور کرتا ہے، اور اس حدیث پر ہر زاویہ سے نگاہ ڈالتا ہے، کتنی سندوں سے یہ حدیث مروی ہے، اس کے حدیث کے شواہد اور کیا ہیں، ان شواہد کا حال کیا ہے، امت کا اس حدیث پر عمل ہے یا نہیں، ائمہ حدیث کا اس حدیث کے بارے میں فیصلہ کیا ہے، غرض پوری تحقیق اور پوری چھان بین کے بعد ہی ایک محتاط محدث حدیث کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے۔

پھر اس محدث کو دین و دیانت کے اعتبار سے بھی بہت اعلیٰ معیار پر ہونا چاہئے تا کہ حدیث کے بارے میں کوئی فیصلہ اس کے نفس کا تقاضا نہ ہو۔

افسوس اس کا ہے کہ البانی صاحب نے ان تمام باتوں کا اپنی کتابوں میں خیال نہیں رکھا اور قلم برداشتہ جو چاہا لکھ دیا، اور اب یہی ذہن زمانہ حال کے ان سلفیوں کا بھی ہو گیا ہے جو البانی کی فکر اور مزاج سے متاثر ہیں۔

اس وقت میرے زیر مطالعہ ایک کتاب ہے، جس کا پورا نام یہ ہے ''**التعریف باوھام من قسم السنن الیٰ صحیح وضعیف** '' اس کتاب کے مصنف کا نام شیخ محمود سعید ہے، دبئی کے دار البحوث والدراسات الاسلامیہ واحیاء التراث میں حدیث کی خدمت انجام دیتے ہیں، اور بڑے محقق اور وسیع المطالعہ فن حدیث کے عالم ہیں۔ شیخ محمود نے اپنی اس کتاب میں بطور خاص البانی صاحب کی چاروں کتابوں کا یعنی ضعیف ترمذی، ضعیف ابی داؤد، ضعیف نسائی، ضعیف ابن ماجہ کا بڑی دقت نظر اور مہارت فن سے جائزہ لیا ہے، اور احادیث کے بارے میں البانی صاحب کی جرأت بے جا کا پورا محاسبہ کیا ہے اور ان کی غلطیوں سے اہل علم کو باخبر کیا ہے، اور یہ دکھلایا ہے کہ شیخ البانی کا علم حدیث بہت ناقص اور سرسری مطالعہ والا تھا، اس وجہ سے انھوں نے بہت سی ان احادیث کو بھی ضعیف قرار دیا ہے جن کا ضعف محدثین کو تسلیم نہیں ہے، یا اگر وہ ضعیف بھی ہیں تو امت کا اس پر عمل رہا ہے، امت کے تعامل کی وجہ سے اس حدیث کا ضعف جاتا رہا ہے،

یہ کتاب بڑی دلچسپ اور اہل علم کے لئے لائق مطالعہ ہے، اس وقت میرے زیر مطالعہ اس کی چوتھی جلد ہے۔ میں اسی سے ناظرین کی عبرت کے لئے البانی صاحب کی خدمت حدیث کے چند نمونے پیش کررہا ہوں اور بقیہ کے لئے عرض کروں گا کہ:

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

(۱) ابوداؤد اور ترمذی میں ابوبسرۃ الغفاری کی حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے:

قال صحبت رسول الله صلى الله عليه وسلم ثمانية عشر سفراً فما رأيته ترك الركعتين إذا زاغت الشمس قبل الظهر۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اٹھارہ سفروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں رہا سورج ڈھلنے کے بعد ظہر کی نماز سے پہلے دو رکعت کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے چھوڑا ہو۔

البانی صاحب نے ترمذی اور ابوداؤد کی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اور ابوبسرۃ الغفاری کے بارے میں اپنی یہ تحقیق پیش کی ہے کہ وہ غیر معروف ہیں اس وجہ سے ان کی یہ روایت ضعیف ہے۔

البانی صاحب کا یہ کہنا کہ ابوبسرۃ غیر معروف ہیں اور ان کی یہ روایت ضعیف ہے بالکل غلط ہے، ابوبسرۃ غفاری ثقہ تابعی ہیں، امام بخاری نے ان کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے اور ان پر کوئی جرح نہیں کی ہے، ابوحاتم نے بھی ان کو ضعیف نہیں قرار دیا ہے، امام ابوداؤد نے ان کی یہ حدیث ذکر کرکے اس پر کوئی کلام نہیں کیا ہے، امام بخاری کو ابوبسرۃ کا نام کیا ہے صرف یہ نہیں معلوم تھا۔ کسی راوی کی کنیت معلوم ہو اور اس کی شخصیت معروف ہو محدثین اس کو ثقہ قرار دیتے ہوں اس کی روایت ذکر کرتے ہوں تو صرف اس کا نام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے اس کی حدیث ضعیف نہیں قرار پاسکتی، کتنے ایسے راوی ہیں جن کا نام معروف نہیں مگر ان کی کنیت معروف ہے اور وہ اپنی کنیتوں ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔

غرض جلیل القدر محدثین اور ماہرین فن تو ابوبسرۃ کی اس حدیث کو صحیح اور حسن

قرار دیتے ہیں، مگر البانی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور کیوں؟ تو اس وجہ سے کہ البانی صاحب کو ابوبسرۃ کا نام معلوم نہ ہوسکا، حضرت ابوبکر صدیق ص تو صحابی رسول ہیں، ان کا نام کتنے لوگوں کو معلوم ہے؟

کاش البانی صاحب یہ سمجھتے کہ جس طرح ضعیف حدیث کو صحیح قرار دینا جرم ہے اسی طرح صحیح حدیث کا انکار کرنا اور اس کو بلاوجہ ضعیف قرار دینا بھی بہت بڑا اور سنگین جرم ہے۔ (اس حدیث پر پوری بحث کیلئے دیکھئے جلد چہارم، حدیث نمبر ۴۹۳)

(۲) جعفر بن ابی مغیرہ سعید بن جبیر سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یطیل القرأۃ فی الرکعتین بعد المغرب حتیٰ یتفرق اھل المسجد۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کے بعد کی دو رکعت سنت میں اتنی طویل قرأت فرماتے تھے کہ مسجد والے مسجد سے چلے جاتے۔

یہ روایت ابوداؤد شریف کی ہے، البانی نے اس کو ضعیف ابوداؤد میں ذکر کیا ہے، یعنی یہ روایت ان کے نزدیک ضعیف اور مردود ہے، البانی صاحب فرماتے ہیں کہ جعفر بن ابی مغیرہ سعید بن جبیر سے روایت قوی نہیں ہے، البانی نے اس کے لئے محدث ابن مندہ کا حوالہ دیا ہے، اب محدثین اور ماہرین حدیث کا اس روایت کے بارے میں فیصلہ ملاحظہ فرمائیے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، محدث عبد الحق کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، حافظ ذہبی نے جعفر کو صدوق کہا ہے، ابن مندہ کی جرح کو محدثین نے قبول نہیں کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ابن مندہ کی جرح جعفر پر عقیدہ میں اختلاف کی وجہ سے ہے اور عقیدہ کے اختلاف کی وجہ سے جو جرح ہو محدثین اس کو عام طور پر قابل اعتناء نہیں سمجھتے، جعفر ابن مغیرہ سعید بن جبیر سے روایت کرنے میں مشہور ہیں، اگر سعید بن جبیر سے ان کی روایت صحیح نہ ہوتی تو دوسرے محدثین اس کا تذکرہ ضرور کرتے، امام ترمذی

نے جعفر بن مغیرہ عن سعید بن جبیر کی سند کو حسن قرار دیا ہے، ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے، امام بخاری نے بھی جعفر کی حدیث کو ضمناً ذکر کیا ہے، اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ خود البانی صاحب نے بھی اس سند کو اپنے صحیحہ میں حسن قرار دیا ہے، اور صاف صاف لکھا ہے کہ **ھٰذا اسناد حسن ورجاله ثقات** یعنی یہ سند حسن ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔

ذرا آپ انصاف سے کام لیں اور بتلائیں کہ کیا حدیث کی خدمت اسی طرح ہوتی ہے، البانی صاحب کو یہ بھی پتہ نہیں کہ اس سند کے بارے میں اپنے صحیحہ میں وہ خود کیا فرما چکے ہیں، اب اس قسم کے علم والے لوگ احادیث رسول کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ قابل عمل ہے کہ نا قابل عمل، مردود ہے کہ مقبول، صحیح ہے کہ ضعیف، اور ہمارے علمی افلاس کا حال یہ ہے کہ ہم ایسے ناقص لوگوں کی تحقیقات پر اعتماد کرتے ہیں۔ (پوری بحث کیلئے اس جلد کی حدیث نمبر ۵۲۷ دیکھو)

(۳) ابن ماجہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے:

ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال صلوٰة الليل مثنىٰ مثنىٰ۔

یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔

البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابن ماجہ میں شامل کیا ہے، اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا ہے، ضعیف ابن ماجہ میں اس حدیث کو داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث البانی کے نزدیک معتبر نہیں ہے، حالانکہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے اور متعدد طرق سے نقل کی گئی ہے، مگر البانی صاحب کی جرأت کا عالم یہ ہے کہ صحیحین یعنی بخاری و مسلم کی اس روایت کو بھی ضعیف بتلا رہے ہیں۔ (پوری بحث کیلئے حدیث نمبر ۵۳۹ دیکھو)

(۴) سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت آئی ہے:

إن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم صلى العشاء ثم صلى ثمان ركعات قائماً وركعتين بين الاذانين ولم يكن يدعهما۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز پڑھ کر آٹھ رکعت نماز کھڑے ہو کر پڑھی،

اور دو رکعت فجر کی اذان اور اقامت کے درمیان ادا کی، اور ان دو رکعت کو آپ کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔

البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابی داؤد میں داخل کیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ حدیث **بین الاذانین** کے جملہ کے ساتھ ضعیف ہے، اور البانی کی تحقیق میں **بین الاذانین** کے بجائے **بعد الوتر** کا لفظ محفوظ ہے۔

یہ شیخ البانی کی تحقیق کا حاصل ہے، حالانکہ البانی صاحب کی یہ تحقیق بالکل ناقص ہے، اور **بین الاذانین** کے ساتھ یہ حدیث بالکل صحیح ہے، شیخ محمود سعید فرماتے ہیں **بل الحدیث صحیح جداً بھٰذا اللفظ**، یعنی اس لفظ کے ساتھ یہ حدیث بالکل صحیح ہے، امام بخاری نے بخاری شریف میں اس کو ذکر کیا ہے، بخاری شریف کی روایت میں صاف موجود ہے: **ور کعتین بین النداء ین**۔

البانی صاحب کی ساری زندگی بقول البانیوں کے حدیث کی خدمت میں گزری، مگر افسوس کہ ان کو اس کا پتہ بھی نہیں چل سکا کہ اللہ کے رسول کی رات کی نماز کی حالت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہی، کبھی آپ نے کسی طریقہ سے پڑھی اور کبھی کسی طریقہ سے پڑھی، آپ کی نماز بتلانے والے صحابی نے کبھی ایک حالت کا ذکر کیا اور کبھی دوسری حالت کا ذکر کیا، کبھی اس نے رات کی نماز کی پوری تصویر کھینچ دی، کبھی اس کا ذکر مختصر انداز میں کیا، اس وجہ سے روایات کے الفاظ مختلف ہو جاتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کسی حدیث میں راوی نے کسی بات کو ذکر نہیں کیا یا اس کو اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا اور دوسری روایت میں وہ بات مذکور ہے تو اس دوسری حدیث کا محض اس وجہ سے انکار کر دیا جائے کہ اس میں وہ بات ہے جو دوسری روایتوں میں نہیں ہے، یہ محض زبردستی کی بات ہے، اگر کوئی متضاد اور مخالف بات دو حدیثوں میں ہے تب تو اس کی تحقیق کی جاتی ہے کہ کون سی بات محفوظ ہے اور کون سی بات غیر محفوظ، مگر جب روایات میں تضاد نہیں، کوئی اختلاف نہیں، تو پھر محض اس وجہ سے کہ فلاں بات فلاں راوی نے ذکر کی ہے اور فلاں نے نہیں ذکر کی ہے اس وجہ سے وہ لفظ غیر محفوظ ہے، اور اس کو ذریعہ بنا کر بخاری و مسلم کی

بھی روایات کا انکار کر دیا جائے، کتنی بڑی جسارت اور انانیت کی بات ہے۔

شیخ محمود سعید فرماتے ہیں کہ البانی کا اعتراض بالکل غلط ہے، اس لئے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے، فرماتے ہیں:

وقوله بين الاذانين صحيح متفق عليه من حديث البخاري (۱۱۶۴) ومسلم (۸۳۸) وغيرهما۔

یعنی حدیث میں بین الاذانین کا لفظ ہے اور متفق علیہ ہے، یہ بخاری کی حدیث نمبر ۱۱۶۴ میں اور مسلم کی حدیث نمبر ۸۳۸ میں موجود ہے۔

(پوری بحث کیلئے حدیث نمبر ۵۴۳ دیکھو)

(۵) ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، اسود بن زید نے ان سے حضور ﷺ کی رات کی نماز کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت عائشہ نے فرمایا:

كان يصلي ثلٰث عشرة ركعةً من الليل ثم انه صلىٰ احدىٰ عشرة ركعةً وترك ركعتين ثم قبض ﷺ حين قبض وهو يصلي من الليل تسع ركعات وكان آخر صلوته من الليل الوتر۔

آنحضور ﷺ رات میں تہجد کی نماز تیرہ رکعت ادا کرتے تھے، پھر دو رکعت چھوڑ دیا اور گیارہ رکعت پڑھتے تھے، اور پھر وفات کے وقت آپ کی تہجد کی نماز نو رکعت ہوا کرتی تھی، اور آخر میں وتر پڑھتے تھے۔

شیخ البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابوداؤد میں ذکر کیا ہے، شیخ محمود فرماتے ہیں:

هٰذه خرافة والحديث صحيح، یعنی یہ البانی صاحب کی محض بکواس ہے، یہ حدیث ضعیف نہیں صحیح ہے۔ نو رکعت والی حدیث کو امام احمد، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، ابن ماجہ نے دوسری سند سے ذکر کیا ہے۔ نو رکعت والی حضرت عائشہ کی ذکر کر کے امام ترمذی فرماتے ہیں: **حسن صحيح**، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حدیث کا آخری حصہ جس میں وتر کا ذکر ہے اس کی تخریج مسلم نے بھی کی ہے۔ شیخ محمود سعید فرماتے ہیں: **والحاصل ان تضعيف الالباني لهٰذا الحديث خطأ**، یعنی خلاصہ

کلام یہ ہے کہ البانی نے اس حدیث کو جو ضعیف قرار دیا ہے وہ غلط ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

اگر البانی زحمت اٹھا کر حافظ منذری کی مختصر سنن ابی داؤد کو دیکھ لیتے تو ان کو نظر آتا کہ حافظ منذری نے اس حدیث کو ذکر کر کے صراحت سے لکھ دیا ہے کہ اس حدیث کی تخریج امام ترمذی اور نسائی نے کی ہے اور اس کے آخر کا ٹکڑا امام مسلم نے ذکر کیا ہے۔

(پوری بحث کیلئے حدیث نمبر ۵۴۴ دیکھو)

(۶) حضرت عائشہؓ کی حدیث ابن ماجہ میں ہے، اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

كان النبي ﷺ يصلي من الليل ثلٰث عشرة ركعةً۔

یعنی نبی ﷺ رات کی نماز تیرہ رکعت پڑھتے تھے۔

البانی نے اس حدیث کو ضعیف ابن ماجہ میں ذکر کیا ہے، اور تیرہ رکعت کے لفظ کو شاذ بتلایا ہے اور کہا گیارہ کا عدد محفوظ ہے، پھر کہا کہ تیرہ کہنا ہشام کی غلطی ہے۔

البانی صاحب کی اس تحقیق کو دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی اور دل نے کہا کہ اگر احادیث کی اسی قسم کی تحقیق ہوتی رہی تو پھر احادیث کا خدا ہی حافظ! تیرہ کے لفظ کو شاذ کہنا البانی صاحب کی ایسی فاش غلطی ہے کہ جس کو حدیث کا معمولی سا علم بھی حاصل ہے وہ البانی صاحب کی اس جرأت پر تعجب ہی کرے گا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تیرہ والی حدیث تو خود بخاری میں ہے، یہ حدیث اگر ضعیف ہے تو بخاری پر سے اعتماد ختم!

آنحضور ﷺ کی رات کی نماز تیرہ بھی تھی اور گیارہ بھی، اور نو بھی۔ حضرت عائشہ نے اپنی مختلف احادیث میں سب کو بتلایا ہے، اس میں سے کوئی عدد بھی شاذ نہیں ہے۔

(۷) ابوداؤد میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

وهب بن منبه عن عبد الله بن عمرو أنه سأل النبي ﷺ في كم يقرأ القرآن، قال في اربعين يوماً ثم قال في شهر ثم قال في عشرين ثم، قال في عشر ثم قال في سبع لم ينزل من سبع۔

وہب بن منبہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ کتنے دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہئے، تو آپ نے فرمایا چالیس

روز میں، پھر فرمایا ایک مہینہ میں، پھر فرمایا بیس روز میں، پھر فرمایا دس روز میں، پھر فرمایا ساتھ روز میں، اور آپ ﷺ اس سے نیچے نہیں اترے۔

البانی صاحب نے اس حدیث کو ضعیف ابی داؤد میں شامل کیا ہے، اور کہا ہے کہ **لم ینزل من سبع** کا لفظ شاذ ہے، اور شاذ اس لئے کہ اس سے پہلی روایت میں تین تک کی اجازت ہے۔

شیخ محمود فرماتے ہیں کہ **الحدیث صحیح محفوظ بھٰذا اللفظ**، یعنی یہ حدیث صحیح ہے اور اس لفظ کے ساتھ محفوظ ہے، اس حدیث کو امام احمد نے اپنی سند میں کئی جگہ ذکر کیا ہے، بخاری نے بھی اس کو کہیں مطول اور کہیں مختصر ذکر کیا ہے، امام مسلم نے بھی اس کو اس لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے، ترمذی نے بھی اس کو مختصراً ذکر کیا ہے۔ نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اسی لفظ کے ساتھ اس کو ذکر کیا ہے۔

باب فضائل القرآن میں بخاری کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن عبد اللہ بن عمرو قال لی رسول اللہ ﷺ إقرأ القراٰن فی شھر قلت انی اجدہ قوۃً حتیٰ قال فاقراہ فی سبع ولاتزد علیٰ ذٰلک۔

یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قرآن ایک مہینہ میں پڑھو، میں نے عرض کیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ کی قوت ہے، (تو آپ نے مزید کچھ دن کم کردیئے) مگر آخر میں فرمایا کہ سات دن سے کم میں مت پڑھو۔

غرض سات کا لفظ عام طور پر روایات میں موجود ہے، بلکہ بخاری کے بقول تین سے زیادہ سات کا لفظ محفوظ ہے، بخاری کی بات یہ ہے: **وقال بعضھم فی ثلٰث او فی سبع واکثرھم علیٰ سبع**۔ بعض نے تین یا سات کا ذکر کیا ہے مگر اکثر سبع ہی کا ذکر کرتے ہیں۔ (پوری بحث کیلئے دیکھو حدیث نمبر ۵۵۲)

البانی صاحب کی احادیث رسول کے بارے میں اس جرأت بے جا پر تعجب کرتے ہوئے شیخ محمود فرماتے ہیں:

ویااسف محب السنۃ لتضعیف الاحادیث الصحیحۃ بھٰذہ

الجرأة والشناعة نعوذ بالله من شهوة التظاهر بالاستدراك علی المتقدمین واللہ اعلم بالنیات۔

یعنی صحیح حدیثوں کو اس جرأت اور قباحت کے ساتھ ضعیف قرار دینے کے عمل پر ایک سنت کا شیدائی افسوس کرتا رہ جاتا ہے۔ متقدمین کے برخلاف احادیث پر احکام صادر کرنے کی خودنمائی کی شہوت سے اللہ کے ذریعہ ہم پناہ چاہتے ہیں۔

ناظرین کرام! یہ قضیہ بڑا طویل ہے اور یہ المیہ بڑا دردناک ہے، اور یہ داستان بڑی عبرتناک ہے۔ ہم نے محض ان چند مثالوں سے احادیث رسول کے خلاف جو ایک محاذ قائم کر دیا گیا ہے اور جس کی سربراہی البانی نے کی تھی اس کا کچھ نمونہ پیش کیا ہے، ہم اہل علم حضرات اور عام مسلمانوں سے گذارش کریں گے کہ البانی اور البانیوں کے اس فتنہ سے وہ آگاہ رہیں اور حدیث کی خدمت کے نام پر جو حدیث دشمنی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اس سے وہ دھوکہ نہ کھائیں۔

کارِ ما تبلیغ رسالت بتو بس ست

بعد از دعا شمارا خدا سپردہ ایم

☆☆☆☆☆

حالت نشہ میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

مکرمی حضرت مولانا محمد ابوبکر غازی پوری صاحب زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کی کتاب ''ارمغان حق'' دونوں جلدوں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا، بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں، اس کتاب نے فقہ حنفی کے بارے میں نہ معلوم میرے کتنے شکوک وشبہات کو حل کردیا، ماشاء اللہ طرز تحریر بھی بہت عام فہم ہے کہ معمولی خواندہ انسان بھی اس سے فائدہ اٹھائے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ فقہ اکاڈمی والوں نے نشہ کی حالت میں طلاق نافذ نہ ہونے کا فتویٰ دے رکھا ہے، عرض یہ ہے کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے، برائے کرم مطلع فرمائیں، فقہ اکاڈمی اپنے سیمیناروں میں مسائل فقہیہ کے بارے میں جو فیصلہ کرتی ہے اس کے بارے میں بھی آگاہ کریں کہ ہم ان کے فیصلوں پر کتنا اعتماد کرسکتے ہیں، اگر زمزم میں جواب دیں تو اس کا فائدہ دوسروں کو بھی ہوگا۔

والسلام

مبین احمد، بارہ بنکی

زمزم! یہ محض اللہ کا کرم اور اس کا فضل ہے کہ اس نے ''ارمغان حق'' کو قبول فرمالیا اور اس کتاب کو بہت سے لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنایا۔

فقہ اکاڈمی کے ذریعہ فقہی مسائل میں جو فیصلے ہوتے ہیں، وہ ان کے فیصلے ہوتے ہیں، وہ فتاوی نہیں ہوتے، ہندوستان کی مشہور درسگاہوں مثلاً دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، جامعہ قاسمیہ مرادآباد وغیرہ جو معتبر علمی وفقہی درسگاہیں ہیں اگر فقہ

اکاڈمی کے فیصلوں کو ان درسگاہوں کے دارالافتاء سے سند قبول حاصل ہو جائے اور ان فیصلوں کو ان درسگاہوں کے دارالافتاء سے توافق ہو جائے تو وہ فیصلے معتبر ہوں گے ورنہ نہیں، فقہی سیمیناروں کے فیصلوں کی بنیاد پر حلال وحرام اور جائز اور ناجائز کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے اکابر علماء کرام نے مجرد فقہ اکاڈمی کے فیصلوں کو کبھی قابل اعتماد نہیں سمجھا ہے، نہ ان کے فیصلوں کی ان کے یہاں کوئی اہمیت رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ فقہی سیمیناروں کے فیصلوں کی بنیاد پر کبھی ان معتبر درسگاہوں کے دارالافتاء سے کوئی فتویٰ جاری نہیں کیا گیا ہے۔

رہا یہ کہ نشہ کی حالت میں طلاق کا اعتبار ہوگا کہ نہیں تو فقہ حنفی کا مسئلہ یہ ہے کہ ہوگا۔ اور یہی رائے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے، حضرت امام احمد بن حنبل کا بھی یہی مسلک ہے اور اسلاف میں سے یہی مسلک، حضرت مجاہد، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت امام حسن بصری، حضرت محمد بن سیرین، حضرت سعید بن مسیّب، حضرت عمر بن عبدالعزیز (بعد میں غالباً ان کی رائے بدل گئی تھی اور طلاق کے عدم وقوع کا فتوی دینے لگے تھے) حضرت میمون، حضرت سلیمان بن یسار، حضرت امام زہری، حضرت امام اوزاعی، حضرت امام شعبی، حضرت حکم، حضرت شریح اور ان کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت کا یہی مسلک ہے کہ نشہ کی حالت میں دی گئی طلاق کا اعتبار ہوگا اور وہ واقع ہوگی، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق خلیفہ راشد رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مسلک ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات گرمی وہ ہے کہ حضور ﷺ کا ان کے بارے میں ارشاد ہے جیسا کہ ترمذی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان پر حق نازل کیا ہے، اور ان کا مقام وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متعدد مرتبہ قرآن پاک میں وہ احکام نازل فرمائے جو منشاء حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے موافق تھے، اور اس امت مسلمہ کے ''مُحَدَّث'' وہی تھے یعنی اللہ کی طرف سے ان کو حق کا بات کا الہام ہوا کرتا تھا، حضور کا ارشاد ہے کہ ہر امت میں ایک مُحَدَّث ہوتا ہے، اس امت کے مُحَدَّث حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔

بعض بزرگان امت سے عدم وقوع کا بھی قول منقول ہے جس میں اہم ترین

ذات گرامی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ہے، حضرت جابر بن زید، حضرت عکرمہ، حضرت عطا، حضرت طاؤس، حضرت قاسم وغیرہ حضرات عدم وقوع کے قائل ہیں۔

فقہ حنفی کا اصول ایک یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسئلہ جائز اور ناجائز اور حلال وحرام کے درمیان دائر ہو تو وہ حرمت کی جانب کو ترجیح دیتے ہیں، حضور کا ارشاد ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں شک ہو تو شک کا راستہ چھوڑ کر یقین کا پہلو اختیار کرو، جب اس مسئلہ میں اکابر امت کا الگ الگ قول ہو گیا تو حرمت اور حلت کے درمیان شک پیدا ہوا، اس لئے جانب حرمت کو اس حدیث کی روشنی میں ترجیح ہوگی، فقہ حنفی میں اسی اصول کی بنیاد پر نشہ کی حالت میں دی گئی طلاق کو معتبر مانا ہے تاکہ آدمی حرام میں نہ پڑے، اور اکابر امت اور اسلاف کرام اور تابعین عظام کی ایک جماعت سے فقہ حنفی کے مسئلہ کو تائید حاصل ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مجنوں اور معتوہ کی طلاق کا جب اعتبار نہیں ہے اور وہ واقع نہیں ہوتی ہے اور اس کے واقع نہ ہونے کی علت اور وجہ مجنوں اور معتوہ میں فقدان عقل ہے تو یہی علت اور وجہ تو سکران یعنی نشہ والے میں بھی پائی جاتی ہے۔ "رجل لا یعقل" یعنی وہ بھی فقدان عقل والا ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کی طلاق کا بھی اعتبار نہ ہونا چاہئے، مگر یہ قیاس قیاسِ فاسد ہے، اس وجہ سے کہ مجنوں اور معتوہ آسمانی بلا میں گرفتار ہے، زوال عقل میں ان کے عمل کا کوئی دخل نہیں ہے، جب کہ شرابی نے اپنی عقل کو اپنے عمل سے یعنی شراب پی کر زائل کیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ شرابی اگر زنا کرے، کسی کو قتل کرے تو اس پر شرعی سزا اور حد جاری ہوگی، مگر معتوہ اور مجنوں پر جاری نہیں ہوگی۔ دنیاوی عدالت کا بھی یہی قانون ہے، دنیا کی کوئی عدالت شرابی، زانی اور قاتل کو اس وجہ سے معاف نہیں کرے گی کہ اس نے نشہ کی حالت میں زنا کیا ہے یا نشہ کی حالت میں کسی کو قتل کیا ہے۔

امید ہے کہ اس مختصر سی تحریر سے آپ نے مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ لیا ہوگا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو لوگ نشہ کی حالت میں دی گئی طلاق کا اعتبار نہیں کرتے ہیں ان کے ساتھ بھی اکابر امت کی ایک جماعت ہے، اس لئے اس مسئلہ میں بہت زیادہ بحث وتکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور قرأت خلف الامام

مکرمی حضرت مولانا دامت برکاتہم،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ'

الحمد اللہ ہم لوگ زمزم پابندی سے مطالعہ کرتے ہیں اور آپ تحقیقات سے لطف اندوز ہوتے ہیں، شکوک وشبہات کا ازالہ ہوتا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں جو لاصلاۃ لمن لم یقرأ والی حدیث ذکر کی ہے اور اسی سے سورہ فاتحہ کا پڑھنا مقتدیوں کے لئے جہری وسری نمازمیں واجب قرار دیا ہے، براہ کرم اس کے بارے میں ذرا ایک تحریر لکھدیں کرم ہوگا، آپ کی مختصر تحریر بھی ہمارے لئے کافی ہوگی۔

نیازمند

احقر شمس الدین قاسمی دربھنگہ

زمزم! مدیر زمزم کی معروف ومشہور کتاب ارمغان حق جلد اول میں پہلا ہی مضمون قرأت خلف الامام پر ہے اور بڑا مفصل ہے، اگر آپ اس کو پڑھ لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا، اس میں امام بخاری نے جو کچھ کہا ہے اس پر بھی مفصل کلام ہے، پہلے تو آپ یہ معلوم کریں کہ حضرت امام بخاری نے اپنی پوری کتاب بخاری شریف میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ مقتدیوں پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، آپ پورے اطمینان کے ساتھ پوری دنیا کے غیر مقلدین کو یہ چیلنج کرسکتے ہیں، حضرت امام بخاری نے نماز میں مطلقاً

قرأت کرنے کا باب باندھا ہے، اور اس باب میں انہوں نے تین حدیثیں ذکر کی ہیں، دوحدیثوں میں سورہ فاتحہ کا ذکر ہی نہیں ہے ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے یہ وہی حدیث ہے جس کو آپ نے اپنے خط میں نقل کیا ہے مگر نہ اس میں منفرد کا ذکر ہے نہ آہستہ پڑھنے کا ذکر ہے نہ سری کا ذکر ہے نہ جہری نماز کا ذکر ہے، یہ حضرت امام بخاری کا اپنا اجتہاد ہے اور ان کی یہ اپنی فہم ہے کہ انہوں نے اس حدیث کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ مقتدیوں کو سری و جہری ہر نماز میں صرف سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری اور واجب ہے، حدیث رسول ﷺ میں اس کا کہیں اشارہ بھی نہیں ہے، حضرت امام بخاری نے مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنے کو اپنی فہم سے کشید کیا ہے، اور غیر مقلدوں نے حدیث رسول کو نہیں، حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی اس فہم کو اپنے لئے حجت بنایا ہے مگر سوال یہ ہے کہ حضرت امام بخاری کی فہم شریعت میں حجت ہے؟ یا حضرت امام بخاری حدیث کا جو مطلب سمجھیں وہی مطلب کسی حدیث کا ہوگا دوسرا مطلب نہیں ہوسکتا؟

غیر مقلدین کی گمراہی کا عجیب حال ہے، ایک طرف تو وہ شور مچائیں گے اور عوام میں یہ بات پھیلائیں گے کہ دین میں صحابہ کرام کی فہم حجت نہیں اور دوسری طرف امام بخاری کی فہم کو حجت بنائیں گے اور اس کو قرأت خلف الامام جیسے اہم مسئلہ میں بھی عمل کرنے کی بنیاد قرار دیں گے، ذرا کوئی ان عقلمندوں سے پوچھے کہ کیا امام بخاری کا درجہ دین وشریعت میں صحابہ کرام سے بڑھا ہوا ہے؟ کہ امام بخاری کی فہم تو حجت ہو اور صحابہ کرام کی فہم حجت نہ ہو؟ حضرت امام بخاری محض اپنی فہم سے یہ فرماتے ہیں کہ **لاصلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب** کا تعلق مقتدی سے بھی ہے، اور صحابی رسول حضرت جابر رضی اللہ عنہ یہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا تعلق اس نمازی سے ہے جو امام کے پیچھے نہ ہو یعنی منفرد سے ہے، جیسا کہ ترمذی شریف میں مذکور ہے، اور حضرت امام بخاری کے استاذوں کے استاذ ان سے اقدم فقیہ ومحدث حضرت سفیان ثوری فرمائیں کہ اس کا تعلق مقتدی سے نہیں بلکہ منفرد سے ہے جیسا کہ ابوداؤد شریف میں ہے اور کاتب وحی حضرت زید بن ثابت فتویٰ دیں کہ مقتدی کو امام کے پیچھے کچھ پڑھنا نہیں ہے، جیسا کہ مسلم

شریف میں ہے اور یہی فتوی حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عمر کا ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا فتوی مؤطا امام مالک میں ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتوی حدیث کی متعدد کتابوں میں ہے، تعجب ہوتا ہے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر کہ وہ فرماتے ہیں کہ سری و جہری ہر نماز میں مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت زید کا یہ فتوی نقل کیا گیا ہے، عن ابن ثوبان عن زید بن ثابت قال: لاتقرأ خلف الامام ان جھر و لا ان خافت، (ص۹ ۲۷ ج ۳ تحقیق محمد عوامہ)

یعنی حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے چاہے نماز سری ہو یا جہری کچھ نہیں پڑھا جائے گا۔ اب کوئی امام بخاری کی سنے یا صحابی رسول کاتب وحی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی۔

سعید بن جبیرؒ جو جلیل القدر تابعی ہیں وہ فتویٰ دیتے ہیں کہ امام کے پیچھے کسی طرح کی قرأت نہیں ہے، حضرت سعید بن مسیب کا بھی یہی فتویٰ ہے، محمد بن سیر بن مشہور تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں: لااعلم القرأة خلف الامام من السنة یعنی امام کے پیچھے قرأت کرنے کو سنت نہیں جانتا۔ ابراہیم نخعیؒ کا بھی یہی فتویٰ ہے، مشہور تابعی سوید بن غفلہ کا بھی یہی فتویٰ ہے، حضرت ضحاک بھی مشہور تابعی ہیں، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے ہیں، مالک بن عمارہ بھی بڑے محدث اور جلیل القدر تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے کتنے شاگردوں سے پوچھا جن میں ایک عمرو بن میمون بھی تھے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنی ہے یا نہیں؟ سب نے کہا: لا یقرأ خلف الامام. امام کے پیچھے قرأت نہیں کی جائے گی۔

اس طرح تابعین کی ایک لمبی فہرست ہے جو امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتی ہے، اور سب سے بڑی بات ہے کہ خود اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح صریح غیر مبہم اس مسئلہ میں ناطق حدیث ہے جس کی صحت کے قائل حضرت امام مسلم جیسے امام ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد تھا: انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر

فکبروا و اذا قرأ فانصتوا. یعنی امام کو اس کی اقتداء کیلئے بنایا گیا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود وضاحت فرمادی کہ اس کی اقتداء کیسے ہوگی، فرمایا کہ جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔ اور آپ نے ایک دوسری حدیث میں یہ فرما کر مسئلہ کو اور بھی صاف کردیا کہ **کل من کان له امام فقرأته له قرأة.** یعنی جس نمازی کا امام ہو تو امام کی قرأت مقتدی کی طرف سے بھی قرأت ہوتی ہے، یہ حدیث بھی صحیح ہے۔ حافظ ابن تیمیہ اور دیگر محدثین نے اس کی تصریح کی ہے، کس قدر تعجب ہے کہ ایک طرف حدیث رسول ہے صحابہ کرام کے فتاوی ہیں تابعین عظام کے اقوال ہیں جو اعلان کررہے ہیں کہ مقتدی کو امام کے پیچھے کچھ نہ پڑھنا بہتر ہے، نہ سورہ فاتحہ اور نہ کچھ اور۔ حدیث رسول چیخ کر بتلارہی ہے کہ امام کی قرأت ہی مقتدی کی قرأت ہے، اور دوسری طرف امام بخاری ایک مجمل حدیث کو اپنا متدل بتا کر کے لوگوں کو یہ پڑھا رہے ہیں کہ نماز چاہے سری ہو یا جہری، ہر حال میں مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنی ہے اور وہ بھی صرف سورہ فاتحہ کی اور سارے غیر مقلدین اندھے بن کر امام بخاری کی تقلید کرتے چلے جارہے ہیں۔ اور اس کا نام انہوں نے حدیث پر عمل رکھا ہے۔ یعنی انکا عمل ہے تو بخاری کی فہم پر اور بخاری کی فہم پر عمل کو انہوں نے حدیث رسول پر عمل کا نام دے رکھا ہے۔ **وفی ذالک عبرة للمعتبرین.**

بہر حال آپ اتنا یاد رکھیں کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح بخاری میں کہیں بھی یہ باب قائم نہیں کیا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنی واجب ہے یا سنت ہے، یا مستحب ہے، پوری بخاری شریف میں اس طرح کا کوئی باب ہی نہیں ہے اور نہ امام بخاری نے پوری بخاری شریف میں کسی اور موقع سے اس طرح کی بات کہی ہے، کسی غیر مقلد سے اس کا مطالبہ کرکے دیکھئے اس کے ہوش اڑ جائیں گے۔ اسی سے آپ اندازہ لگالیں کہ اس مسئلہ میں غیر مقلدین کی بنیاد کتنی کمزور ہے۔

☆☆☆☆☆

سجدہ سہو کیلئے سلام ایک یا دو؟

میرے ایک کرم فرمانے فون پر مجھ سے پوچھا کہ احناف سجدہ سہو میں ایک سلام پھیر کر کے سجدہ کرتے ہیں اس کی دلیل کیا ہے؟ ان کا مقصد یہ تھا کہ کیا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا ذکر ہے؟ میں نے فون ہی پر جواب دیا کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مجھے اس کا ذکر نہیں ملا، اب ان کا تقاضا ہے کہ احناف کا یہ عمل بلا دلیل تو ہو نہیں سکتا اس لئے تم اس بارے میں ایک مضمون لکھ دو تا کہ ایک خلش جو دل میں ہے وہ دور ہو۔

اس سلسلہ میں پہلی گذارش تو یہ ہے کہ ہر شرعی مسئلہ کے لئے قرآن وحدیث سے دلیل ذکر کرنا اور اسی کا مطالبہ کرنا یہ ان کا شیوہ ہے جن کا اسلاف پر اعتماد نہیں ہوتا ،یا جن کے نزدیک تعامل اسلاف کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر ایک بات اسلاف کے عہد سے مسلسل چلی آرہی ہے تو یہ تعامل خود ہی شرعی مسئلہ کے لئے دلیل ہوتا ہے۔ اور اس تعامل کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تعامل اہل مدینہ کو حدیث پر بھی مقدم کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر حدیث میں کسی بات کا ذکر ہے مگر اہل مدینہ کا عمل اس کے خلاف ہے تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حدیث کو چھوڑ دیا جائے گا اور اہل مدینہ کے عمل کو اس مسئلہ میں دلیل بنایا جائے گا اور اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث کے روایت کرنے والے چند ایک لوگ ہوتے ہیں۔ روایت کرنے والے ثقہ بھی ہوتے ہیں اور غیر ثقہ بھی ہوتے ہیں۔ نیز احادیث عام طور پر بالمعنی مروی ہیں، یعنی احادیث رسول کے نام سے جو ذخیرہ ہے حضور ﷺ کی

زبان سے نکلے ہوئے بعینہٖ الفاظ کے ساتھ ان کو بہت کم روایت کیا گیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو روایت کرنے والے اپنے الفاظ میں ادا کرتے رہے ہیں اسلئے اس میں اس کا احتمال ہوتا ہے کہ معلوم نہیں آپ کی بات کو اس کے صحیح مفہوم کے ساتھ ادا کیا گیا ہے کہ نہیں۔ جب کہ اسلاف کے مابین ایک چیز متعارف اور معروف ہو اور اس پر ان کا عمل بھی ہو تو اس کے سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اس لئے کہ یہ بات قطعاً ممکن نہیں ہے کہ ایک عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہو اور پھر صحابہ و تابعین کی جماعت اس پر جمی رہے۔ اس لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اہل مدینہ کے تعامل کو دلیل شرعی کے طور پر خبر واحد پر فوقیت حاصل ہے۔

احناف کے نزدیک "تعامل اسلاف" کی اتنی تو اہمیت حاصل نہیں ہے مگر ان کے نزدیک بھی وہ ایک دلیل شرعی ہے۔ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ہونے کے وقت اس کو شرعی مسئلہ کی دلیل بنایا جاتا ہے۔ مثلاً مقتدی امام کی تکبیر کے ساتھ جو تکبیر کہتا ہے وہ آہستہ کہتا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کوئی صحیح حدیث تلاش کریں تو آپ کو محروم ہونا پڑے گا بلکہ ضعیف حدیث بھی آپ کو نہیں ملے گی۔ مقتدی تشہد اور درود شریف آہستہ پڑھتا ہے، سلام پھیرتا ہے تو آہستہ سلام پھیرتا ہے۔ اس کا ذکر کسی حدیث میں نہیں ہے، مگر چونکہ اسلاف کے زمانہ سے اسی طرح نماز پڑھی جارہی ہے اس کے خلاف عمل کسی سے منقول نہیں ہے اس وجہ سے اسلاف کا یہ تعامل خود مستقل ایک دلیل ہوگا اور اگر کوئی اس کے خلاف عمل کرتا ہے تو کہا جائے گا کہ اس کی نماز خلاف سنت ہے، اور خلاف سنت کا فتویٰ لگانا ہی دلیل ہے کہ پہلا عمل سنت ہے۔ خواہ وہ رسول ﷺ کی سنت ہو یا خلفائے راشدین کی یا عام صحابہ کرام کی۔ اہل سنت کے نزدیک خلفائے راشدین کے ساتھ ساتھ عام صحابہ کرام کا عمل بھی سنت ہی کے دائرے میں آتا ہے۔

سجدہ سہو میں ایک طرف سلام پھیرنے کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اہل کوفہ کے فقہا اور محدثین کا سجدہ سہو کرنے کا یہی طریقہ رہا ہے۔ کوفہ سیکڑوں صحابہ اور ہزاروں تابعین اور تبع تابعین کا مرکز رہا ہے۔ تو جو عمل اسلاف کی اتنی بڑی جماعت کے اندر بلا نکیر پایا

جائے اس کے سنت ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ کیا یہ کسی کے وہم وگمان میں یہ بات آسکتی ہے کہ جہاں حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا علم اپنا جھنڈا لہرا رہا ہو وہاں خلاف سنت عمل پر لوگ جمے رہیں گے؟ اور پھر جب کسی بزرگ تابعی کے قول سے اس کی تائید ہو جائے تو وہ عمل یقیناً ترجیح پائے گا۔ چنانچہ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جو ایک جلیل القدر تابعی اور امام فقہ حدیث ہیں، ان کا قول مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے۔

عن الحسن فی سجدتی السهو فیهما سلام ، یعنی حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ سجدہ سہو میں ایک سلام ہے، اور یہی بات ایک دوسرے جلیل القدر تابعی اور امام فقہ حدیث اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علوم کے حامل اور وارث حضرت امام نخعی سے منقول ہے، اسی مصنف میں ان کا قول نقل کیا ہے: عن ابراهیم قال تسلیم السهو والجنازة واحد، یعنی نماز جنازہ اور سجدہ سہو کا سلام ایک مرتبہ ہے۔

ان دو جلیل القدر تابعین کرام کی شہادت کے بعد اب بھی سجدہ سہو کے ایک سلام کے بارے میں کسی کو شبہ ہو تو پھر ہم اس سے کہیں گے کہ تم وہ حدیث پیش کرو جس میں سجدہ سہو کا سلام دونوں طرف پھیرنے کا بیان صراحتہً ہو، سجدہ سہو میں جو لوگ دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں ان کے پاس صراحتہً اس کی دلیل نہ سنت رسول اللہ سے ہے اور نہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام میں سے کسی صحابی سے، اور لطف یہ ہے کہ نہ کسی تابعی سے ہے، ان کے پاس صرف قیاس ہے۔ اور وہ قیاس یہ ہے کہ جب سلم کا لفظ بولا جاتا ہے تو دونوں ہی طرف سلام پھیرنا مراد ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ قیاس ہی غلط ہے کہ "سلم" کے لفظ سے دو ہی سلام مراد ہوتا ہے ایک نہیں۔ نماز جنازہ میں ایک طرف آج بھی ائمہ حرم سلام پھیر کر کے نماز ختم کر دیتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ ان کے پیچھے نماز جنازہ پڑھنے والوں کو خوب ہے۔ بلکہ البانی نے تو روزانہ کی معمول کی نماز میں ایک دفعہ سلام کو بھی سنت بتلایا ہے، اور اس کو حدیث سے ثابت کیا ہے، اس لئے یہ کہنا کہ جب "سلم" کا

لفظ نماز کیلئے بولا جائے تو اس سے لازماً دو ہی سلام مراد ہوتے ہیں بالکل غلط ہے۔ ''سلم'' کا لفظ ایک دفعہ بھی سلام کے لئے بولا جاتا ہے اور دو دفعہ بھی سلام کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور اس کی تائید کہ ایک دفعہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ امام نخعی اور حسن بصری رحمہا اللہ کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ ان حضرات کے نزدیک سجدۂ سہو ایک سلام کے بعد ہے۔

اب سنئے کہ جب نماز کیلئے ''سلم'' کا لفظ دو سلام کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور ایک کے لئے بھی تو احناف نے سجدۂ سہو کے لئے ایک ہی طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنے کا طریقہ کیوں اختیار کیا ہے دونوں طرف سلام کیوں نہیں پھیرتے؟ تو جواباً عرض ہے کہ احناف کے نزدیک ایک سلام کے ساتھ اور دو سلام کے ساتھ دونوں طرح سجدۂ سہو کرنا جائز ہے۔ بحر العلوم کی ارکان اربعہ میں تصریح ہے کہ دونوں طرف سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کرے مگر عام طور پر احناف کا عمل ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنے کا ہے۔ اور اس ترجیح کی دو وجہ ہے، ایک وجہ تو وہی ہے کہ ایک ہی سلام کا قول۔ دو جلیل القدر تابعی سے منقول ہے۔ اور دونوں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنے کی بات صراحۃً کسی حدیث کسی صحابی اور کسی تابعی سے منقول نہیں ہے۔ اور احناف کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی جلیل القدر تابعی سے کوئی بات منقول ہو تو وہ اس کے مقابلہ میں بھی قیاس کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس تابعی کا قول اگر وہ کسی مرفوع حدیث ٹکراتا نہ ہو حجت اور دلیل ہوتا ہے۔ صاحب اعلام السنن علامہ ظفر تھانوی فرماتے ہیں:

هذا وان كان من قول التابعي و هوليس بحجة عند الجمهور ولكنه حجة عند نا مالم يعارض المرفوع اذا كان من تابعي ظهرت فتواه في زمن الصحابة۔ (اعلام السنن۔ جلد ا۔ جز ثانی ص ۲۳۲)

یعنی یہ قول اگر چہ تابعی کا ہے جو جمہور کے نزدیک حجت نہیں ہے مگر ہمارے نزدیک وہ حجت ہے اگر وہ کسی حدیث مرفوع کے معارض نہ ہو اور وہ تابعی ایسا ہو جس کا فتویٰ زمانہ صحابہ میں ظاہر ہوتا رہا ہو، یعنی زمانہ صحابہ میں لوگ اس سے فتویٰ پوچھتے رہے ہوں۔

اور میں نے اوپر جن دو بزرگوں کا نام لیا ہے ان کا زمانہ صحابہ کرام کی ایک

جماعت کا زمانہ تھا، اور زمانہ صحابہ میں لوگ ان سے فتویٰ پوچھا کرتے تھے۔ اس لئے ہم نے ان کے قول کو کہ سجدۂ سہو میں ایک سلام ہے اس کو ترجیح دی ہے۔

اور اس ترجیح کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جو حضرات سجدۂ سہو کرنے کے بعد دو سلام پھیرتے ہیں ان کا سجدۂ سہو تو سہو کا ہوتا ہے مگر سلام سہو کا نہیں ہوتا ہے بلکہ خروج عن الصلوٰۃ یعنی نماز سے نکلنے کے لئے ہوتا ہے، اور نماز سے نکلنے کے لئے دو ہی سلام مسنون ہے۔ اور جو لوگ ایک سلام کے بعد سجدہ کرتے ہیں ان کا سلام سجدۂ سہو کے لئے ہوتا ہے اور ابھی وہ نماز ہی میں ہوتے ہیں اسی وجہ سے وہ تشہد دوبارہ پڑھتے ہیں، پھر درود شریف اور نماز کی آخری دعا پڑھتے ہیں، پھر سلام پھیر کر کے نماز سے فارغ ہوتے ہیں۔ سجدۂ سہو سلام کے بعد کرنا، پھر تکبیر کہہ کر سجدہ میں جانا اور پھر دو سجدوں کے بعد دوبارہ تشہد کا پڑھنا یہ مسلم شریف اور ابوداؤد شریف کی روایتوں میں ہے۔

امید ہے کہ ہمارے کرم فرما حضرت کو اس کج مج تحریر سے کچھ تشفی ہوگئی ہوگی میں ان کا نام نہیں لے رہا ہوں کہ وہ خود اتنے بڑے کشمیر کے عالم ہیں کہ:

''گونجتا ہے خطۂ کشمیر ان کے نام سے''

نوٹ: یہ تحریر صرف عشاء بعد کی ایک ہی نشست میں لکھی گئی ہے اور وہ بھی اس حالت میں کہ میں ایک حادثہ کا شکار تھا اور کتابوں کی مراجعت کے لئے معذور تھا۔ اس لئے اگر اس مسئلہ میں کسی کو کچھ نقص نظر آئے تو اپنے یہاں کے ذمہ دار علماء سے رجوع کریں یا پھر ادارۂ زمزم کو خط لکھیں۔

☆☆☆☆☆

دوران خطبہ جمعہ کی دو رکعت نماز اور مذہب حنفی

مکرمی حضرت مولانا دامت برکاتہم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

زمزم کا تازہ شمارہ یہ تکلیف دہ خبر لے کر آیا کہ زمزم مالی دشواریوں کی وجہ سے بند ہونے جا رہا ہے، مگر اس پرچہ میں یہ بھی اعلان پڑھ کر اطمینان ہوا کہ صرف دو ایک شمارہ شائع نہیں ہوگا۔ زمزم کا بند ہونا ہمارے لئے بڑا علمی خسارہ ہے۔ اس کو بہر صورت جاری رکھنا ضروری ہے، ہم لوگ انشاء اللہ زمزم کی توسیع میں مقدور بھر حصہ لیں گے۔ آج ہندوستان میں کوئی پرچہ ایسا نظر نہیں آتا جو غیر مقلدین کے شکوک وشبہات اور مذہب حنفی پر ان کے اعتراضات کا اس انداز سے جواب دے جو زمزم کا طرۂ امتیاز بن چکا ہے۔

محترم! ہمارے یہاں دوران خطبہ جمعہ دو رکعت پڑھنا ممنوع ہے، حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا۔ غیر مقلدین کا استدلال اسی حدیث سے ہے، براہ کرم زمزم میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔

شیخ عبد القیوم رانڈ یر (مہاراشٹر)

زمزم! ادارۂ زمزم نے جب یہ فیصلہ کیا کہ اب زمزم بند کر دینا ہے تو اسکی اطلاع جب مخلصین کو ہوئی تو ان کا شدید اصرار ہوا کہ زمزم بند نہ ہو، فوری طور پر ان کا تعاون بھی ملا، اسلئے زمزم میں یہ دوسرا اعلان شائع کرنا پڑا، اللہ تعالیٰ نے اگر اسباب پیدا کئے تو انشاء اللہ پرچہ شائع ہوتا رہے گا۔

جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو پہلے یہ معلوم کریں کہ اسلاف کرام میں اور کون لوگ ہیں جن کا مذہب بھی اس بارے میں وہی ہے جو فقہ حنفی کا ہے، میں نے اس سلسلہ میں جب مصنف ابن ابی شبیہ کا مطالعہ کیا تو صرف اس ایک کتاب میں اسلاف کی ایک بڑی جماعت کا وہی مذہب پڑھنے کو ملا جو مذہب حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا ہے، میں اسی کتاب کے حوالہ سے یہ چند نام یہاں ذکر کرتا ہوں۔

(۱) حضرت عطاء بڑے تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں۔ **انھم کانو اکرھوا الصلاۃ والامام یخطب یوم الجمعۃ** ، یعنی صحابہ وتابعین نے جمعہ کے روز امام کے خطبہ دینے کے درمیان نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھا ہے۔

حضرت عطاء کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ عام طور پر صحابہ کرام اور تابعین کا بھی مذہب اس مسئلہ میں وہی تھا جو مذہب حضرت امام اعظم کا ہے (اور جس کے قائل حضرت امام مالک ہیں، حضرت امام مالک کا مذہب بھی وہی ہے جو حضرت امام اعظم کا ہے)

(۲) حضرت محمد بن سیرین بھی بڑے تابعی ہیں، وہ فرماتے ہیں ''**اذا خرج الامام فلا یصلی احد حتیٰ یفرغ الامام** ''یعنی جب امام خطبہ کے لئے نکلے تو جب تک امام فارغ نہ ہوئے کسی کو نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

(۳) حضرت شریح بھی بڑے تابعی ہیں، ان کے بارے میں اسماعیل بن ابی خالد فرماتے ہیں ''**رأیت شریحاً دخل یوم الجمعۃ من ابواب کندۃ فجلس ولم یصل** ''یعنی حضرت شریح جمعہ کے روز مسجد میں داخل ہوئے تو بلا نماز پڑھے بیٹھ گئے۔

(۴) حضرت عروہ بن زبیر بھی جلیل القدر تابعی ہیں ان کے بارے میں ان کے لڑکے ہشام فرماتے ہیں کہ حضرت عروہ فرمایا کرتے تھے کہ **اذا قعد الامام علی المنبر فلا صلاۃ** ، یعنی جب امام منبر پر آجائے تو پھر کوئی نماز نہیں،

(۵) امام زھری مشہور تابعی اور حضرت امام مالک کے مشہور استاد ہیں، ان کا مذہب بھی یہی تھا کہ جمعہ کے روز جو آدمی آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو نماز نہ

پڑھے، حضرت معمران سے نقل کرتے ہیں کہ "عن الزهری فی الرجل یجیئ یوم الجمعة والامام یخطب یجلس ولا یصلی"

(۶) ثعلبة بن ابی مالک بھی بڑے تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں "ادر کت عمر وعثمان فکان الامام اذا خرج یوم الجمعة ترکا الصلوة" یعنی میں نے حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا زمانہ پایا ہے جب امام جمعہ کے روز خطبہ کیلئے نکلتا تھا تو وہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ یعنی اس زمانہ میں صحابہ وتابعین کا یہی معمول تھا۔

(۷) حضرت سعید ابن مسیّب مشہور وعظیم القدر اور اجلہ صحابہ کرام کو دیکھنے والے اور ان کی صحبت سے سرفراز تابعیوں میں سے ہیں۔ ان کا مذہب بھی یہی تھا کہ خروج الامام یقطع الصلاۃ، امام کا نکلنا نماز کو ختم کر دیتا ہے۔

(۸) حضرت عطار حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں۔ انهما کانا یکرهان الصلاۃ والکلام بعد خروج الامام، یعنی یہ دونوں صحابی اس بات مکروہ جانتے تھے کہ امام کے نکلنے کے بعد نماز پڑھی جائے۔

یہ صرف (ایک) کتاب مصنف ابن ابی شیبہ سے آٹھ آثار ان تابعین کرام کے ہیں جن کے سامنے صحابہ کرام کی زندگی کا نقشہ تھا، انھوں نے جمعہ کے روز صحابہ کرام کی نماز کو دیکھا تھا اور جو ان کا معمول تھا اس کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ اور اسی مشاہدہ کی بنیاد پر انھوں نے اپنا مذہب یہ بنایا تھا کہ دوران خطبہ کوئی نماز پڑھنی جائز نہیں ہے۔ صحابہ کرام نے اپنی نماز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ خود حضور کا یہ فرمان تھا کہ دوران خطبہ کوئی نماز نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سنت رسول کے عاشق تھے ان کا مذہب بھی آپ نے پڑھ لیا کہ دوران خطبہ نماز پڑھنے کا نہیں تھا۔ حضرت عطار کا اثر بتلاتا ہے کہ صرف حضرت عبداللہ بن عمر یا حضرت ابن عباس ہی کی بات نہیں ہے بلکہ عام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کا یہی مذہب تھا کہ دوران خطبہ بات چیت یا نفل نماز پڑھنی جائز نہیں ہے۔

ان آثار کی روشنی میں بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اصل سنت رسول یہی ہے کہ

دوران خطبہ خطیب کی طرف توجہ کی جائے اور جمعہ کا خطبہ خاموش رہ کر سنا جائے اور یہ اس لئے کہ جمعہ کا خطبہ محض ایک عام سی تقریر نہیں ہے بلکہ یہ دو رکعت فرض نماز کی جگہ پر ہے۔ پس جس طرح نماز کے دوران بات چیت جائز نہیں ہے اسی طرح دوران خطبہ ہر وہ عمل جو استماع اور انصات کے خلاف ہو اور خطیب کے خطبہ کی طرف توجہ کرنے کو ہٹاتا ہو جائز نہیں ہے۔ حتی کہ اگر دوران خطبہ کوئی بات کر رہا ہو تو اس کو خاموش رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے دو ایک حدیث اور آثار اس بارے میں بھی سن لیں، اسی مصنف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب امام منبر پر چڑھ جائے تو لغو عمل کے لئے یہ عمل کافی ہے کہ تم اپنے پاس بیٹھنے والے کہو کہ تو خاموش رہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ بات خود ان کی نہیں ہے بلکہ حضور ہی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ **من قال لصاحبک یوم الجمعة انصت والامام یخطب فقد لغا** ، یعنی جس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ "تو خاموش رہ" اور امام خطبہ دے رہا ہے تو اس نے ایک لغو عمل کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی یہی فرماتے تھے اور اوپر جن صحابہ کرام اور تابعین عظام کا نام لیا گیا ہے ان سب کا یہی مذہب تھا کہ دوران خطبہ اگر کوئی بات کرتا ہے تو اس کو خاموش کرنا بھی جائز نہیں، بلکہ حضرت عمر اور حضرت ابن عمر کا تو یہ فتویٰ تھا کہ "**لا جمعة له**" تیرا جمعہ ہی نہیں ہوا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے فتویٰ کی تصدیق فرمائی اور فرمایا، **صدق عمر**، حضرت عمر نے سچ کہا۔ وجہ اس کی وہی ہے کہ چونکہ خطبہ جمعہ دو رکعت نماز کی جگہ پر ہے تو جس طرح نماز میں بات کرنا حرام ہے جمعہ کے خطبہ کے دوران بھی بات چیت کرنے کو حرام قرار دیا گیا۔ اور یہی بات حضرت سعد اور حضرت جابر سے بھی منقول ہے، حضرت جابر فرماتے ہیں کہ حضرت سعد نے ایک آدمی سے جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد کہا کہ تیرا جمعہ نہیں ہوا، اس آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بات دہرائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد سے پوچھا: **لم یا سعد** ؟ ایسا تم نے کیوں کہا اے سعد؟ تو انھوں نے عرض کیا "**انه تکلم وانت تخطب**" حضور یہ شخص آپ کے خطبہ

دینے کی حالت میں بات کر رہا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''**صدق سعد**''یعنی سعد نے سچ کہا۔

آپ اندازہ لگائیں کہ خطبہ جمعہ کی شریعت میں کتنی اہمیت ہے اور اس کا سننا اور اس کی طرف کان لگانا کتنا ضروری ہے، اور سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران خطبہ کسی آیت کی تلاوت فرمائی تو ایک صاحب نے کسی دوسرے سے پوچھا یہ آیت کب نازل ہوئی؟ حضرت عمر نے اس بات کو سن لیا تو نماز کے بعد اس سے کہا کہ تیرا جمعہ نہیں ہوا، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کی تائید فرمائی۔ یعنی اتنا کلام کرنا بھی دوران خطبہ جائز نہیں قرار دیا گیا، تو آپ بتلائیں کہ جو شخص دوران خطبہ خطبہ سننا چھوڑ کر نماز پڑھنے میں لگ جائے اس کا یہ عمل کب شریعت میں جائز ہوگا۔

اب رہا حضرت سلیک غطفانی کا قصہ تو یہ عرض ہے کہ اگر اصلی مسئلہ یہی ہوتا کہ دوران خطبہ آنے والے کے لئے دو رکعت پڑھنا مسنون یا واجب ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت صحابہ کرام اور تابعین عظام میں پھیلی ہوتی اور اس پر برابر عمل ہوتا، مگر ہم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور صحابہ کرام کے پورے عہد میں عمومی طور پر اس سنت کا کہیں پتہ نہیں چلتا، حضرت سلیک کی اس حدیث کو کسی صحابی یا تابعی نے سنت نہیں کہا ان حضرات کے سامنے بھی حضرت سلیک کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا'' ان صحابہ کرام اور تابعین عظام کا عشق رسول اور سنت سے ان کی واقفیت آج کے ان فدائیان قرآن وحدیث سے کسی طرح کم تو نہیں تھی، پھر کیا وجہ ہے کہ انھوں نے اس سنت کو اپنا مذہب نہیں بنایا؟

جمعہ کا خطبہ ایک مہینہ میں چار مرتبہ ہوتا ہے اور جمعہ کے روز لوگوں کا آگے پیچھے آنا ہم سب کا مشاہدہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانہ میں بھی لوگ جمعہ کے روز آگے پیچھے آتے رہتے تھے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت سلیک کے علاوہ کسی اور صحابی کے بارے میں یہ ارشاد موجود نہیں ہے؟ خلفائے راشدین سے بھی ثابت نہیں ہے کہ انھوں نے دوران خطبہ آنے والے کو دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا ہو۔

حضرت عثمان کا قصہ مشہور ہے کہ وہ جمعہ کے روز تاخیر سے پہونچے۔ حضرت عمر خطبہ دے رہے تھے تو حضرت عمر نے بلا غسل آنے پر تو ان کو ٹوکا مگر ان سے یہ نہیں کہا کہ تم کو دو رکعت بھی ادا کرنی ہے، نہ خود حضرت عثمان نے دو رکعت نماز پڑھی۔

اب سنیئے کہ غیر مقلدین کا عام طریقہ تو یہ ہے کہ وہ کسی حدیث کو بخاری میں دیکھ لیں بس اس کو اپنا مذہب بنالیا بشرطیکہ وہ حدیث ان کے دین ومذہب کے موافق ہو، مگر احناف کا معاملہ حدیث کے اخذ اور اس سے سکوت کے بارے میں کچھ اور ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ مسئلہ درپیش کی ساری احادیث کو دیکھتے ہیں اور ان سب کا جو خلاصہ نکلتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں اور اسی کو اپنا مذہب بناتے ہیں۔ اس مسئلہ میں انھوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صرف ایک صحابی کے بارے میں منقول ہے، کسی اور کے بارے میں یہ نہیں ملتا کہ آپ نے اس کو دوران خطبہ نماز پڑھنے کا حکم دیا ہو، حضرت سلیک غریب آدمی تھے، بدحال تھے، پھٹے پرانے کپڑے میں تشریف لائے تھے، ان کی اعانت کرنی مقصود تھی۔ صحابہ کرام کے سامنے جب انھوں نے دو رکعت نماز پڑھی تو صحابہ کرام نے ان کی بدحالی کا مشاہدہ کیا اور ان کے لئے مدد کا ہاتھ بڑھایا اور اتنا صدقہ کیا کہ مال کا انبار لگ گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی میں سے حضرت سلیک کو بھی دیا اور جو بچا اس کو دوسروں کے لئے محفوظ رکھا، یہ ساری باتیں حدیث ہی میں ہیں، مگر غیر مقلدین ان سب سے نظر بند کئے ہوئے ہیں، حضور کے فرمان کے مطابق جب حضرت سلیک دو رکعت نماز ادا کر رہے تھے تو اس درمیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ سے رک گئے تھے۔ محدثین قیس بزرگ تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں ’’ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حیث امرہ امسک عن الخطبۃ حتی فوغ من رکعتیہ ثم عادالی خطبتہ ‘‘یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت سلیک کو دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا تو آپ ان کے فارغ ہونے تک خطبہ سے رکے رہے جب وہ دو رکعت پڑھ چکے تب آپ نے دوبارہ خطبہ شروع کیا، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت سلیک دوران خطبہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اور سالم کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی

خطبہ شروع ہی نہیں کیا تھا۔ جب حضرت سلیک اپنی پراگندہ حالت میں آئے تو آپ منبر پر تشریف فرما تھے۔ خطبہ شروع نہیں کیا تھا، بہر حال جو بھی صورت ہو اتنی بات صاف ہے کہ دوران خطبہ حضرت سلیک نے نماز ادا نہیں کی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ دو رکعت نماز پڑھو صرف حضرت سلیک کے لئے تھا مگر راویوں نے اس کو اپنے الٹ پھیر سے ایک قاعدہ کلیہ بنا دیا اور اس کو حضور کے فرمان کی شکل میں ڈھال دیا کہ جو دوران خطبہ مسجد میں داخل ہو وہ دو رکعت نماز ادا کرے، یعنی ''جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے''

محمد ابوبکر غازی پور

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایسی سلفیت سے خدا بچائے

''سیر اعلام النبلاء'' حافظ ذہبی کی مشہور کتاب ہے، اس کتاب میں حافظ ذہبیؒ نے اپنے زمانہ تک کی اسلامی دنیا کی ممتاز شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے، ان مذکورہ شخصیتوں کا تعلق مختلف طبقات سے ہے۔ ان میں فقہاء بھی ہیں، محدثین بھی ہیں، اولیاء اللہ اور اہل تصوف بھی ہیں، حکماء بھی ہیں، اُدباء بھی، ملوک اور وزراء بھی ہیں، اطباء اور شعراء بھی ہیں، غرض یہ کتاب اسلامی دنیا کی ممتاز شخصیتوں کا تعارف حاصل کرنے کا بہترین خزانہ ہے۔ یہ کتاب دار الحدیث قاہرہ سے اٹھارہ جلدوں میں چھپی ہے، اس کتاب کے محقق اور معلق استاذ محمد ایمن شبراوی ہیں، یہ صاحب مزاجاً وعقیدۃً سلفی المسلک ہیں، اس کتاب کی تحقیق وتعلیق میں ان کی سلفیت جگہ جگہ نظر آتی ہے، بعض جگہ تو ان کا کلام ایسا ہوتا ہے کہ بدن پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے اور زبان سے بے اختیار نکلتا ہے کہ اگر سلفیت یہی ہے تو ایسی سلفیت سے خدا بچائے۔ آیئے ان سلفیت زدہ محقق صاحب کی سلفیت کا آپ بھی یک نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ جو خود عظیم محدث ہونے کے ساتھ ساتھ حافظ ابن تیمیہ کے بڑے مداحوں میں سے ہیں، اس کتاب کی تیرہویں جلد میں انھوں نے ابن فورک اصبہانی کا تذکرہ کیا ہے اور ان کو شروع ترجمہ میں ان القاب سے یاد کیا ہے:

الامام العلامة الصالح شيخ المتكلمين ابوبكر محمد بن الحسن بن فورك الاصبهاني، اور لکھا ہے کہ: **قال عبد الغفار في " سياق التاريخ"**

الاسناذ ابوبکر قبرہ بالحیرۃ یستسقیٰ بہ ،یعنی عبدالغفار نے ''سیاق التاریخ'' میں کہا ہے کہ ابوبکر کی قبر مقام حیرہ میں ہے، اور اس کے ذریعہ بارش طلب کی جاتی ہے۔ یعنی جب بارش نہیں ہوتی ہے اور لوگ قحط میں ہوتے ہیں تو ان کی قبر کے پاس جاتے ہیں اور وہاں خدائے تعالیٰ سے بارش کے لئے دعا کرتے ہیں تو اس کی قبر کی برکت سے اللہ تعالیٰ بارش نازل فرماتے ہیں۔

اور قاضی ابن خلکان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ بزرگ بغداد میں مدت تک درس دیتے رہے، پھر رَے گئے، وہاں مبتدعہ نے یعنی کرامیہ فرقہ کے لوگوں نے ان کے خلاف سازش رچی تو نیشاپور کے لوگوں نے ان سے خط وکتابت کر کے نیشاپور بلالیا اور ان کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا و ظهرت برکته علی المتفقهة یعنی ان کی برکت فقہ کا علم حاصل کرنے والوں پر ظاہر ہوئی، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی برکت سے علماء کا ایک طبقہ پیدا کیا جو علوم شریعت کا ماہر تھا، ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو کے قریب ہے، پھر ان کو غزنہ بلایا گیا، مبتدعین سے غزنہ میں ان کا مناظرہ کرامیہ فرقہ سے ہوتا رہا، پھر وہ غزنہ سے نیشاپور واپس ہو رہے تھے کہ دشمنوں نے راستہ میں ان کو زہر دیدیا، جس کے سبب ''بُست'' (سجستان اور غزنی وہراۃ کے درمیان ایک شہر ہے) مقام کے پاس پہونچتے پہونچتے ان کی موت ہوگئی، ان کی لاش نیشاپور لائی گئی، پھر حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ ابن خلکان کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ومشهده بالحيرة يزار ويستجاب عنده الدعاء یعنی ان کی قبر حیرہ میں ہے، لوگ اس کی زیارت کو آتے ہیں اور اس جگہ دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

امام ذہبی جیسا امام حدیث تو اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرتا اور قبروں کی زیارت اور اللہ والوں کی قبر کے پاس دعاؤں کے قبول ہونے میں اس کو کوئی اشکال نہیں ہے اور نہ یہ بات اس کو کتاب وسنت اور شریعت کے خلاف نظر آتی ہے، مگر جو سلفی اس کتاب کے محقق ہیں، وہ اس پر جو حاشیہ چڑھاتے ہیں اسے پڑھئے اور خدا توفیق دے تو ان کی سلفیت پر لاحول پڑھئے۔

ویستجاب عنده پر حاشیہ سلفی صاحب لگاتے ہیں:

الدعاء عند قبور الانبیاء والصالحین من البدع المنکرة التی لایقرها الشرع وھو ذریعةالی الشرک۔

یعنی انبیاء (علیہم السلام) اور صالحین کی قبر کے پاس دعا کرنا بڑی خراب بدعتوں میں سے ہے، جس کو شریعت روا نہیں رکھتی ہے اور وہ شرک کا ذریعہ ہے۔

پھر فرماتے ہیں:

وقد کان صحابة رسول الله ﷺ إذا أراد أحدھم أن یدعو لنفسه استقبل القبلة ودعا فی مسجده کما کانوا یفعلون فی حیاته۔

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) میں کا کوئی جب اپنے لئے دعا کرتا تھا تو قبلہ کی طرف رخ کرتا تھا اور مسجد میں دعا کرتا تھا جیسا کہ صحابہ کرام آپ ﷺ کی زندگی میں کیا کرتے تھے۔

مزید ارشاد ہوتا ہے۔

وکل من یقصد زیارة القبر ای قبر ولو کان قبر سید الخلق ﷺ للدعاء عنده فھو ضال مبتدع۔

اور جو شخص کسی بھی قبر کے پاس جا کر دعا کا قصد کرے خواہ وہ سیدالخلق ﷺ کی قبر ہی کیوں نہ ہو، پس وہ شخص گمراہ اور بدعتی ہے۔

ہائے ظالم یہ تو نے کیا کہہ دیا، حضور ﷺ کی قبر پاک کا نام لینا بھی یہاں تیرے لئے ضروری تھا، لعنت ہے تیری سلفیت پر اور لعنت ہے اس قلم پر جس کی زبان سے یہ گندی عبارت نکلی ہے، اس حاشیہ نگار نے ایک ارشاد، پاک رسول کا نقل کیا ہوتا کہ آپ نے یہ فرمایا ہو کہ قبروں کے پاس دعا مانگنا ناجائز ہے، خلافِ شرع ہے، شرک ہے، بدعت ہے، اگر اسے حضور ﷺ کا کوئی ارشاد صحیح یا ضعیف نہیں ملا تو خلفائے راشدین سے اس کی ممانعت نقل کی ہوتی، کسی صحابی سے، کسی تابعی سے، کسی امام فقہ وحدیث سے قبروں کے پاس بطور خصوصی حضور فداہ ابی وامی ﷺ کے روضۂ اقدس کے پاس جا کر دعا کرنے کی

ممانعت ذکر کی ہوتی، اس حاشیہ نگار نے صرف دعویٰ کیا اور دلیل نہ اسے کتاب اللہ سے ملی، نہ حدیث رسول اللہ سے، نہ صحابہ کرام کے قول سے، نہ کسی امام فقہ وحدیث کے ارشاد سے، دعویٰ نرا دعویٰ، کھوکھلا دعویٰ!

حدیث پاک میں انبیاء علیہم السلام کی قبروں کے پاس سجدہ گاہ بنانے سے منع کیا گیا ہے، قبروں کو سجدہ گاہ بنانا یعنی ان قبروں کو سجدہ کرنا اور قبروں کے پاس اللہ سے دعا کرنا ان دونوں باتوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے، مگر محشی محترم سجدہ گاہ بنانے والی حدیث کو قبروں کے پاس اللہ سے دعا کرنے پر فٹ کرر ہے ہیں، اور اس غلط کاری کا ان کو ذرا احساس نہیں ہوتا، اور اگر محشی صاحب کے یہاں قبروں پر سجدہ کرنا اور قبروں کے پاس دعا کرنا ان دونوں کا مطلب ایک ہی ہے تو تُف ہے ایسی علمیت پر، اس علم کے بل بوتے پر جو انبیاء علیہم السلام کا نام لے کر اور خصوصاً سیّد الخلق ﷺ کی قبر پاک کو خاص کر کے قبروں پر دعا کرنے کو حرام ناجائز اور شرک وبدعت بتائے تو وہ یقیناً بہت بڑا جاہل ہے۔

کوئی صحیح العقیدہ مسلمان رسول اکرم ﷺ کو براہ راست نافع وضار نہیں سمجھتا، وہ دعا خدا ہی سے کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ محتاط علماء کرام نے یہ لکھا ہے کہ قبر مبارک کے پاس اگر دعا کی جائے تو رخ قبلہ کی طرف کرے، اس کی وجہ محض یہ ہے کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ خود صاحب قبر سے دعا مانگی جارہی ہے، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دعا کی قبولیت اور اس کے باا ثر ہونے میں زمان ومکان کی بھی بڑی اہمیت ہے، جو جگہ جتنی متبرک ومقدس ہوگی یا جو زمانہ جتنا مقدس ومتبرک ہوگا وہاں دعا کی قبولیت کے زیادہ آثار ہوتے ہیں ،خانہ کعبہ کا تعلق براہ راست بارگاہ خداوندی سے ہے وہ تجلیات الٰہی کا مرکز ہے، اس وجہ سے وہاں پر دعا کا قبول ہونا زیادہ متوقع ہے، رمضان مبارک کی جو اہمیت ہے وہ دوسرے مہینوں کی نہیں ہے اس وجہ سے اس ماہ میں جو دعا کی جائے اس کا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہونا زیادہ ارجی ہے، غرض دعا کے مقبول ہونے میں زمان کا بھی اثر ہوتا ہے اور مکان کا بھی اثر ہوتا ہے، تو وہ جگہ جہاں پر حضور ﷺ کا جسد اطہر ہو اور جو جگہ کہ زمین وآسمان میں جتنی جگہیں ہیں ان میں سب سے زیادہ مقدس ومبارک ہو وہاں پر دعا

کرنے کی تاثیر کا کیا عالم ہوگا، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور یہی وجہ ہے کہ تمام اکابر اہل سنت سلفاً وخلفاً حضور پاک ﷺ کی قبر کے پاس دعا کرنے کو عین سعادت سمجھتے رہے ہیں، موجودہ زمانہ کے سلفیوں کے علاوہ گزشتہ زمانہ کے تمام سلف کا یہی عقیدہ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قبروں کے پاس دعا کرنے کا ان سے ثبوت تو ہے مگر اس سے انکار ان سے ثابت نہیں ہے۔

اگر حضور ﷺ کی قبر کی معاذ اللہ کوئی حقیقت نہیں ہے نہ وہ بابرکت جگہ ہے کہ اس کی برکت سے بندوں کی دعائیں اللہ قبول فرمائے، تو یہ محشی صاحب جن کا نام محمد ایمن الشبر اوی ہے، امام بخاری کے بارے میں کیا فرمائیں گے اور ان کی کتاب بخاری شریف کے بارے میں ان کا کیا ارشاد ہوگا، حافظ ابن حجر شارح بخاری مقدمہ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ بخاری شریف کو جو مقبولیت عامہ حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاری نے اس کتاب کے تراجم کی تبییض روضہ شریف اور منبر نبوی کے پاس کی تھی۔ لیجئے حافظ ابن حجر کی پوری عبارت پڑھئے، فرماتے ہیں:

وانما بلغت هٰذه الرتبة وفازت بهٰذه الحظوة لسبب عظيم اوجب عظمها وهو ماروا احمد بن عدى عن عبد القدوس قال: شهدت عدة مشايخ يقولون حول البخارى تراجم جامعه، يعنى بيضها بين قبر النبى ﷺ ومنبره وكان يصلى لكل ترجمة ركعتين۔

یعنی بخاری شریف کو یہ عظیم رتبہ جو حاصل ہوا ہے اس کی ایک بڑی وجہ ہے، اسی نے اس کی عظمت کو قائم کیا ہے، اور وہ وجہ یہ ہے کہ جس کو ابو احمد بن عدی قدوس بن ہمام سے روایت کرتے ہیں، عبد القدوس فرماتے ہیں کہ میں نے متعدد مشائخ سے سنا ہے کہ امام بخاری نے بخاری شریف کے تراجم کی تبییض حضور ﷺ کی قبر اور منبر نبوی کے مابین بیٹھ کر کے کی تھی، اور ہر ترجمہ پر دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ (مقدمہ، ص:۱۳)

اگر حضور ﷺ کی قبر مبارک بالکل عام سی جگہ ہے تو آخر امام المحدثین امام بخاری نے بخاری شریف کے تراجم کی تبییض کے لئے اسی جگہ کا انتخاب کیوں کیا؟ اس سے امام

بخاری کا مقصود قبر شریف اور منبر شریف سے فیض حاصل کرنا نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

خیر یہ تو بخاری شریف کا قصہ ہے، امام بخاری اپنی کتاب تاریخ کے بارے میں خود فرماتے ہیں: **صنفت التاریخ فی المدینة عند قبر النبی** ﷺ (مقدمہ، ص: ۴۷۸)

یعنی میں نے تاریخ کی تصنیف مدینہ پاک میں نبی کریم ﷺ کے روضہ پاک کے پاس کی ہے۔

میں ان سلفیوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کون ایسے دم خم والا ہے جس کی سلفیت امام بخاری سے بھی بڑھی ہو، اور کتاب وسنت پر جس کی نگاہ امام المحدثین سے بھی زیادہ ہو، اور شریعت میں کیا جائز ہے اور کیا ناجائز اس کا جاننے والا امام ممدوح سے بھی بڑھ کر ہو؟

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ امام بخاری کو تو حضور کی قبر اور اس کے آس پاس کا حصہ ایسا بابرکت نظر آئے کہ وہ مسجد نبوی کی ساری جگہوں کو چھوڑ کر منبر اور قبر شریف ہی کی جگہ کو تصنیف وتالیف کے لئے اختیار کریں اور سلفیت کی مار کا آج کا مارا طبقہ حضور ﷺ کے روضۂ اقدس کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنے کو بدعت، شرک اور گمراہی بتلائے، ہائے بدبختو تم کہاں سے کہاں پہونچ گئے؟

سعودیہ کے سابق رئیس الافتاء شیخ ابن باز بھی پکے سلفی تھے، بلکہ سلفیت کا موجودہ عروج انھیں کا فیض ہے، مگر اس شیخ السلفیہ کو بھی اتنی جرأت نہ ہوسکی کی وہ نبی اکرم ﷺ کے آثار وتبرکات کے بابرکت ہونے کا انکار کرسکیں۔ ابن باز صاحب صالحین اور اولیاء کرام کے آثار سے تبرک حاصل کرنے کو تو ناجائز بتلاتے ہیں مگر حضور ﷺ کے آثار وتبرکات سے برکت حاصل ہونے کا انھیں اقرار ہے۔ فرماتے ہیں:

ان التبرک بآثار الصالحین غیر جائز وانما یجوز ذلک بالنبی ﷺ خاصة لما جعل اللہ فی جسدہ وماماسہ من البرکة واما غیرہ فلایقاس۔

یعنی صالحین کے آثار سے تبرک حاصل کرنا جائز نہیں ہے، البتہ نبی اکرم ﷺ سے برکت حاصل کرنا بطور خاص جائز ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بدن مبارک میں اور جو چیز کہ آپ سے بدن مبارک سے لگے، اس میں برکت رکھی ہے، پس دوسروں کو آپ ﷺ پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔ (حاشیہ فتح الباری، ج:۳، ص:۱۳۰)

لیجئے یہ اس کا فتویٰ ہے جو اپنے زمانہ میں سلفیوں کا سب سے بڑا امام تھا، اس بڑے امام شیخ ابن باز کو بھی جرأت نہ ہوسکی کہ حضور ﷺ کے جسد مبارک اور آپ کے جسد مبارک سے جو چیز چھوئی ہوئی اور لگی ہوئی ہو اس کی برکت کا انکار کریں، تو اس قبر مبارک کی برکتوں اور اس کی فیض رسانیوں کا کیا ٹھکانا ہوگا جس قبر مبارک میں آپ ﷺ کا خود جسد مبارک رکھا ہوا ہو، وہ جگہ قبولیت دعا کے لئے کتنی بابرکت اور پُر اثر ہوگی؟

افسوس سلفیت کے مرضیٰ (مریضوں) کو اس مبارک جگہ پر دعا کرنا شرک و بدعت اور ضلالت نظر آتا ہے۔

اور ہمارا تو عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ اپنی قبر مبارک میں دنیوی زندگی سے زیادہ قوی تر زندگی کے ساتھ آرام فرما ہیں۔

ابن تیمیہ کا بھی عقیدہ یہی ہے کہ آپ کو قبر شریف میں حیات حاصل ہے۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

''ہم اس کا انکار نہیں کرتے اور اس کو عدم جواز کے باب میں داخل نہیں کرتے ہیں جو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک جماعت نے حضور ﷺ کی قبر سے یا دوسرے صالحین کی قبروں سے سلام کا جواب سنا، اور حضرت سعید ابن المسیب حرہ کی راتوں میں آپ ﷺ کی قبر سے اذان کی آواز سنتے تھے۔ (اقتضاء الصراط المستقیم، ص:۳۷۳)

تو جب حضور ﷺ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں تو آپ اپنی تمام فیض رسانیوں کے ساتھ زندہ ہیں، تو اگر اس جگہ دعا کی جائے یا آپ کے وسیلہ سے دعا کی جائے تو اس کا انکار کیوں؟ اور اس عمل کو گمراہی اور شرک و بدعت قرار دینا کیونکر جائز ہوگا؟

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے خاتمۃ المحدثین اور شیخ

الاسلام تھے، ان کی کتاب بخاری کی شرح فتح الباری کا اس کے زمانہ تالیف سے لے کر آج تک ڈنکا بج رہا ہے، اور لوگوں کا کہنا ہے کہ جس طرح احادیث کی کتابوں میں بخاری شریف کا کوئی ثانی نہیں ہے اسی طرح بخاری شریف کی شروح میں فتح الباری کے مقابل کی کوئی دوسری شرح نہیں ہے، وہ حافظ ابن حجر اس حدیث ان الایمان لتارز الی المدینة کما تارز الحیة الی جحرھا ۔ (یعنی یقیناً ایمان سمٹ سمٹا کر مدینہ اسی طرح پہونچے گا جس طرح سانپ اپنی بل میں پہونچتا ہے)

کی شرح میں فرماتے ہیں:

کل مومن له من نفسه سائق الی المدینة لمحبته فی النبی ﷺ فیشتمل ذٰلک جمیع الازمنة لانه فی زمن النبی ﷺ للتعلم منه وفی زمن الصحابة والتابعین واتابعیهم للاقتداء بهدیهم ومن بعد ذٰلک لزیارةقبره ﷺ والصلوٰة فی مسجده والتبرک بمشاهدة آثاره وآثار اصحابه (ج:۴،ص:۹۴)

یعنی ہر مومن کے قلب میں مدینہ منورہ جانے کا ایک جاذبہ ہوتا ہے، اس لئے اس کو حضور ﷺ سے محبت کا تعلق ہوتا ہے، تو یہ بات تمام زمانوں کو شامل ہوگی، حضور ﷺ کے زمانہ میں حضور ﷺ سے دین سیکھنے کے لئے لوگ مدینہ پہونچتے تھے اور صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں لوگ ان کے اسوۂ زندگی کی اتباع کے لئے مدینہ پہونچتے تھے، اور اس کے بعد حضور پاک ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لئے اور مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے اور آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے آثار سے تبرک حاصل کرنے کے لئے مدینہ پہونچتے ہیں۔

دیکھئے حافظ ابن حجر شارح بخاری شریف اور اپنے زمانہ کے علم حدیث کے سب سے بڑے عالم کیا فرما گئے، فرما رہے ہیں کہ ہر صاحب ایمان کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مدینہ پاک اس وجہ سے جائے کہ آپ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرے اور آپ کی مسجد میں نماز ادا کرے، آپ ﷺ کے آثار اور آپ کے اصحاب

کے آثار سے تبرک حاصل کرے، گویا ایمان کا تقاضا ہے کہ مومن کے دل میں یہ داعیہ اور یہ شوق اور یہ جذبہ ضرور ہو، اگر اس کا دل اس شوق اور اس جذبہ سے خالی ہے تو یہ سمجھو کہ اس کے دل میں حضور ﷺ کی محبت ہی نہیں، اور اس کا ایمان صرف نام کا ایمان ہے، ایمان کی حقیقت اسے نصیب نہیں ہے۔

دیکھئے جو بات حافظ ابن حجر بخاری شریف کی حدیث کی روشنی میں ثابت کررہے ہیں، وہی بات آج کے سلفیوں کے نزدیک شرک ہے، گمراہی ہے، ناجائز اور حرام ہے، اور حضور پاک ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لئے اور اس سے تبرک حاصل کرنے کے لئے اور اس جگہ دعا کرنے کے لئے سفر کرنے والا عاصی اور گنہ گار ہے، معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

اللہ تعالیٰ اس قسم کی سلفیت اور اس قسم کے سلفیوں سے ہر مومن کو بچائے۔

☆☆☆☆☆

حضرت مولانا ابوبکر صاحب غازی پوری کی تصانیف

مسائل غیر مقلدین

غیر مقلدین کی ڈائری

آئینہ غیر مقلدیت

ارمغان حق ۲ جلدیں

غیر مقلدین کے لئے لمحہ فکریہ

تحفۂ رسل پر ایک نظر

کچھ دیر غیر مقلدین کے ساتھ

مقام صحابہ کتاب وسنت کی روشنی میں

صلوٰۃ الرسول پر ایک نظر

کیا ابن تیمیہ علماء اہل سنت والجماعت میں سے ہیں؟

صور تطلق (عربی)

وقفة مع معارضي شيخ الاسلام (عربی)

وقفة مع اللامذهبية

هل الشيخ ابن تيمية من أهل السنة والجماعة

MAKTABA ASARIA
QASIMI MANZIL, SAYEDWARA, GHAZIPUR (U.P.) INDIA
Pin 233001 Mob [illegible]